بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاخلافت کی بناء دنیا میں ہو پھر استوار
لاکہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

قیامِ خلافت کا نقیب

ندائے خلافت

جلد	24 تا 30 مارچ 2005ء	شمارہ
14	13 تا 19 صفر المظفر 1426ھ	10

بانی: اقتدار احمد مرحوم
مدیرِ مسئول: حافظ عاکف سعید
مدیر (اشاعتِ خصوصی): سید قاسم محمود

مجلس ادارت

ایوب بیگ مرزا۔ فرقان دانش خان
سردار اعوان۔ محمد یونس جنجوعہ
ادارتی معاون: فرید اللہ مروت
نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد، طابع: رشید احمد چوہدری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی:
67۔ گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ لاہور
فون: 6366638-6316638 فیکس: 6271241
E-Mail:markaz@tanzeem.org
مقامِ اشاعت: 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 5869501-03

خصوصی شمارہ کی قیمت: 50 روپے
سالانہ زرِ تعاون
اندرونِ ملک...... 250 روپے
بیرونِ پاکستان
یورپ، ایشیا، افریقہ وغیرہ (1500 روپے)
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ (2200 روپے)
چیک، منی آرڈر یا پے آرڈر
''مکتبہ خدام القرآن'' کے عنوان سے ارسال کریں

اداریہ

تحریک پاکستان نمبر

یہ ''ندائے خلافت'' کا چھٹا ''خصوصی نمبر'' ہے۔ اس سے پہلے اسلام اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے منتخب اور اہم موضوعات پر پانچ خصوصی شمارے شائع ہو چکے ہیں یعنی:

(1) سقوطِ ڈھاکہ نمبر: مملکتِ خداداد پاکستان کے دولخت ہونے اور مشرقی پاکستان کا نام ''بنگلہ دیش'' ہونے کے پس پردہ حقائق پر ایک غیر جانبدار مفصل رپورٹ۔

(2) فلسطین نمبر: اُمتِ مسلمہ کے سب سے بڑے مذہبی اور سیاسی مسئلے پر دستاویزی شمارہ، جس کے دو ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ یہ شمارہ کتابی صورت میں دہلی کے ایک ناشر نے طبع کیا۔

(3) اقبال نمبر: حقیقت میں اس شمارے کا نام ہے ''پیام اقبال بنام نوجوانانِ ملت''۔ 2002ء کا سال حکومت پاکستان کے اعلان کے مطابق مفکر اسلام علامہ اقبال کے لئے مخصوص تھا۔ اس سال کے دوران میں بے شمار کتب، مختلف زبانوں میں وجود میں آئیں، لیکن سب سے زیادہ مقبولیت ''ندائے خلافت'' کے اس شمارے کو حاصل ہوئی، جو ''قرآن اکیڈمی'' کی جانب سے اور بعد ازاں اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے بھی کتابی صورت میں شائع ہوا۔

(4) عراق نمبر: یہ شمارہ بیس روزہ امریکی حملے کے دوران لکھا بھی گیا، طبع بھی ہوا، تیار ہوا، اور یوں ہم نے اپنے عراقی بھائیوں کے شانہ بہ شانہ بذریعہ قلم، جہاد میں شرکت کی۔ ''عراق نمبر'' دہلی (انڈیا) کے ایک اشاعتی ادارے ''فرید بک ڈپو'' نے کتابی صورت میں شائع کیا۔

(5) نظریۂ پاکستان نمبر: یہ خصوصی شمارہ 20 اگست 2003ء کو پیش کیا گیا تھا۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، اس میں معروف سیاسی اصطلاح نظریۂ پاکستان سے متعلق مروجہ فکری مباحث کی تشریح وتوضیح کے بعد وضاحت کی گئی ہے کہ ''نظریۂ پاکستان'' دوقومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہونے والی نئی ریاست میں اسلام کے اصول واحکام کے نفاذ کے خواب اور تصور کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ جنوبی ایشیا میں ورودِ اسلام سے لے کر قیامِ پاکستان تک، اس خطے میں مسلمانوں نے اپنے دین کو دوسرے مذاہب کے لادینی اثرات سے بچانے کے لئے جو شعوری اور لاشعوری کاوشیں کیں، اور جن مسلمان سلاطین، بادشاہوں، مفکروں، دانش وروں اور علمائے دین نے اس راہ میں مسلمانوں کی قیادت کا حق ادا کیا، اور اسلام کی اساس پر مسلمانوں کو تمدنی، ثقافتی اور سماجی سطح پر بھی دوسری اقوام سے الگ اور منفرد وممتاز ثابت کرنے کی کوششیں کیں، ان سب تحریکوں اور شخصیتوں کا احوال ''نظریہ پاکستان نمبر'' میں بیان کیا گیا۔

(6) ''تحریک پاکستان نمبر'': جب نظریے اور اُصول کو عمل اور تحریک کی صورت میں لانے کا سوال پیدا ہوا، تو ''نظریۂ پاکستان نمبر'' کے اداریے ہی میں یہ خبر بھی دے دی گئی تھی کہ آئندہ خصوصی اشاعت نظریے کو ''تحریک'' میں بدل دینے کے لئے وقف ہوگا۔ اس خصوصی اشاعت کی ایک اہمیت یہ ہے کہ ''ندائے خلافت'' میں جو قسط وار سلسلہ ''تاریخ تحریکات احیائے اسلام'' کے عنوان سے متواتر چلا آرہا ہے، وہ تحریک پاکستان پر برعظیم کی تحریکوں کی حد تک ختم ہوا۔ اس قسط وار سلسلہ کا آغاز 21 نومبر 2002ء کے شمارے سے ہوا تھا اور مسلسل 80 شماروں میں تمام قابل ذکر تجدیدی تحریکوں کا تذکرہ ہوتا رہا۔ سید احمد سرہندی کی تحریک مجددی، شاہ ولی اللہ اور اُن کے فرزندوں کی تحریک، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل کی تحریک جہاد، فرائضی تحریک، حاجی شریعت اللہ اور دودھو میاں کی تحریک، دار العلوم دیو بند اور مولانا رضا خان بریلوی کی تحریکیں، شیخ الہند کی تحریک، مولانا عبید اللہ سندھی اور ریشمی رومال کی تحریک، خلافت کی تحریک۔ ان سب تحریکوں سے گزرتے ہوئے یہ سلسلہ ''تحریک پاکستان'' تک پہنچا، اور یوں ہمارا یہ مستقل سلسلہ اب برعظیم پاک وہند سے نکل کر، دوسرے مسلم ملکوں میں تجدید واحیائے دین کی تحریکوں کی طرف بڑھے گا۔ آغاز دائیں سے بائیں کی طرف کیا جائے تو پہلے نمبر پر مشرق بعید میں انڈونیشیا کا نام آتا ہے۔ (ملاحظہ کیجئے آئندہ شمارے سے)

''تحریک پاکستان نمبر'' کے لئے واقعات وحقائق کو مرتب کرتے وقت راقم نے یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھی ہے کہ چونکہ یہ موضوع ابتدائی جماعتوں سے لے کر پوسٹ گریجوایٹ جماعتوں تک نصاب میں بھی شامل ہے، لہٰذا عام قارئین کے مطالعے کے ساتھ ساتھ طلبہ کے مفاد کا بھی خیال رکھا جائے۔ ''تحریک پاکستان'' جہاں انگریزوں کے خلاف تحریک تھی، وہاں اسلام کے احیاء کی خاطر ایک ایسی جداگانہ مملکت کے حصول کی تحریک بھی تھی، جہاں اسلام کے نظریۂ خلافت کو عملی شکل دی جاسکے۔ تحریک پاکستان کی کامیابی کے نتیجے میں الگ مسلم مملکت تو حاصل ہوئی، لیکن کیا یہاں اسلام کا نظام نافذ ہو سکا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ ان سوالوں کا جواب معلوم کرنے کے لئے ایک الگ خصوصی شمارہ مرتب کرنے کی ضرورت ہوگی، جس کے لئے اوپر کا اشارہ چاہئے۔ میرا اشارہ امیر تنظیم کے اِذن کی طرف ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ معاملہ اللہ کی مشیت اور تائید وتوفیق کا مرہونِ منت ہے۔

سید قاسم محمود

نقشہ مضامین تحریک پاکستان نمبر

حصہ اول

پہلی جنگ آزادی سے قیام کانگریس تک

(1857ء۔1885ء)

پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے اثرات (5)..... انتقام اور سزائیں (5)..... برطانوی حکمت عملی کے اثرات (6)..... جذبۂ قومیت اور تشخص (9)..... ہندوؤں کی قومی تحریکیں (9)..... سنٹرل نیشنل محمڈن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن (9)..... انڈین نیشنل کانگریس (11)

حصہ دوم

علی گڑھ تحریک سے تقسیم بنگال تک

(1886ء۔1905ء)

محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی (13)..... تقسیم بنگال (15)..... جداگانہ انتخابات (17) شملہ وفد (20)..... جداگانہ انتخابات اور ہندوؤں کا رویہ (20)

حصہ سوم

قیام مسلم لیگ سے خطبۂ الٰہ آباد تک

(1906ء۔1930ء)

مسلمانوں کے خدشات (21)..... سیاسی حالات کا تجزیہ (22)..... مسلم لیگ کے ابتدائی سال (22)..... 1911ء کے بعد لیگ کے رویے میں تبدیلی (23)..... مسلم انڈیا کی سیاست میں بحران (23)..... تقسیم بنگال کی تنسیخ (24)..... مچھلی بازار، کان پور کی مسجد (24)..... مسلمانانِ عالم کے مصائب (25) ..... جنگ طرابلس۔ جنگ بلقان۔ مسلمانانِ ہند کی نئی قیادت (25)..... رولٹ ایکٹ (30)..... سانحہ جلیانوالہ باغ (31) ..... کل ہند خلافت کمیٹی (32)..... تحریک ہجرت (34)..... مولانا محمد علی جوہر کی گرفتاری (35)..... کانگریس اور سوراجی گروپ (40)..... دہلی مسلم تجاویز (41)..... سائمن کمیشن (41)..... نہرو رپورٹ (43)..... کلکتہ کنونشن (43)..... چودہ نکات (43)..... گاندھی اِروِن پیکٹ (45)..... کمیونل ایوارڈ (46)..... تیسری گول میز کانفرنس (46)

حصہ چہارم

خطبہ الٰہ آباد سے دوسری جنگ عظیم تک

(1930ء۔1939ء)

علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد (47)..... 1935ء کا ایکٹ (49) مسجد شہید گنج کا سانحہ (52)..... انتخابات کے نتائج 1937ء (53) مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ (54)..... کانگریس راج کی ستم کاریاں (55) پیر پور رپورٹ (57)..... دوسری جنگ عظیم کا آغاز (59)

حصہ پنجم

قرارداد لاہور سے قیام پاکستان تک

(1940ء۔1947ء)

تقسیم ہند کے تصور کی تاریخ (60)..... قرارداد لاہور (62)..... لفظ ''پاکستان'' (63)..... قرارداد دہلی (65)..... کرپس مشن (66)..... ہندوستان چھوڑ دو (67)..... جناح گاندھی مذاکرات (71)..... شملہ کانفرنس (72)..... عام انتخابات (73)..... کابینہ مشن (75)..... یوم راست اقدام (76)..... عبوری حکومت (76)..... تین جون کا اعلان (80)..... چودہ اگست ہی کیوں؟ (81)..... ریڈکلف ایوارڈ (85)..... ظہورِ پاکستان (87)..... پاکستان کا مستقبل (88)

حصہ اول

پہلی جنگ آزادی سے قیام کانگریس تک

1857ء — 1885ء

تاریخ داں اور مصنفین تحریکِ پاکستان کا آغاز اس وقت سے کرتے ہیں جب انگریزوں کے غاصبانہ تسلط اور استعماریت کے خلاف مسلمانوں نے پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی کا نعرہ بلند کیا اور سیاسی جدوجہد شروع کی۔ عقلی دلائل کے ساتھ قلمی لڑائیاں لڑیں۔ ضرورت پڑنے پر تلوار بھی اٹھائی۔ آگے چل کر جب معلوم ہوا کہ آزادی کی جنگ لڑتے وقت ہندوؤں کی حکمتِ عملی مسلمانوں سے الگ ہے اور حصولِ آزادی کے بعد اُن کے عزائم و مفادات مسلمانوں سے جداگانہ ہیں' تو مسلمانوں نے بھی اپنے عقائد و حقوق کے تحفظ کو مقدم جانا۔ اسلامیانِ ہند نے اپنے مذہبی عقائد اور مذہبی عقائد کے زیر اثر اپنے سیاسی حقوق (دوقومیت کی بنیاد پر) معاشرتی تحفظاتی اور معاشی مفادات کی خاطر انگریزوں اور ہندوؤں سے جو اجتماعی جنگ ایک سو سال تک لڑی' اسی کا نام ''تحریکِ پاکستان'' پڑ گیا۔ اس ''جنگ صد سالہ'' کا آغاز انگریزوں کے خلاف پہلی جنگِ آزادی 1857ء سے ہوا۔

پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے اثرات

مسلمانانِ ہند پر 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے دو اہم اثرات مرتب ہوئے:

(1) وہ تمام مذہبی' سیاسی' معاشی اور سماجی ادارے' جن پر مسلمان صدیوں سے انحصار کرتے چلے آ رہے تھے' انہیں تباہ کر دیا گیا۔

(2) برطانوی حکمرانوں نے مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کر لیا۔

چنانچہ 1857 کے بعد برطانوی حکمت عملی وضع کرنے والوں کے سامنے دو مقاصد تھے:

(ا) مسلمانوں کو ذہنی اور معاشی طور پر مفلوج رکھا جائے' تاکہ وہ دوبارہ ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے نہ ابھر سکیں۔

(ب) مسلمانوں کے مفاد پر ہندوؤں کے مفاد کو ترجیح دی جائے تاکہ وہ متحد ہوں اور مضبوط ہوں اور یوں مسلمان خود بخود ہی پس منظر میں چلے جائیں۔

مسلمانوں پر بغاوت کا الزام

انگریزوں نے 1857ء کی جنگِ آزادی کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ٹھونس دی۔ اگرچہ ہندو آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں تھے اور فوج میں بھی اُن کی تعداد مسلمان فوجیوں سے کہیں زیادہ تھی اور انگریزوں کے خلاف اُن کی شکایات کسی طرح بھی مسلمان سے کم نہ تھیں۔ تاہم انگریزوں کے خیال تھا کہ ہندو طبعاً کمزور اور امن پسند ہیں اور انہوں نے جنگ میں صرف مسلمانوں کے اُکسانے پر حصہ لیا تھا۔ اس تاثر کی وجہ یہ تھی کہ جنگ آزادی مسلمان حکمرانوں کے نام پر لڑی گئی تھی۔ مسلمان علماء نے انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کے فتوے جاری کئے تھے۔ مجاہدین نے اسلام کے سبز پرچم کے سایے تلے اپنی جدوجہد کو جاری رکھا اور یہ بھی حقیقت تھی کہ 1857ء سے پہلے بھی انگریزوں کے خلاف زیادہ تر لڑائیاں مسلمانوں ہی نے لڑی تھیں۔ اس تاریخی پس منظر کے علاوہ جس معاشی اور سیاسی بدحالی کا سامنا مسلمانوں کو کرنا پڑا' وہ جنوبی ایشیا کی کسی اور قوم کو پیش نہیں آیا تھا۔

1857ء کی جنگ آزادی کے مطالعے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگرچہ ظاہری طور پر ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا' تاہم اُن کی شمولیت از حد محتاط تھی۔ انہوں نے صرف وہیں مسلمانوں کی حمایت کی' جہاں پر اُن کا مفاد تھا اور جہاں کہیں انہیں انگریزوں کی مدد کرنے میں اپنا مفاد نظر آیا' وہاں انہوں نے برطانوی حکمرانوں کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد انہوں نے علی الاعلان مسلمانوں کو بغاوت کا ملزم ٹھہرایا۔ ایسا کرنے سے بعض اوقات انہوں نے اپنی جان بچائی اور بعض اوقات اپنے سیاسی و معاشی مفادات کا تحفظ کیا۔

انتقام اور سزائیں

جب انگریزوں نے جنگِ آزادی کا اصل مجرم مسلمانوں ہی کو ٹھہرایا تو یہ قدرتی بات تھی کہ انتقام لینے اور سزائیں دینے میں بھی مسلمانوں کو سرفہرست رکھا گیا۔ انگریزوں کی فاتح افواج نے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں سے مسلمان آبادیوں کا صفایا کیا۔ دہلی اور لکھنو جو صدیوں سے مسلمان تہذیب کے مراکز چلے آ رہے تھے' انگریزوں کے انتقام کی نذر ہو گئے۔ مسلمانوں کے رہائشی علاقوں اور محلوں کو چن چن کر مسمار کیا گیا اور بہت قلیل عرصے میں مسلمانوں کے گھر' مدرسے' لائبریریاں' خانقاہیں اور دیگر ادارے خاک کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئے۔

دہلی کی تباہی

مسلمانوں کے دورِ حکومت میں دہلی صوفیاء' شعراء' ادیبوں' ماہرین فنونِ لطیفہ' علماء اور فقہاء کا مرکز تھا۔ یہاں کے تعلیمی اداروں' مذہبی خانقاہوں اور علمی مجلسوں کا پوری دنیائے اسلام میں شہرہ تھا۔ اگرچہ کافی عرصے سے بیرونی حملوں کی وجہ سے اور کچھ مغلیہ حکمرانوں کی لاپروائی کی وجہ سے دہلی اپنا یہ مقام رفتہ رفتہ کھو رہا تھا' تاہم 1857ء کی جنگ سے پہلے عظمت ماضی کا حامل تھا اور مسلم تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ جب انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس شہر میں مسلمان ہونا سب سے بڑا جرم بن گیا۔ معمولی معمولی واقعات کی بنا پر مسلمانوں کے محلے کے محلے مسمار کر دیئے گئے۔

یہ درست ہے کہ فاتح فوجیوں کے لئے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لوگوں میں تمیز کرنا مشکل تھا' مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کی رہائش گاہوں کو تباہ کرنے کے احکامات اعلیٰ حکام کی طرف سے صادر کئے گئے تھے اور مزید یہ کہ فاتح فوجیوں میں کثیر تعداد سکھوں کی تھی' جنہوں نے مسلمان آبادی کی لوٹ مار میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ مرزا غالب کے حساس ذہن نے یہ سب کچھ دیکھا تھا اور اُن کی اُس دور کی تحریروں میں دلی کی بربادی کی تصویر نمایاں ہے۔ اپنے ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ''اس بات کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ

1858ء: ''اب غالب تنہا رہ گیا ہے۔ اب اُس سے باتیں کرنے کے لئے صرف اُس کا قلم ہے اور اُس کا ساتھی صرف اُس کا سایہ ہے''۔ غالب

مسلمانوں کے رہائشی علاقوں کو مسمار کر دیا جائے۔ مسجدوں کو گرا دیا جائے۔ چاندنی چوک اور جامع مسجد کے درمیانی علاقے کو میدان بنا دیا جائے''۔ دہلی کے مسلمانوں کی بے بسی پر روتے ہوئے مرزا غالب لکھتے ہیں: ''شہر مسلمانوں سے خالی ہے۔ رات کو اُن کے گھروں میں روشنی نہیں ہوتی اور دن کے وقت دھواں نہیں نکلتا۔ غالب جو کہ اس شہر کو جانتا ہے اور جس کے یہاں ہزاروں احباب تھے' جس کے دوست ہر گھر میں تھے' اب تنہا رہ گیا ہے۔ اب اُس سے باتیں کرنے کے لئے صرف اس کا قلم ہے اور اس کا ساتھی صرف اس کا سایہ ہے''۔

لائبریریوں کی تباہی:

دہلی کی بربادی کا سب سے افسوس ناک پہلو یہاں کے کتب خانوں کی تباہی تھی۔ مغلوں کی لائبریری جس میں کم و بیش 24 ہزار کتابیں تھیں' نذر آتش کر دی گئی۔ مفتی صدر الدین آزردہ کا کتب خانہ اور تمام جائیداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ مشہور شاعر اور عالم نواب ضیا الدین لوہارو کا تاریخی اور ادبی کتب پر مشتمل کتب خانہ بھی تباہ ہو گیا۔ شاہ ولی اللہ کی لائبریری' جس میں اُن کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے گراں قدر اضافہ کیا تھا اور جو کہ مذہبی اور تاریخی علوم کا اہم ترین ذخیرہ سمجھی جاتی تھی' وہ بھی انگریزوں کے انتقامی جذبے کی نذر ہو گئی۔ اسی طرح نذیر حسین مرزا' مولوی محمد باقر' شیخ عبدالحق محدث اور خواجہ میر درد کے کتب خانے تباہ ہو گئے۔

تعلیمی درس گاہوں کی بربادی

مسلمانوں کے علمی ورثے کو ختم کرنے کے لئے اُن کے تقریباً تمام مدرسے' خانقاہیں اور دیگر تعلیمی ادارے یا تو گرا دیئے گئے یا انہیں بند کر دیا گیا۔ شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی اور مرزا مظہر جان جاناں کی خانقاہیں' جن میں ان دونوں علماء کے گراں قدر علمی ذخائر موجود تھے' صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ مدرسہ رحیمیہ جو شاہ ولی اللہ جیسے عالم دین اور مفکر کے مکتب فکر کو فروغ دیتا تھا' اُسے ہندو سکول میں تبدیل کر کے اس کا نام ایک ہندو مخبر رائے بہادر لالہ رام کشن داس کے نام پر رکھ دیا گیا۔

ذرائع نشر و اشاعت پر پابندی

انگریزوں نے مسلمانوں کو مذہبی اور علمی طور پر تباہ کرنے کے لئے صرف لائبریریوں کے انہدام اور تعلیمی اداروں پر پابندی عائد کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا' بلکہ مسلمانوں کے اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ پر بھی پابندیاں عائد کر دیں۔ ایک فرانسیسی محقق گارساں دتاسی کے اندازے کے مطابق 1853ء میں اردو زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد 35 تھی' جن میں سے 15 یا تو مسلمانوں کی ملکیت تھے یا اُن کے مدیر مسلمان تھے۔ جنگِ آزادی کے بعد اُردو اخبارات کی تعداد بارہ رہ گئی' جن میں سے صرف ایک مسلمان کا اخبار تھا۔

اگرچہ ہندوؤں کے اخبارات بھی بند کر دیئے گئے' مگر مسلمان اخبارات پر مکمل پابندی عائد کی گئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کا خیال تھا کہ انہی اخبارات نے ''جہاد'' پر مواد شائع کر کے انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلائی تھی۔ مسلمان اخبارات کے خلاف پابندیاں 1857ء میں ہی شروع ہو گئی تھیں' جبکہ ایک ''پریس ایکٹ'' نافذ کیا گیا تھا کی رو سے بے شمار اخبارات کے مدیروں اور ناشروں پر مقدمات چلائے گئے' جن میں کلکتہ کے اخبار ''دوربین'' ''گلشن نو بہار'' اور سلطان الاخبار' پشاور کا اخبار ''مرتضائی'' اور ملتان کا ''ریاضِ نور'' شامل تھے۔ یہ تمام مسلمانوں کے اخبارات تھے۔ ان پر اس قسم کے شدید الزامات عائد کئے گئے کہ پھر ان اخبارات کو دوبارہ جاری کرنے کی کبھی اجازت نہ ملی۔

معاشی اور سیاسی اقدامات:

(i) زمین اور جائیداد' تعلیمی اور مذہبی اداروں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو معاشی اور سیاسی پستی میں بھی دھکیل دیا گیا۔ اکثر مسلمان امراء اپنی زمینوں' جائیدادوں اور دیگر قیمتی اثاثہ جات سے محروم کر دیئے گئے۔ بیشتر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ نہ اُن کے پاس رہنے کو گھر رہا' نہ دولت اور نہ مستقبل قریب میں بہتری کی کوئی صورت نظر آتی تھی۔ ظلم کی انتہا یہ تھی کہ ان میں سے اکثر نے نہ کسی جنگ میں اور نہ ہی کسی سازش میں حصہ لیا تھا۔ بعض معمولی شک اور مخبری کی بنا پر اُن پر ظلم و ستم کے روا رکھا گیا۔

(ii) مسلمانوں کو بے دریغ پھانسی پر چڑھایا گیا اور دیگر سخت سزائیں دی گئیں۔ پھانسی دیئے جانے والے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم ایک انگریز نواز مصنف کمال الدین حیدر کے اندازے کے مطابق تقریباً 27 ہزار مسلمانوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس تعداد میں وہ لوگ شامل نہیں ہیں جو لڑائی کے دوران مارے گئے یا جو قتل عام کی نذر ہوئے۔ یہی مصنف لکھتا ہے کہ ''قتل عام سات دن تک جاری رہا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کتنے لوگ قتل ہوئے۔ بچے بھی تہ تیغ کر دیئے گئے اور جو سلوک عورتوں کے ساتھ کیا گیا' اُس کو قلم بیان نہیں کر سکتی''۔

جب مغل شہزادے تہ تیغ کر دیئے گئے تو دیگر مسلمان رؤساء' شعراء' فن کار' علماء اور فقہاء کی تلاش کی گئی جو کسی نہ کسی طور پر ملوث پائے گئے یا جن پر معمولی سا بھی شک ہوا' انہیں قتل کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر مشہور شاعر صہبائی کو' جس نے جنگ میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا تھا۔ اُسے گھر کے بائیس افراد کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ نواب مظفر الدولہ' جس کا انقلابی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا' محض اس وجہ سے مارا گیا کہ بہادر شاہ ظفر کا ایک سفیر اُس کے پاس ٹھہرا تھا۔ ایک اور رئیس امیر مرزا' جس نے انگریز عورتوں اور بچوں کو پناہ دی تھی' گولی سے اڑا دیا گیا' کیونکہ اس کے پاس انگریزوں کو دینے کے لئے مزید دولت نہیں تھی' غرضیکہ تمام مسلمان رؤساء اور نواب جن کا کبھی کسی دربار سے تعلق تھا یا جن کے پاس کوئی مجاہد یا سفیر ٹھہرا تھا یا جن کے خلاف محض شک تھا' بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔ وہ مسلمان جو انگریزوں کے خیر خواہ تھے' مگر اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اُن کی مدد نہ کر سکتے تھے' انہیں بھی معاف نہ کیا گیا۔ اس قسم کی بربریت اور درندگی کی بے شمار مثالیں ہیں جن کا شکار مسلمان ہوئے۔

(iii) مسلمان علماء نے جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اپنی مذہبی اور سیاسی حیثیت کی بناء پر ان لوگوں نے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بڑا موثر کام کیا تھا۔ مزید برآں انہوں نے انگریزی عمل داری کے خلاف فتویٰ جاری کر کے جدوجہد آزادی کا آغاز کیا تھا' اُن کو بہت بھیانک سزائیں ملیں۔ اُن کے جذبات مجروح کرنے کے لئے انہیں سؤر کا گوشت کھلایا گیا' اور اُن کے جسموں پر سؤر کا خون مل کر انہیں سؤر کی کھال میں سی کر توپوں سے اڑا دیا گیا۔ وہ علماء جن پر معمولی نوعیت کے جرائم کا الزام تھا' انہیں یا تو قید کر دیا گیا یا جزائر انڈیمان (کالے پانی) جلاوطن کر دیا گیا۔

برطانوی حکومت عملی کے اثرات

1857ء کی جنگ آزادی نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ انگریزوں کے انتقام کی نذر ہو گیا۔ انگریزوں کے اس ظالمانہ اور انتقامی رویے سے مسلمانانِ ہند کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ نہ صرف مذہبی' معاشی اور سیاسی طور پر انہیں صدمہ اٹھانا پڑا' بلکہ اُن کی تہذیب و تمدن کے نقوش حرفِ غلط کی طرح مٹا دیئے گئے۔ اکثر تعلیم یافتہ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ علماء کو پھانسیاں دے دی گئی تھیں۔ اُن کی تعلیمی سرگرمیوں کو یکسر موقوف کر دیا گیا۔ اُن کی مسجدیں تہ و بالا کر دی گئی تھیں' اُن کے ذرائع نشر و

اشاعت پر پابندی لگا دی گئی۔ مسلمان قائدین کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر مسلمان قوم کو رہنماؤں سے بھی محروم کر دیا گیا۔

مسلمانوں کے ساتھ بے دردی:

اس صورت حال میں مسلمان ترقی کی کوئی راہ تلاش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بے یار و مددگار اور بے بس زندگی گزار رہے تھے۔ اس طرح مسلمانوں پر ہندوستان کی سرزمین تنگ ہو گئی تھی۔ انگریز مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' 1871ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں وہ لکھتا ہے: ''ایک انگریز افسر نے مسلمانوں سے کہا' تم تو ایک تباہ شدہ نسل ہو''۔ ایک اور انگریز مصنف لکھتا ہے: ''مسلمانوں کا غرور ٹوٹ گیا اور وہ نہایت مایوسی کے عالم میں رہ رہے تھے''۔

انگریزوں نے مسلمانوں کی ناکامی کو اسلام کی ناکامی قرار دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے زوال کو اسلام کا زوال بتایا۔ اور یہ پروپیگنڈا پوری قوت کے ساتھ کیا کہ مسلمان (نعوذ باللہ) ایک غلط مذہب کو ماننے والے ہیں' ورنہ اُن کی اس قدر بے حرمتی نہ ہوتی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عیسائیت اور برطانوی حکومت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا۔ ایک انگریز مصنف اور گورنر سر ولیم میور نے لکھا: ''قرآن اور محمد ﷺ کی تلوار تہذیب' آزادی اور سچائی کے سب سے بڑے دشمن ہیں''۔ ایک اور انگریز افسر ولیم ہنٹر نے واضح کیا: ''اگر دوبارہ مسلمانوں نے ہندوستان پر تسلط قائم کر لیا تو وہ بہت مضبوط ہوں گے۔ اس لئے اُس نے تجویز پیش کی کہ اس صورتِ حال سے بچنے کے لئے عیسائیت کا پرچار کیا جانا چاہئے''۔

اس قسم کا پروپیگنڈا کر کے نہ صرف مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کئے گئے' بلکہ برطانوی حکومت اور عام انگریزوں کے ذہن پر یہ بات بٹھا دی گئی کہ انگریزوں اور عیسائیت کے اصل دشمن ہی مسلمان ہیں' اس لئے اُن کو پنپنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔ چنانچہ اس قسم کے نظریات سے متاثر ہو کر مسلمانوں کے خلاف اُن کے مذہب اور رسول کریم ﷺ کی ذات کے خلاف کتابیں تحریر کی گئیں اور انہیں ظالم اور جاہل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔

اپنے دورِ حکومت میں مسلمان بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہوتے تھے' وزیر' دبیر' سفیر' مشیر' گورنر' منصف وغیرہ۔ ان کے علاوہ پولیس' فوج اور محکمہ مال میں بھی انہیں اعلیٰ ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ اکثر مسلمان تجارت' پارچہ بافی' فن تعمیر' مصوری اور موسیقی وغیرہ کے شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ علماء اور فقہاء دینی مدرسوں اور خانقاہوں میں تعلیم دیتے تھے' جن کی سرپرستی حکومت اور مسلمان عمائدین کرتے تھے۔

انگریزوں کی حکومت کے قیام کے بعد صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ سول اور فوج کے اعلیٰ عہدے انگریزوں کو دیئے جاتے تھے۔ محکمہ مال میں زیادہ تر ہندو رکھے گئے عدالتی نظام تبدیل کر دیا گیا تھا اور اب عدلیہ میں مسلمان قاضی اور مفتی کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ جاگیریں اور زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں اور مسلمان اب مالی طور پر اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ اپنے دینی مدرسوں کی سرپرستی کر سکتے۔ علاوہ ازیں نئے تعلیمی نظام کو رائج کر کے انگریزوں نے مقامی مدرسہ سسٹم کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اسی طرح تجارت اور صنعت و حرفت کے میدان میں' یورپ میں ''صنعتی انقلاب'' اہم تبدیلیاں لا چکا تھا' اور جنوبی ایشیا کی منڈیوں میں بھی ولایتی کپڑے کی بہتات تھی' جسے انگریز ہر صورتِ حال میں یہاں کے باشندوں کو بیچنا چاہتا تھا۔ غرضیکہ ماسوائے معمولی اور حقیر کاموں کے مسلمانوں کے لئے باعزت ملازمت اور کاروبار کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ انگریزوں کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ مسلمانوں سے زیادتی کر رہے ہیں' مگر اس سلسلے میں انہوں نے کبھی بھی مدافعانہ رویہ اختیار نہیں کیا' بلکہ واضح طور پر یہ کہتے تھے کہ اس قسم کی حکمت عملی اُن کی حکومت کے استحکام اور مضبوطی کے لئے ضروری ہے۔

ہندوؤں کے ساتھ ہمدردی:

انگریزوں نے چونکہ مسلمانوں سے حکومت چھینی تھی' اس لئے قدرتی طور پر اُن کا رویہ ہندوؤں کے ساتھ ہمدردانہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے فوراً انگریزوں کے طور طریقے اختیار کر لئے۔ اُن کی زبان سیکھ لی اور اُن کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔ پھر برعظیم میں ہندوؤں کی اکثریت بھی تھی' جن کو انگریزوں کے خلاف کوئی پُرخاش اور دشمنی بھی نہیں تھی' انگریزوں کی اس ہندو نواز پالیسی کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ 1813ء میں سرجان مالکم نے لکھا تھا: ''ہندوؤں کے ساتھ لگاؤ ہندوستان میں ہماری حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا''۔ اسی طرح 1843ء میں لارڈ ایلن برا نے ڈیوک اور ڈنگٹن سے کہا تھا: ''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان بنیادی طور پر ہمارے خلاف ہیں اور ہمارے لئے صحیح پالیسی یہی ہے کہ ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملائیں''۔

1857ء کی جنگ آزادی نے ان خیالات کو اور بھی تقویت دی' کیونکہ یہ بات انگریزوں میں مشہور تھی کہ اس جنگ میں ہندوؤں نے محض مسلمانوں کے اُکسانے پر حصہ لیا ہے' ورنہ وہ بڑے صلح جو اور امن پسند ہیں۔ ظاہر ہے' انگریز اپنی حکومت کو مضبوط بنانا چاہتے تھے اور ہر ممکن طریقہ اختیار کر کے مستقبل میں کسی قسم کی جدوجہد آزادی کو روکنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جو حکمت عملی وضع کی گئی' اُس کا ایک نمایاں پہلو یہی تھا کہ مسلمانوں کو بہ حیثیت قوم بدحالی اور مایوسی سے ہمکنار کیا جائے اور ان کے ساتھ ساتھ ہندوؤں پر مسلمانوں کی خرابیاں اور زیادتیاں ظاہر کی جائیں' تاکہ وہ مسلمانوں کو ابھرنے نہ دیں۔ یہ طریقہ کار اگرچہ کسی حد تک 1857ء سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا' مگر 1857ء کے بعد اس پر پوری طرح سے عمل درآمد کیا گیا۔

سب سے پہلا اقدام ملازمتوں کے سلسلے میں کیا گیا۔ ایک تو ہندو ویسے ہی انگریزی زبان سیکھ کر مسلمانوں پر فوقیت حاصل کر چکے تھے' دوسرے انگریزوں کی اس جانب داری نے ان کی بہت مدد کی۔ اس وقت کے ریکارڈ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ ملازمتوں کے لئے درخواستیں مانگتے وقت ایسی خصوصیات بیان کی جاتی تھیں' جن کی وجہ سے مسلمان درخواست بھی دینے کے لائق نہ ہوں۔ 1869ء میں کلکتہ کے ایک فارسی اخبار نے ملازمتوں کے بارے میں لکھا: ''تمام چھوٹی بڑی ملازمتیں' مسلمانوں سے چھینی جا رہی ہیں اور دوسری قوموں کو' خاص طور پر ہندوؤں کو دی جا رہی ہیں''۔ ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' بھی اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مسلمانوں کا سرکاری ملازمتوں سے انخلاء اس قدر مکمل تھا کہ مثلاً کلکتہ کے سرکاری دفتروں میں مسلمان صرف چپڑاسی' قاصد' دوات میں سیاہی بھرنے والے اور قلیوں کی اسامیوں پر مقرر تھے۔ دوسرے علاقوں میں بھی مسلمان ملازمین کی یہی کیفیت تھی۔

مدراس کے گورنر ہوپ پارٹ نے لکھا: ''مسلمان بہت سے سرکاری عہدوں سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ مدراس پریذیڈنسی میں 485 عدالتی اور مالی محکموں کے عہدے ہیں جن میں سے صرف چند مسلمانوں کے پاس ہیں اور وہ بھی نچلے درجے کے ہیں''۔ اُس نے یہ بھی لکھا کہ بھرتی کرنے والے افسر ہمیشہ ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں' خواہ مسلمان زیادہ قابلیت کے حامل ہی کیوں نہ ہوں۔ بمبئی میں اس سے بھی بری حالت تھی۔ وہاں سول اور عدالتی اسامیوں پر ایک مسلمان بھی فائز نہیں تھا۔

سندھ اور پنجاب کے مسلمانوں کو بھی اسی قسم کی متعصبانہ حکمت عملی کا نشانہ بننا پڑا۔ سندھ میں تمام اعلیٰ

خلاف مہم شروع کی اور ملک گیر مظاہروں کے ذریعے انگریز حکومت پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی کہ گاؤکشی پر پابندی عائد کی جائے۔ اگرچہ دیوانند زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہا' لیکن آریا سماج تحریک سے اس نے ہندوؤں میں مسلم دشمنی کا ایسا گہرا جذبہ پیدا کیا' جس کے نتیجے میں ہندو مسلم منافرت' مذہبی اختلافات اور آئے دن فسادات برعظیم کا مقدر بن گئے۔

سنگھٹن کی تحریک

یہ تحریک بھی ہندوؤں کی توسیع پسندانہ ذہنیت کی پیداوار تھی۔ اس کے بانی ڈاکٹر مونجے تھے۔ جنہوں نے اپنی تحریک کا بنیادی فلسفہ بیان کرتے ہوئے کہا:

''جس طرح انگلستان انگریزوں کا ہے۔ فرانس فرانسیسیوں کا ہے اور جرمنی جرمنوں کا اسی طرح ہندوستان ہندوؤں کا ہے۔ اگر ہندو منظم ہو جائیں تو وہ انگریزوں اور ان کے پٹھو مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں۔ ہندوؤں کو اپنی دنیا آپ پیدا کرنی ہے جو شدھی اور سنگھٹن کے سہارے پروان چڑھے گی''۔

اس تحریک کے منتظمین نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے لئے تحریر و تقریر کے علاوہ ہندو نوجوانوں کو عسکری تربیت دینے کا اہتمام بھی کیا اور ملک بھر میں ایسے مراکز کا جال بچھا دیا جہاں جسمانی ورزش کے ساتھ ساتھ لاٹھی' تلوار اور دوسرے ہتھیاروں کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔

سنگھٹن کے عزائم اس کے زعما کے بیانات سے کھل کر سامنے آنے لگے اور یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو گئی کہ اس تحریک کا نصب العین ہندوستان پر ہندو راج قائم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ لالہ ہردیال جو اس تنظیم کے ایک سرکردہ رہنما تھے۔ اپنے متعصبانہ نظریات کو چھپانے کے ہرگز قائل نہ تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے اپنی تحریک کا نکتہ نظر نہایت بے باکی سے بیان کرتے ہوئے کہا۔

''سنگھٹن کی تحریک کا مقصد ہندوستان میں ایک مضبوط' متحد اور بیدار سیاسی جماعت کا قیام ہے جو ایک آزاد ہندو ریاست کے قیام کے لئے پورے زور و شور سے کوشش کرے گی۔ ہندو قومی مملکت کی بنیاد ہندو اداروں پر ہوگی۔ مثلاً سنسکرت زبان' ہندو تاریخ' ہندو تہوار' ہندو سورماؤں کا احترام' ہندوؤں کے مقدس مقامات کا احترام اور ہندو تہذیب سے محبت وغیرہ''۔

ہمارے درمیان ایسے لوگ بھی ہیں جو بلاوجہ آزادی ہند کی تحریک میں نیم عرب اور نیم ایرانی مسلمانوں کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان تو محض ایک غیر متعلق اور غیر ضروری عنصر ہیں۔ ان کا مستقبل بس یہی ہے کہ وہ شدھی تحریک کے ذریعے ہندو مذہب میں شامل ہو جائیں''۔

انڈین ایسوسی ایشن

1876ء میں کلکتہ میں ''انڈین ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک ہندو سیاسی جماعت قائم کی گئی۔ اس کے بانی بابو سریندر ناتھ بینرجی تھے اور ارکان میں زیادہ تر تعلیم یافتہ بنگالی ہندو تھے۔ اگرچہ اس پارٹی کی سرگرمیاں بنگال تک ہی محدود رہیں اور ملک کے دوسرے حصوں تک نہ پھیل سکیں لیکن اس کی بدولت بنگالی ہندوؤں کے درمیانی طبقہ میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور وہ اپنے حقوق اور قومی آزادی جیسے مسائل پر اظہار خیال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے۔

گئو رکھشا

ہندو عقائد کے مطابق گائے کا احترام اور اس کی دیکھ بھال مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوؤں نے اپنے اس عقیدے کی آڑ میں گئو رکھشا کے نام پر مسلمانوں کے خلاف گاؤکشی کے بہانے ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کیا اور ہندوؤں کے دلوں میں اپنے ہم وطنوں کے لئے نفرت و مخاصمت کے جذبات کو ابھارا۔ کانگریس کی اس متعصبانہ روش کے باعث سیاسی حلقوں میں مشہور تھا کہ اس جماعت پر بال' پال اور لال (بال گنگا دھر تلک' بین پال اور موتی لال نہرو) قابض ہیں اور وہی اس کی حکمت عملی کو مرتب کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ گئو رکھشا تحریک کے ذریعے بال گنگا دھر تلک نے جی کھول کر مسلمانوں کو اپنی تنگ نظری کا ہدف بنایا اور ہندوؤں کو اس تحریک میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اس مہم کو مہاتما گاندھی سمیت کانگریس کے ہندو زعما اور کارکنوں نے کامیاب بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔

ہندوؤں میں قومی جذبات کو زیادہ مضبوط بنانے کی غرض سے ہندو رہنماؤں نے گناپتی دیوتا اور شیواجی کی یاد میں جشن منانے کی رسم کی بنیاد ڈالی۔ ان مواقع پر ملک بھر میں جلوس نکالے جاتے جن کے ساتھ گنگا باز نوجوانوں کے جتھے' ناچنے گانے والی ٹولیاں اور بینڈ باجے ہوتے۔ یہ جلوس قصداً نماز کے اوقات پر مساجد کے سامنے سے گزرتے اور مسلمانوں کو مشتعل کرنے کا باعث بنتے۔ چنانچہ 1893ء میں برصغیر کی تاریخ کا اولین ہندو مسلم فساد ہوا جو بلاخوف تردید ہندو رہنماؤں کے متعصبانہ اقدامات کا نتیجہ تھا۔ اس فرقہ وارانہ فساد سے مسلمانوں کو اپنے حقوق' تہذیب و تمدن اور جان و مال کے تحفظ کی فکر لاحق ہوئی اور مسلمان زعما نے مناسب اقدامات کرنے پر غور و خوض کے لئے باہمی صلاح و مشورے شروع کئے۔

ان تحریکوں کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً مختلف صورتوں میں کئی دوسری جماعتیں بھی وجود میں آئیں جن کا مقصد ہندو قومیت کا احیا اور ہندو معاشرے کا قیام تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی راشٹریہ سیوک سنگھ نامی تنظیم تھی جو 1926ء میں قائم ہوئی لیکن کئی سال تک اس کی سرگرمیاں صیغہ راز میں رکھی گئیں۔ اس جماعت کے ارکان تخریب کاری اور قتل و غارت میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے برصغیر میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کو بے اندازہ جانی و مالی نقصان پہنچایا۔ تقسیم ہند کے اعلان کے بعد ان کی وحشت و بربریت کی انتہا نہ رہی اور انہوں نے مسلمانوں پر جو مظالم توڑے' ان کی مثال نہیں ملتی۔

اگر دیکھا جائے تو ان تحریکوں کے قیام کا محرک اعلیٰ مسلم دشمنی کا وہ جذبہ تھا جو ہندوؤں کا منتہائے نظر بن چکا تھا اور حالات کی مناسبت سے وہ اس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ برصغیر میں اسلامی عہد حکومت کے دوران انہوں نے بامر مجبوری مسلمانوں کی بالادستی کو قبول کیا اور ان کی فراخ دلی اور رواداری سے خوب فائدہ اٹھایا لیکن جب مسلمان اقتدار سے محروم ہو گئے تو ان کے رویئے میں بھی یکسر تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اپنے مخاصمانہ عزائم کی تکمیل کے لئے جائز و ناجائز سبھی حربے استعمال کئے اور اس طرح مسلمانوں کے یہ اندیشے درست ثابت ہوئے کہ ہندوؤں نے انہیں کبھی اپنا ہم وطن تسلیم نہیں کیا۔

سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن

مختلف ہندو تحریکوں کا قیام اور ان کا مخصوص انداز فکر مسلم عوام اور زعما کے لئے تشویش کا باعث تھا۔ اگرچہ سرسید احمد خان کا لگایا ہوا پودا اب ایک مضبوط اور تناور درخت بنتا جا رہا تھا جس کے سائے میں اغیار کے ستائے ہوئے مسلمانوں کو سستانے اور عزم نو کے ساتھ آگے بڑھنے کے مواقع میسر تھے لیکن پھر بھی کسی ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ملک گیر سطح پر مؤثر انداز میں مسلم آبادی کے نکتہ نظر کی نمائندگی کر سکے۔

بنگال میں قائم ہونے والی انڈین ایسوسی ایشن خالصتاً ایک ہندو تنظیم تھی جس کا کوئی مسلم رکن نہ تھا۔ چنانچہ اس خلا کو پُر کرنے کے لئے ملک کے ایک بلند مرتبہ دانشور سید امیر علی نے کلکتہ میں 1877ء میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد میں مسلمانوں کی اعلیٰ وارفع روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے

عہدے ہندوؤں کے پاس تھے۔ کوئی مسلمان عدلیہ میں کسی بھی عہدے پر فائز نہیں تھا' پولیس کے محکمے میں مسلمانوں کی تعداد 1930ء تھی جن میں سے صرف 47 کی تنخواہ 30 روپے سے زیادہ تھی۔ دوسرے محکموں میں بھی مسلمانوں کے پاس بہت ہی معمولی عہدے تھے۔

پنجاب میں صورتِ حال قدرے بہتر تھی' لیکن یہ بات انگریزوں کو پسند نہ تھی۔ اگرچہ مسلمان اکثریت میں تھے' مگر انگریزوں کی خواہش تھی کہ اُن کے عہدوں کی تعداد غیر مسلموں کے برابر کردی جائے۔ مثال کے طور پر محکمہ تعلیم میں اس حکمت عملی پر عمل کرانے کے لئے پنجاب کے ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم نے ایک گشتی مراسلہ جاری کیا' جس میں ضلعی افسروں سے کہا گیا: ''وہ زیادہ ہندو اساتذہ کی ہمت افزائی کریں اور انہیں فوری طور پر ان جگہوں پر تعینات کردیں' جہاں مسلمان اساتذہ کے حق میں حمایت کا کوئی خاص امکان نہ ہو''۔

جذبہ قومیت اور قومی تشخص

مذکورہ بالا تعصبات اور حکمت عملیوں کے پیش نظر انگریزوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمان بہ حیثیت قوم دوبارہ نہ اُبھر سکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر انہوں نے مسلمانوں میں علاقائی تعصبات کو ہوا دی اور وہ تمام ادارے ختم کردیئے جو متحدہ پلیٹ فارم پیش کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ دوسری طرف برعظیم کی تمام غیر مسلم قوموں اور نسلوں کو متحد کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہیں اُن کا شاندار ماضی دکھایا گیا اور ہندوؤں کی قدیم تہذیبوں کے بار بار حوالے دے کر انہیں دوبارہ ایک قوم بنانے کی طرف توجہ دی گئی۔ اگر ہندو مضبوط ہو کر ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے ابھر سکتے تو مسلمان' جو کہ اقلیت میں تھے خود بخود پس منظر میں چلے جاتے۔

ہندوستانی قومیت کا سوال

ہندوستان میں کبھی ایک قوم آباد نہیں رہی' بلکہ مختلف قومیں صرف استعماریت کی وجہ سے اکٹھی رہ رہی تھیں اور صرف استعماریت کی وجہ سے ہندوستان میں مضبوط حکومت قائم تھی۔ جونہی مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی' ہندوستان چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بٹ جاتا۔ انگریز حکمران اس امر سے اچھی طرح واقف تھے۔ سرجان اسٹراچی نے جسے ہندوستانی سیاست اور سماجی تاریخ کا بڑا ماہر اور محقق سمجھا جاتا ہے' اُس نے 1888ء میں ایک جائزہ رپورٹ پیش کی تھی' جس میں اُس نے لکھا: ''سب سے ضروری اور اہم بات یہ ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ ہندوستان کبھی ایک ملک' قوم' سیاسی' معاشرتی اور مذہبی مرکز پر اکٹھا نہیں رہا۔

سرجان اسٹراچی لکھتا ہے کہ ''ایک قوم'' کی پہچان مشترکہ مذہب' مشترکہ ثقافت' تہذیب اور مشترکہ حکومت ہوتے ہیں' لیکن تاریخی حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کبھی یہ قدریں مشترک نہ تھیں۔ اسٹراچی سے پہلے 1858ء میں ایک اور انگریز منصف جان برائٹ نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا' کہ ہندوستان میں مشترکہ جذبہ قومیت کے نہ ہونے کی وجہ سے انگریزی اقتدار زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گا۔ دوسرے لفظوں میں اگر انگریز اپنی حکومت کو ہندوستان میں مستحکم دیکھنا چاہتے ہیں' تو انہیں وہ خلا پُر کرنا پڑے گا جو برعظیم میں جذبہ قومیت کے نہ ہونے سے پیدا ہو گیا تھا۔

برطانوی حکومت اور ہندو قومیت

برطانوی حکومت نے برعظیم میں ایسے دو نئے عوامل کو متعارف کرایا تھا جو اس سے پہلے اس علاقے میں موجود نہ تھے۔ ایک تو مضبوط انتظامیہ تھی' جس کی بنیادیں جدید معاشی اور مواصلاتی نظام پر استوار کی گئی تھیں۔ دوسرے مغرب میں رائج نظریات کا فروغ۔

مضبوط انتظامیہ اور جدید معاشی اور مواصلاتی انتظام کی مدد سے انگریزوں نے برعظیم کے مختلف گروہوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ایک دوسرے پر انحصار کرنے میں اہم پیش رفت کی۔ جدید مغربی نظریات نے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں قومیت کے بارے میں سوجھ بوجھ پیدا کی۔ خاص طور پر کلکتہ' بمبئی اور مدراس جیسے بڑے شہروں میں مغرب کی طرز پر بے شمار سوسائٹیاں' انجمنیں' جماعتیں اور کلب وجود میں آئے۔ جنہوں نے انتظامیہ کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ انہی دو عوامل کے مابین تعلق نے ہندو قومیت کو فروغ دیا۔

ہندو قومیت نواز کے مصنف اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو قومیت اور برطانیہ ایک دوسرے کی ضد تھے اور یہ کہ ہندو قومیت کے فروغ کی وجہ سے برطانوی انتظامیہ کمزور ہو گئی۔ یہ بات کرتے وقت یہ مصنف ایک اہم نکتہ بھول جاتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے یہاں جو ادارے قائم کئے تھے' ان کی وجہ سے ہندو قوم پرستی نے فروغ پایا۔ نئی تعلیم' نئی سائنس' نئی ٹیکنالوجی' نئی تجارت' نئی صنعت' نئی سڑکیں اور نئے کاروباری ادارے۔ یہ سب کچھ ہندوؤں کو انگریزوں نے دیا تھا' اور یہی وہ بنیادیں تھیں جن پر ہندو قومیت کی عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

ہندوؤں کی قومی تحریکیں

انگریزی حکومت کے زیر اثر پنپنے والے ہندو قومیت کے جذبے کے تحت ہندوؤں میں ہندوستان میں ''ہندو راج'' قائم کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی اور یکے بعد دیگرے قومیت کی اساس پر کئی مذہبی تحریکیں وجود میں آئیں' جن کا بنیادی مقصد اس خطے میں ہندومت کی مکمل بالادستی قائم کرنا تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض تحریکوں نے غیر مذہبی (سیکولر) لبادہ بھی اوڑھ رکھا تھا' لیکن درپردہ عزائم ڈھکے چھپے نہ تھے۔

برہما سماج

ہندوؤں کی اولین تحریک ''برہما سماج'' تھی جس کا آغاز 1828ء میں بنگال میں ہوا۔ اس کا بانی راجہ رام موہن رائے تھا۔ اگرچہ بظاہر وہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچار کرتا تھا اور بت پرستی کے خلاف تھا' لیکن وہ اپنے آپ کو ہمیشہ کٹر ہندو کہتا تھا اور آخری دم تک اس دعوے پر قائم رہا۔ وہ ہر ہفتے ایک مخصوص عبادت گاہ میں ''برہما سبھا'' منعقد کرتا جس میں صرف برہموں کو شامل ہونے کی اجازت ہوتی اور کٹر برہمن وید پڑھ کر سناتا۔ راجہ موہن رائے کی وفات پر دیوندرا ناتھ ٹیگور نے برہما سماج کی قیادت سنبھالی اور اُس کے پیروکاروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ٹیگور کے بعد کیشھ چندر اسین نے تحریک کے قائد کی حیثیت سے کئی اختراعات کیں اور اسے مزید پھیلایا۔ اگرچہ اس تحریک کو ملک گیر' عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی' لیکن تعلیم یافتہ ہندوؤں میں اس کی جڑیں کافی گہری تھیں اور برعظیم کی سیاست میں ''برہما سماج'' کے بعض ارکان نے موثر کردار ادا کیا۔

آریہ سماج

1875ء میں دیوانند سرسوتی نے بمبئی میں اس نہایت متعصب تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستان میں ہندو سماج کا قیام تھا جہاں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لئے قطعی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دیوانند نے ہندوؤں کو اپنے دھرم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے اور پوری شدت سے اسلام اور عیسائیت کے خلاف محاذ آرا ہونے کی دعوت دی۔ اس نے اُسی پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ شدھی تحریک بھی جاری کی۔ ''شدھی'' کے لفظی معنی ہیں ''پاک کرنا''۔ اس تحریک کا اصل ہدف مسلمان تھے' خصوصاً وہ افراد جو ہندومت ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے تھے' لیکن مسلمانوں کے علاوہ عیسائی بھی اس تحریک کی شکارگاہ میں شامل تھے۔ 1882ء میں دیوانند نے گاؤکشی کے

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی کاوشیں

کیسٹ کلب اسکیم

قرآن وحدیث کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ پر ایمان افروز تبصرے کے ساتھ خطابِ جمعہ کا کیسٹ ہر ہفتہ آپ کے گھر پہنچانے کی اسکیم

سالانہ ممبر شپ فیس :-/500 روپے

آسان عربی گرامر ویڈیو کیسٹس

گھر بیٹھے عربی گرامر کے قواعد سیکھیے

''آسان عربی گرامر'' حصہ اوّل تا چہارم کی مکمل تدریس جس میں ہر عنوان کے تمام قواعد کا نکات کی صورت میں خلاصہ، تمام مشقوں کا ترجمہ اور قرآنِ حکیم سے اضافی مثالیں پیش کی گئی ہیں

28 ویڈیو کیسٹس میں دستیاب ہے

Qtv پر قرآن فہمی کلاس

Qtv پر Q Campus پروگرام میں انجمن کی مرتب کردہ کتاب ''عربی گرامر برائے قرآن فہمی'' کے ذریعہ تدریس کا عمل جاری ہے۔ یہ کتاب آسان عربی گرامر کی چاروں کتابوں کی تلخیص پر مشتمل ہے۔ یہ کلاس Direct method کے ذریعہ ترجمۂ قرآن سیکھنے کے لئے مفید ہے۔

سود

حرمت۔ خباثتیں۔ اشکالات

ایک مختصر لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں سود سے متعلق تمام ضروری وبنیادی معلومات اور اعتراضات کے مدلل جوابات شامل کیے گئے ہیں

منتخب نصاب حصہ اوّل تا چہارم

نکات برائے درس وتدریس

دینِ اسلام اور اس کے تقاضوں کے فہم کے لئے منتخب نصابِ قرآنی کی درس وتدریس انتہائی مفید ہے

نکات کی صورت میں آیات کا لفظی ترجمہ، تمہیدی وتفسیری تفاصیل موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی دیگر آیات واحادیث کے حوالہ جات

چہرے کا پردہ

علماء ومشائخ، مفکرین، اور ادباء کے مستند مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ

قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی پردے کے احکامات، ان احکامات کی حکمت، چہرے کے پردے کے لئے دلائل، اُمت کا متواتر عمل اور اس حوالے سے اشکالات و اعتراضات کے جوابات کتابی صورت میں

اہم دینی موضوعات

- اسلام مذہب ہے یا دین؟
- دینِ اسلام پر عمل کیسے کریں؟
- جہاد فی سبیل اللہ
- نبی اکرم ﷺ نے دین کیسے غالب کیا؟
- اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اساس

نکات برائے درس وتدریس کتابی صورت میں

ایک سالہ قرآن فہمی کورس

دنیا اور آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے دینی وجدید علوم کا سیکھنا ضروری ہے

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کو قواعدِ تجوید، عربی گرامر، ترجمۂ وتفسیرِ قرآن وحدیث اور دینی وتحریکی لٹریچر کی تعلیم کا اہتمام باصلاحیت اساتذہ کے زیرِ نگرانی

آغاز ہر سال رمضان المبارک کے بعد

قرآن ہم سے کیا چاہتا ہے؟

دینی فرائض کے بیان پر مبنی

نگرانِ انجمن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب

''مطالباتِ دین''

کا آسان اسلوب میں خلاصہ

قرآن اکیڈمی، DM-55، خیابانِ راحت، درخشاں، ڈیفنس فیز 6، کراچی۔ فون: 5340022-3

گلشن اقبال: 4993464-5 برنس روڈ: 2620496 نارتھ ناظم آباد: 6674474 یاسین آباد: 6337361 کراچی ایڈمن سوسائٹی 4382640

ای میل karachi@quranacademy.com ویب سائٹ: www.quranacademy.com

عصر رواں کے جدید تقاضوں اور سہولتوں سے استفادہ کرنا اور حکومت سے ان کے جائز حقوق کو تسلیم کروانا شامل تھا۔

اپنے قیام کے کچھ ہی عرصے بعد ایسوسی ایشن کے علاقائی مرکز کے اہم شہروں میں قائم ہو گئے جن میں مسلمانوں کے اعلیٰ اور درمیانہ طبقوں نے گہری دلچسپی لی اور یہ ادارہ مسلم معاشرہ کے معتدبہ حصہ کی سیاسی نمائندگی کا فریضہ ادا کرنے لگا۔

محمڈن ایسوسی ایشن جو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق اور فکر و عمل کی یکجہتی کے لئے سرگرم عمل تھی ملک کے دوسرے طبقوں یا قوموں سے کسی قسم کی مخاصمت یا عداوت کی قائل نہ تھی بلکہ اس کے قواعد و ضوابط میں غیر مسلموں کو بھی اس کا رکن بننے کی اجازت تھی اور سوائے ان امور کے جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے غیر مسلم ارکان کو دیگر تمام معاملات پر اظہار رائے کا حق حاصل تھا۔ غیر مسلموں کے لئے یہ سہولت مسلمانوں کے روایتی فراخدلانہ رویئے اور دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک عمل کے جذبے کا بہترین مظاہرہ تھا۔

محمڈن ایسوسی ایشن برصغیر میں مسلم آبادی کی پہلی سیاسی جماعت تھی جس نے ان کے مسائل اور مطالبات کو مقامی اور مرکزی سطح پر حکومت کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ 1882ء میں اس تنظیم کے ارکان نے وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے لئے تعلیمی سہولتوں کی غیر تسلی بخش صورت حال اور سرکاری اداروں میں ان کی قلیل نمائندگی کے بارے میں یادداشت پیش کی اور مطالبہ کیا کہ ان اہم امور پر فوری توجہ دی جائے۔

ایسوسی ایشن ملک میں قانون سازی کے عمل پر بھی مستقل نظر رکھتی تھی اور حسب ضرورت مسلمانوں کے سیاسی' مذہبی اور معاشرتی مفادات کے تحفظ کے لئے مناسب اقدامات کرتی تھی۔

1883ء میں حکومت بنگال نے شہری نظم و نسق میں عوام کے نمائندوں کو شریک کرنے کے لئے ایک بل کا مسودہ تیار کیا۔ ایسوسی ایشن نے میونسپل اداروں میں مسلم نمائندگی کو مؤثر اور یقینی بنانے کے لئے بل میں چند ضروری ترامیم پیش کرتے ہوئے تجویز کیا کہ رائے دہندگان کے لئے صاحب جائداد ہونے کی شرط کو نرم کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان حق رائے دہی سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ حکومت اس بات کی مختار ہو کہ مختلف فرقوں میں باہمی تعلقات کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اگر قرین مصلحت ہو تو اقلیتی فرقے کو اپنے نمائندے جداگانہ بنیاد پر خود منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔ ان تجاویز کو پیش کرتے ہوئے ایسوسی ایشن نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر میونسپل بل اپنی موجودہ صورت میں نافذ کیا گیا تو اس سے مسلمانوں کی حق تلفی ہوگی اور مطلوبہ اہلیت نہ رکھنے کے سبب وہ میونسپل بورڈوں میں مناسب نمائندگی کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔ ایسوسی ایشن نے حکومت پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اس نوعیت کا امتیازی اقدام ہندو مسلم اختلافات میں مزید شدت پیدا کرنے کا باعث ہوگا اور تاریخ شاہد ہے کہ ایسوسی ایشن کا یہ تجزیہ غلط نہ تھا۔

سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کافی عرصہ تک اسلامیان ہند کے حقوق کی نگہبانی اور ان کے مفادات کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری نہایت احسن طریقہ سے ادا کرتی رہی تاوقتیکہ سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی قیادت میں مسلم عوام کے مسائل و مطالبات کی زیادہ مؤثر ترجمانی کی اہل ہوئی اور انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے پہلے مسلمان قوم کے لئے مختلف النوع خطرات کا احساس کرتے ہوئے اپنی جدوجہد کو تیز تر کیا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

1885ء میں ایک ریٹائرڈ انگریز افسر اے او ہیوم نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ اس جماعت کے قیام کو کئی اعلیٰ برطانوی افسروں کی پوری حمایت حاصل تھی۔ ان میں سر ولیم ویڈر برن' جارج یول اور چارلس براڈلو شامل تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وائسرائے لارڈ ڈفرن اس قسم کی تنظیم کے زبردست حامی تھے۔ کانگریس کے پہلے صدر مسٹر ڈبلیو بینرجی اپنی کتاب ''انڈین پولیٹکس'' میں لکھتے ہیں: ''انڈین نیشنل کانگریس جس طرح اس کا آغاز ہوا اور جس انداز سے یہ کام کر رہی ہے درحقیقت مرکویس آف ڈفرن کے اقدام کا نتیجہ ہے جب وہ ہندوستان کا گورنر تھا''۔ وہ آگے چل کر کہتے ہیں کہ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم کو کانگریس کے قیام کی اجازت دیتے وقت یہ شرط عائد کی تھی کہ جب تک وہ ہندوستان میں متعین ہے کانگریس کے قیام کے سلسلے میں اس کا حوالہ نہیں دیا جائے گا۔ مسٹر ہیوم نے اس شرط کی پوری طرح پابندی کی''۔

کانگریس کے بانی مسٹر ہیوم کی خواہش تھی کہ یہ پارٹی صرف مقامی آبادی کے معاشی اور معاشرتی مسائل زیر بحث لانے کے لئے ایک فورم مہیا کرے تاکہ حکومت ان شعبوں کے متعلق عوام کے ردعمل سے آگاہ رہے البتہ سیاسی امور سے اس جماعت کا کوئی واسطہ نہ ہو لیکن لارڈ ڈفرن چاہتے تھے کہ کانگریس سیاسیات میں بھرپور حصہ لے اور حزب اختلاف کا کردار ادا کرے۔ اس طرح انتظامیہ لوگوں کے سیاسی نکتہ نظر سے بخوبی مطلع رہے گی۔ کچھ عرصہ کی بحث و تکرار کے بعد وائسرائے کی رائے کے مطابق برطانوی حکومت کی منظوری سے انڈین نیشنل کانگریس ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے معرض وجود میں آئی۔

سر ولیم ویڈر برن کے مطابق ''یہ بات بڑی سنجیدگی سے تجویز کی گئی تھی کہ بمبئی کے گورنر لارڈ رے کانگریس کے پہلے اجلاس کی صدارت کریں''۔

''وائس آف انڈیا'' کے جنوری 1887ء کے شمارے میں کہا گیا کہ ''جب گورنر جنرل لارڈ ڈفرن نے کانگریس کے دوسرے سالانہ اجلاس کے مندوبین کو دعوت دی تو یہ لوگ بے حد خوش تھے''۔

مدراس کے گورنر لارڈ کونمارا نے بھی کانگریس کے تیسرے سالانہ اجلاس کے شرکاء کے اعزاز میں استقبالیہ دیا اور بعد میں گورنر جنرل کو لکھا کہ ''کانگریسی رہنما نہایت فرمانبردار اور بے آزار قسم کے لوگ ہیں''۔

تیسرے سالانہ اجلاس کی رپورٹ کے مطابق استقبالی کمیٹی کے چیئرمین راجہ سرٹی مدھاراؤ نے خود اعتراف کیا کہ کانگریس کا قیام برطانوی انتظامیہ کی اہم کامیابی ہے۔

بین پال اپنی کتاب ''دی نیشنل کانگریس'' میں کہتے ہیں کہ ''کانگریس کے ابتدائی ارکان بہ بانگ دہل برطانیہ سے وفاداری کا اعلان کرتے تھے اور مسلسل یہ دعویٰ کرتے تھے کہ کانگریس کا وجود ملک میں انگریزوں کے اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے''۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کانگریس کے چند اجلاسوں کی صدارت کے فرائض بعض ذی اثر انگریزوں نے ادا کئے مثلاً 1889ء کے اجلاس کے صدر سر ولیم ویڈر برن تھے جبکہ الفرڈ ویب نے 1894ء اور سر ہنری کاٹن نے 1904ء کے اجلاسوں کی صدارت کی۔

اگرچہ بظاہر یہ جماعت برصغیر میں رہنے والے مختلف عناصر کو ایک قومی وحدت کی صورت میں یکجا کرنے کے لئے بنائی گئی تھی اور اسے ملک کی تمام آبادی کی رہنما ہونے کا دعویٰ بھی تھا لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کانگریس سے کوئی دلچسپی نہ رکھتی تھی بلکہ اس کی مخالف تھی اور یہ سمجھنے میں حق بجانب تھی کہ کانگریس ان کے حقوق کا تحفظ کرنے کی بجائے ہندو قومیت کی بالادستی قائم کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ کانگریس کے پہلے اجلاس میں 72 مندوبین میں سے صرف 2 مندوب مسلمان تھے۔ اخبارات نے کانگریس

میں مسلمانوں کی عدم دلچسپی کا بطور خاص ذکر کیا اور لندن کے ہفت روزہ ''ٹائمز'' نے اپنی 5 فروری 1886ء کی اشاعت میں کانگریس کے پہلے اجلاس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''صرف ایک بڑی قوم کے نمائندوں کی عدم موجودگی نمایاں تھی''۔ مسلمانانِ ہند وہاں نہیں تھے۔ مذہب کے علاوہ سکولوں اور کالجوں میں بھی ان کا طرزِ عمل مغرورانہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ معلوم کرنا کوئی خاص مشکل نہیں۔ وہ (مسلمان) اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتے کہ دو سو سال سے بھی کم عرصہ پہلے وہ حکمران نسل تھے''۔

کانگریس کے پہلے اجلاس کے بعد مسلمانوں کو اس جماعت میں ہندوؤں کی غالب اکثریت کے انداز فکر کا اندازہ ہو گیا اور ''سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن'' جس نے پہلے اجلاس کے انعقاد میں تعاون کیا تھا' 1886ء میں کلکتہ میں ہونے والے دوسرے اجلاس میں ہمکاری سے انکار کر دیا اور ایسوسی ایشن کی ایگزیکٹو کمیٹی نے اس فیصلے کا جواز پیش کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں کہا: ''نیشنل کانگریس کے 1886ء کے اجلاس میں ایسوسی ایشن کی غیر حاضری پر بعض ہندو اخبارات نے بہت سخت تنقید کی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اس اقدام کی وجوہات بیان کر دیں۔ ایسوسی ایشن کو کانگریس کے بعض اغراض و مقاصد سے ہمدردی ہے اور ہم اس تحریک کے سرکردہ زعما کا بھی احترام کرتے ہیں لیکن ہمیں پورا یقین ہے کہ کانگریس کے مجوزہ پروگرام پر غیر مشروط عملدرآمد مسلمانوں کی سیاسی تباہی کا موجب ہوگا۔ ایسوسی ایشن اس بات سے متفق ہے کہ کونسلوں میں نامزدگی کے طریق کار کے نتائج عموماً خوش کن نہیں ہوتے۔ لیکن ملک میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے اور قومیتوں اور مذہبی عقائد کی بنیاد پر انتخابات کی ضرورت کے پیش نظر ایسوسی ایشن کو یقین ہے کہ ان حالات میں نمائندہ اداروں کا قیام مسلمانوں کے لئے زیادہ سود مند نہیں ہوگا۔ اقلیتوں کے حقوق کو سامنے رکھتے ہوئے نمائندگی کے اصولوں کا (از سر نو) پوری احتیاط سے جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ ایسوسی ایشن کسی ایسے نظام کے نفاذ کی حمایت نہیں کرے گی جس سے اقلیت حکومت کے ہر شعبے میں مکمل طور پر دب کر رہ جائے۔ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ دونوں قوموں کی غیر متوازن سیاسی ترقی اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی نسبتاً کمی اس کمیٹی کے لئے لازمی قرار دیتی ہے کہ وہ ہر اس تحریک یا نظام کے خلاف حفاظتی تدابیر اختیار کرے جس سے مسلمانوں کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو۔ کمیٹی کو یقین ہے کہ جب تک مسلمان سیاسی اور تعلیمی میدان میں ہندوؤں کے ہم پلہ نہیں ہو جاتے اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی یقین دہانی کانگریس کے پروگرام میں شامل نہیں کر لی جاتی وہ مقاصد جو کانگریس نے متعین کئے ہیں بالآخر مسلمانوں کو بحیثیت قوم کلی طور پر نابود کر دیں گے''۔

یہ شکوک و شبہات اس وقت درست ثابت ہوئے جب کانگریس نے ملک میں نمائندہ حکومت کے قیام کے لئے تجاویز پیش کیں۔ لیجلیسٹو کونسلوں کی وسیع تر بنیادوں پر تشکیل نو کا مطالبہ کرتے ہوئے کانگریس نے تجویز کیا کہ ان میں منتخب نمائندوں کی مناسب تعداد کو شامل کیا جائے اور صوبائی کونسلوں کے ارکان کے انتخاب کا حق صرف ان طبقوں اور افراد کو دیا جائے جو اسے آزادانہ اور دانشمندانہ طریقہ سے استعمال کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مثلاً میونسپل کمیٹیوں' ڈسٹرکٹ بورڈوں' یونیورسٹیوں' ایوان ہائے تجارت کے ارکان اور تعلیمی اور مالی استعداد رکھنے والے حضرات۔

گورنر جنرل کی کونسل کے ممبران کے انتخاب کے سلسلے میں کانگریس نے کہا کہ انہیں منتخب کرنے کا حق صوبائی کونسلوں کے نمائندوں کو حاصل ہونا چاہئے اور یہ کہ سرکاری دفاتر میں تمام آسامیاں (سوائے چپڑاسیوں کے) مقابلے کے امتحانات کے ذریعہ پُر کی جائیں۔

❁❁❁

اعلان

ہفت روزہ تربیت گاہ برائے ملتزم رفقاء

انشاء اللہ 3 اپریل بروز اتوار نماز عصر سے ملتزم رفقاء کے لئے مرکز تنظیم اسلامی گڑھی شاہو لاہور میں تربیت گاہ کا آغاز ہو رہا ہے جو کہ 9 اپریل بروز ہفتہ نماز ظہر تک جاری رہے گی۔

ملتزم رفقاء زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوں

المعلن

(مرکزی شعبہ تربیت)

آیئے! وقت کو قیمتی بنایئے خود سیکھیے اور سکھایئے

گلی گلی کوچہ کوچہ دعوت دین پہنچایئے

خیرالناس من ینفع الناس بن کر اعلائے کلمۃ اللہ میں جت جایئے

سہ روزہ' ہفت روزہ پروگراموں میں وقت دے کر اپنے فکر کے استحکام' حرکی تربیت حاصل کریں' داعی الی اللہ بنیں اور دیگر تنظیمی و انتظامی اُمور میں حصہ لیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کے لئے قبول فرمائے۔ آمین!

تنظیم اسلامی حلقہ لاہور ڈویژن کے زیر اہتمام

سہ روزہ پروگرام ___ یکم تا 3 اپریل 2005ء (جمعہ۔ ہفتہ۔ اتوار)

مقام: مسجد خدیجۃ الکبریٰ' شیخوپورہ

(چک کرمانوالہ بٹی کوٹھی روڈ' محلہ غوث نگر نزد لنڈا پھاٹک)

برائے رابطہ: قیصر جمال فیضی۔ فون: 0256361171 موبائل: 0300-4696615

منجانب: **شعبہ دعوت و تفریغ اوقات' تنظیم اسلامی**

حصہ دوم

علی گڑھ تحریک سے تقسیم بنگال تک

1886ء — 1905ء

بظاہر یہ مطالبات اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ کانگریس عوام کے حقوق کی پاسبان اور ان کے احساسات کی ترجمان ہے اور ملکی معاملات میں عوام کے منتخب نمائندوں کی شرکت کے لئے سرگرم عمل ہے لیکن درحقیقت صورتِ حال مختلف تھی اور یہ مطالبات مسلمانوں کے مفادات کے سراسر خلاف تھے۔ بعض ناسازگار حالات کے باعث مسلمان مغربی تعلیم میں دوسرے ہم وطنوں کی نسبت کافی پسماندہ تھے اور سرکاری ملازمتوں کے لئے مقابلے کے امتحان کے ذریعہ ان کی کامیابی اور متناسب نمائندگی کے کوئی امکانات نہ تھے۔ اسی طرح معاشی بدحالی کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت رائے دہندگی کے لئے کانگریس کی مجوزہ شرائط پر پوری اترنے کی اہل نہ تھی۔ لہٰذا ان کا انتخابات میں حصہ لینا اور صوبائی کونسلوں میں منتخب ہونا بہت مشکل تھا۔ ایسے حالات میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان تجاویز پر عملدرآمد سے مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کی غلامی کا شکار ہو جاتے۔ ان سنگین خطرات کو محسوس کرتے ہوئے اسلامیانِ ہند کے سرکردہ زعما نے جن میں سرسید احمد خان، سید امیر علی اور نواب عبداللطیف شامل تھے، مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت اور اس کی حمایت سے باز رہنے کا مشورہ دیا اور اپنے منفرد ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی مفادات کے تحفظ اور ترقی کے لئے کوشاں ہونے کی دعوت دی۔

اس جدوجہد میں سرسید احمد خان نے نمایاں کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو ان مختلف عوامل سے آگاہ کیا جو کانگریس کے لبادے میں ان کے خلاف کارفرما تھے۔ انہوں نے اردو ہندی تنازعہ کا حوالہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو ہندوؤں کے عزائم سے خبردار کیا اور اس امر کی نشاندہی کی کہ تقریباً ایک ہزار سال تک غلام رہنے کے بعد اب ہندو سیاسی ہتھکنڈوں سے مسلمانوں کو زیر کرنا چاہتے ہیں اور اگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے اور انہیں سیاسی بالادستی حاصل ہو گئی تو مسلمان انتہائی ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس لئے اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنا مسلمانوں کے لئے ایک اہم ضرورت اور محفوظ مستقبل کی ضمانت ہے۔

محمڈن ایجوکیشنل کمیٹی

مسلم زعما کے بروقت اقدام کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور کانگریس کے ابتدائی سالانہ اجلاسوں میں نہایت کم تعداد میں مسلم نمائندوں نے شرکت کی۔ اسی دوران سرسید احمد خان نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو ان کے تعلیمی اور معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ رکھا جا سکے۔ اس سوسائٹی کا بنیاد مقصد جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مسلمانوں میں جدید علوم کی تعلیم کو مقبول بنانا تھا۔

کانگریس نے مسلمان نمائندوں کی کمی کو دور کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کئے اور چند مسلم زعما کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کانگریس بلاتمیز مذہب وملت برصغیر کے ہر باشندے کے حقوق کی پاسداری کے لئے کوشاں ہے۔ دسمبر 1887ء میں کانگریسی منتظمین کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور مدراس میں منعقد ہونے والے تیسرے سالانہ اجلاس میں 75 (پچھتر) مسلم مندوبین نے شرکت کی جن میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے چند طلبا بھی شامل تھے۔ اس اجلاس کی صدارت بمبئی کے ایک معروف مسلمان بدرالدین طیب جی نے کی۔ سرسید احمد خان کو بھی اجلاس میں شریک ہونے کے لئے مدعو کیا لیکن انہوں نے یہ کہتے ہوئے معذوری کا اظہار کیا کہ ہندو مسلم دو الگ قومیں ہیں اس لئے کوئی ایک جماعت ان کے مفادات کا تحفظ کرنے کا فریضہ ادا نہیں کر سکتی۔

کانگریس کے تیسرے اجلاس میں پہلے سالوں کی نسبت زیادہ مسلمان مندوبین کی شرکت سرسید احمد خان کے لئے خاصی پریشان کن تھی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ مسلمان اراکین کی تعداد میں اضافے سے کانگریس کے قومی تشخص کو تقویت حاصل ہوگی اور مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت پر نقصان دہ اثرات مرتب ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس کے عزائم کو بے نقاب کرنے کے لئے باقاعدہ مہم کا آغاز کیا اور مسلمانوں کو اس جماعت میں شامل ہونے اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مضمرات اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لئے لکھنؤ، میرٹھ اور دوسرے کئی مقامات پر جلسوں سے خطاب کیا۔ اپنی تقریروں میں سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگریس کی تجاویز کا تجزیہ کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ اگر کانگریس کے مطالبات منظور ہو گئے تو بحیثیت قوم مسلمانوں کو شدید مالی، سماجی اور سیاسی مشکلات کا سامنا ہوگا اور ان کی آئندہ نسلیں زندگی کے ہر میدان میں اغیار کی زیردست ہو کر رہ جائیں گی۔ انہوں نے واضح کیا کہ برصغیر میں آباد مختلف قومیں جداگانہ تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کی حامل ہیں اور ان کے سیاسی مقاصد مذہبی عقائد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا کوئی بھی سیاسی عمل جس میں ان اقوام کے مذہبی رجحانات کو نظرانداز کیا گیا قطعاً غیر منصفانہ اور جابرانہ ہوگا۔

یہاں اس امر کی وضاحت بے جا نہ ہوگی کہ سرسید احمد خان کی سرگرمیاں ہندو قوم کے خلاف متعصبانہ جذبات پر مبنی نہ تھیں بلکہ ان کا بنیادی مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ تھا۔ وہ ایک فراخدل مسلمان تھے اور خلوصِ نیت سے چاہتے تھے کہ ہر قوم کو اس کے جائز حقوق حاصل ہوں۔

سرسید احمد خان کی شبانہ روز تگ ودو سے مسلمانوں کے دلوں میں بدلے ہوئے حالات کے سیاسی تقاضوں اور معاشرتی ضرورتوں کا احساس بیدار ہوا۔ ملک میں سرسید کے پیغام سے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ہمنوائی کانگریسی زعما کے لئے کافی حد تک باعث تشویش تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے مسلم عوام کے مطالبات کا ان کے نکتہ نظر سے جائزہ لینے کی بجائے انہی اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھا اور ہندو اکثریت کے غلبہ کے متعلق مسلمانوں کے اذہان میں جو شبہات وخدشات تھے وہ دور کرنے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ اپنے اس دعوے کو دہراتے رہے کہ کانگریس

کو مسلمانوں کی خاطر خواہ تعداد کی حمایت حاصل ہے اور وہ ایک قومی جماعت ہے۔

سرسید احمد خان نے کانگریس کے اس بے بنیاد دعوے کی قلعی کھولنے کے لئے 1888ء میں مسلمان زعما اور کانگریس کے مخالف ہندو رہنماؤں سے تعاون کی اپیل کی تا کہ ملک کے اندر ملک سے باہر خصوصاً برطانوی عوام کے سامنے کانگریسی قیادت کا یہ دعویٰ کہ ان کی جماعت کو ہندوستان کے تمام طبقوں اور فرقوں کی حمایت حاصل ہے غلط ثابت کیا جا سکے۔ اس اپیل کے کچھ ہی روز بعد سرسید نے انڈین پیٹری آنک ایسوسی ایشن (Indian Patriotic Association) قائم کی' جس کے اغراض ومقاصد حسب ذیل تھے:

1۔ ایسے کتابچے اور دوسرا مواد شائع کرنا جس کے ذریعہ برطانوی عوام' ارکان پارلیمنٹ اور اخبارات میں کانگریس کے پیدا کردہ اس تاثر کو زائل کیا جائے کہ ہندوستان کی تمام اقوام' مختلف والیانِ ریاست اور اکابرین ملک کانگریس کے اغراض و مقاصد سے متفق ہیں۔

2۔ برطانوی ارکان پارلیمنٹ اور اخبارات کے ذریعے عوام کو ان مسلمانوں اور اسلامی انجمنوں اور ہندوؤں اور ان کی تنظیموں کے خیالات سے مطلع کیا جائے جو کانگریس کے مقاصد سے اختلاف رکھتی ہیں۔

ملک بھر سے تقریباً چالیس اداروں نے ایسوسی ایشن کے پروگرام کی تائید کرتے ہوئے اس سے الحاق کا اعلان کیا۔ یہ ایسوسی ایشن ایک عرصہ تک کافی فعال رہی اور کانگریس کے لئے مختلف محاذوں پر خاصی مشکلات پیدا کرتی رہی۔

1889ء میں کانگریس کو ایک سنگین داخلی بحران کا سامنا کرنا پڑا۔ قانون ساز کونسلوں کی توسیع اور ترتیب نو کے سلسلے میں مجوزہ قرارداد پر بحث کے دوران اجلاس میں بعض مسلمان مندوبین نے مطالبہ کیا کہ امپریل اور صوبائی کونسلوں میں ہندو اور مسلمان ارکان کی تعداد مساوی رکھی جائے۔ لیکن کانگریسی قیادت نے مسلمان مندوبین کی تجویز میں مضمران کے خدشات کی تلافی کئے بغیر اسے یکسر مسترد کر دیا۔ کئی مسلمان ارکان جو کچھ ہی عرصہ پیشتر کانگریس میں بڑی توقعات کے ساتھ شامل ہوئے تھے' انتہائی مایوسی کے عالم میں اسے چھوڑ گئے۔

اس واقعہ سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ کانگریس کے اندر بھی کئی مسلمان اس کے بعض اصولوں سے متفق نہ تھے' وہاں دوسری طرف کانگریس ان مسلمانوں میں بھی غیر مقبول ہوئی جو محض سرسید کی مخالفت کے باعث اس کے رکن بنے تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کے متعلقہ حلقوں کو بھی مسلم عوام کے احساسات کا علم ہو گیا۔

کانگریس ایک قومی جماعت کہلانے کے باوجود ہندو قومیت کے اثرات سے آزاد نہ تھی بلکہ کئی مواقع پر اس کے اہم ترین زعماء نے ان اصولوں کو پس پشت ڈال دیا جن کا وہ پارٹی کی غیر فرقہ وارانہ پالیسی کے حوالے سے فخریہ ذکر کیا کرتے تھے۔ مولانا ابوالکلام ایسے ہی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ کی طرف سے (1937ء کی کانگریسی وزارتوں کے) مظالم کی جن داستانوں کو ہوا دی جا رہی تھی وہ افسانہ طرازی سے زیادہ کچھ نہ تھیں لیکن اس وقت دو ایسے واقعات ہوئے ہیں جو صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی بدنامی کا باعث بنے ہیں۔ مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی کہ بمبئی اور بہار میں کانگریس اپنے قومی کردار کی آزمائش میں پوری نہیں اتری۔ کانگریس ایک قومی جماعت کی حیثیت سے پروان چڑھی تھی اور اس نے مختلف فرقوں کے افراد کو قیادت کے مواقع بھی فراہم کئے تھے۔ بمبئی میں مسٹر نریمان جی مقامی طور پر کانگریس کے ایک مسلمہ رہنما تھے۔ چنانچہ جب صوبائی حکومت بنانے کا سوال پیدا ہوا تو یہ توقع کی جا رہی تھی کہ ان کی بیش بہا خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں ہی صوبائی کابینہ بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ اس طرح کانگریس پارٹی کے ممبران میں ہندو اکثریت کے باوجود ایک پارسی وزیراعلیٰ بنتا۔ لیکن سردار پٹیل اور ان کے رفقاء اس صورت حال کو کسی طرح بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کانگریس کے ہندو رائے دہندگان کو اس اعزاز سے محروم کرنا ان سے زیادتی کے مترادف ہوگا لہٰذا مسٹر جی کھیر کو (جو ایک ہندو ممبر تھا) کانگریس کی اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب کر کے اسے وزیراعلیٰ بنا دیا گیا۔ مسٹر نریمان اس فیصلہ سے بے حد ناخوش تھے۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے یہ سوال اٹھایا۔ جواہر لال نہرو کمیٹی کے صدر تھے اور خیال کیا جاتا تھا کہ وہ فرقہ وارایت سے بالاتر ہو کر اس مسئلہ کو حل کریں گے لیکن انہوں نے بھی مایوس کیا اور مسٹر نریمان کی اپیل مسترد کر دی۔ وہ سردار پٹیل کو کسی قسم کی الزام تراشی کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ جواہر لال کے رویئے سے نریمان کو بہت حیرت ہوئی' بالخصوص اس لئے کہ جواہر لال کا لہجہ نہایت درشت تھا اور اجلاس میں وہ اس شدت سے چلائے کہ نریمان کے لئے سوائے خاموشی کے کوئی چارہ نہ تھا۔ مجبوراً نریمان نے سارا معاملہ گاندھی جی کے سامنے پیش کر دیا۔ گاندھی جی نے ایک غیر جانبدار شخص کے ذریعے تحقیقات کا حکم دیا۔ سردار پٹیل اور ان کے رفقاء نے پورے معاملہ کو کچھ اس انداز سے الجھا کر پیش کیا کہ تحقیقاتی افسر نے انہیں بری الذمہ قرار دے دیا۔ لیکن وہ افراد جو حقیقت حال سے واقف تھے اس فیصلہ سے مطمئن نہ تھے۔ ہم سب کو علم تھا کہ صداقت کو سردار پٹیل کے تعصب کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔''

''اسی نوعیت کا ایک واقعہ بہار میں بھی پیش آیا۔ انتخابات کے بعد ڈاکٹر سید محمود مقامی سطح پر ممتاز ترین رہنما تھے۔ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سیکرٹری جنرل بھی تھے۔ لہٰذا انہیں صوبے کے اندر اور باہر نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ جب کانگریس کو صوبائی انتخابات میں قطعی اکثریت حاصل ہو گئی تو سب کو یقین تھا کہ ڈاکٹر سید محمود کو بہار کا وزیراعلیٰ مقرر کیا جائے گا۔ لیکن ان کی بجائے شری کرشنا سنہا اور انوگراہا نرائن سنہا کو جو مرکزی اسمبلی کے رکن تھے' بہار واپس بلایا گیا اور انہیں وزیراعلیٰ کا منصب سنبھالنے کے لئے تیار کیا جانے لگا۔ بہار میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وہی کردار کیا جو بمبئی میں سردار پٹیل نے کیا تھا۔ ان دو واقعات نے اس وقت نہایت برے اثرات مرتب کئے اور بعد میں جب بھی ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کانگریس اپنے بلند بانگ دعوؤں پر ثابت قدم نہ رہ سکی اور اس حقیقت کو نہایت افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت کانگریس ایسے مقام تک نہیں پہنچی تھی جہاں فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر ہو کر اکثریت یا اقلیت میں سے محض اہلیت کی بنیاد پر رہنما منتخب کیا جاتا''۔

کانگریسی لیڈروں کی متعصبانہ ذہنیت کی ایک اور مثال بیان کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں:

''بنگال میں اکثریتی فرقہ ہوتے ہوئے بھی مسلمان بعض نامساعد حالات کے باعث تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے بہت پسماندہ تھے اور سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر کسی قابل ذکر مقام کے حامل تھے۔ اگرچہ ان کی آبادی پچاس فیصد تھی مگر وہ تیس فیصد سے بھی کم آسامیوں پر متعین تھے۔ مسٹر سی آر داس نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں کو ان کے اقتصادی حقوق نہ دیئے گئے وہ کانگریس کا ساتھ نہیں دیں گے۔ چنانچہ اس نے ساٹھ فیصد اسامیاں مسلمانوں کے لئے منتخب کر دیں تا آنکہ ملازمتوں میں ان کی تناسب نمائندگی پوری نہ ہو جائے۔ اس اعلان سے نہ صرف بنگال بلکہ پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا اور صوبائی کانگریس کی سطح پر بھی تلاطم پیدا ہوا۔ اکثر کانگریسی لیڈروں نے نہایت سختی سے اس فیصلے کی مخالفت کی اور مسٹر داس کے خلاف باقاعدہ

مہم کا آغاز کیا۔ مسٹر داس بھی اپنی بات پر ڈٹا رہا اور آخر کار اپنا نکتہ نظر منوانے میں کامیاب ہو گیا لیکن بدقسمتی سے اس کی قبل از وقت وفات نے اس کے مخالفین کو موقع فراہم کیا اور مسلمانوں کے حق میں کئے گئے اس کے تمام فیصلوں کو فوراً منسوخ کر دیا گیا۔ اس طرح مسلمان کانگریس سے بدظن ہوئے اور تقسیم کی بنیاد پڑی''۔

مولانا ابوالکلام آزاد میدانِ سیاست میں وارد ہونے کے بعد ہمیشہ کانگریس سے منسلک رہے۔ انہوں نے 1939ء سے 1946ء تک مسلسل سات سال تک نہایت اہم اور تاریخ ساز دور میں اس پارٹی کی صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ ان کی خودنوشت سے مندرجہ بالا اقتباسات کانگریس کے ان عوامل کی نشاندہی کرتے ہیں جو درحقیقت ان کی حکمت عملی مرتب کرنے اور اسے کسی خاص نہج پر لے جانے کے ذمہ دار تھے۔ مولانا آزاد گاندھی کے مداح ہوتے ہوئے بھی ان کے بعض اقدامات کے شدید مخالف تھے۔ چنانچہ جولائی 1942ء میں جب واردھا میں کانگریس پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا تو مولانا آزاد نے حکومت کے خلاف گاندھی جی کے پُرامن احتجاجی تحریک کے چیدہ چیدہ نکات پیش کرتے ہوئے اس کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ اس موقع پر بقول مولانا آزاد' جواہر لال نہرو نے ایک حد تک میرا ساتھ دیا لیکن باقی ممبران نے گاندھی جی کی تجویز کی حمایت پر اکتفا کیا''۔ مولانا فرماتے ہیں: ''یہ اجلاس 5 جولائی کو شروع ہو کر کئی دن تک جاری رہا۔ میں نے اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر گاندھی جی سے اختلاف رائے کا اظہار کیا تھا لیکن اس دفعہ ہماری آراء قطعی طور پر متضاد تھیں۔ صورت حال اس درجہ سنگین ہو گئی کہ گاندھی جی نے مجھے ایک خط بھیجا جس میں لکھا کہ میرا نکتہ نظر ان کے اندازِ فکر سے اس قدر مختلف تھا کہ اب ہم دونوں کے لئے یکجا رہنا ناممکن تھا۔ لہٰذا اگر کانگریس کی خواہش تھی کہ گاندھی جی تحریک کی رہنمائی کریں تو پھر مجھے فوراً پارٹی کی صدارت اور ورکنگ کمیٹی کی رکنیت سے مستعفی ہونا پڑے گا''۔ اگرچہ بعد میں دوسرے ممبران کی مداخلت اور اس آمرانہ اقدام کے خلاف احتجاج پر گاندھی نے اپنا خط واپس لے لیا لیکن یہ واقعہ کانگریس میں گاندھی جی کی فیصلہ کن حیثیت اور اس کے طرزِ عمل کا مظہر ہے۔

تقسیم بنگال 1905ء

برصغیر کی تاریخ میں بنگال کو ہمیشہ خصوصی مقام حاصل رہا ہے۔ مغلیہ عہد حکومت میں بنگال مملکت کا سب سے بڑا صوبہ تھا۔ جس میں بنگال کے علاوہ بہار اور اڑیسہ بھی شامل تھے۔ مغل حکمرانوں نے اس کی ہمہ گیریت کے پیش نظر یہاں ہمیشہ اپنے قابل ترین اور نہایت معتمد امراء کو گورنر متعین کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی اس صوبے کے ساحلی مقام ہگلی کو اپنا مستقر بنایا اور یہیں سے اپنے سیاسی اور اقتصادی اثر و رسوخ کو وسعت دی۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے بنگال کے مسلمان ہر شعبے میں قابل قدر مقام رکھتے تھے۔ تجارت و زراعت اور صنعت و حرفت میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ کئی دینی مدارس حکومت کے تعاون سے اسلامی تعلیمات کی ترویج میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ اپنے مخصوص تہذیب و تمدن اور جداگانہ رسوم و روایات کے باعث مسلمانوں کا بحیثیت قوم ایک منفرد تشخص تھا لیکن بعض مسلمان حکمرانوں کی غلط بخشیوں کے سبب ہندوؤں نے معاشرہ میں کافی اہمیت حاصل کر لی۔ انہیں حکومت میں کلیدی مراتب دیئے گئے اور مالیات وغیرہ کی اہم ذمہ داریاں بھی سونپی گئیں۔ ان مراعات سے ہندوؤں نے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنی اقتصادی حالت کو خاصا مستحکم کر لیا۔ البتہ وقت آنے پر بغیر کسی تامل کے اپنے محسنوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا اور ان کا اعتماد حاصل کیا۔ انگریز مسلمانوں سے نہ صرف بدظن تھے بلکہ انہیں اپنا حریف بھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اقتدار سنبھالنے کے بعد انہوں نے مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کیا اور ہندوؤں کی سرپرستی کی۔ انہیں ہر میدان میں نوازا اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے تباہ و برباد ہو گئے۔ سیاسی اور معاشی فوقیت جاتی رہی۔ سماجی اعتبار سے انتہائی ابتری کا شکار ہوئے اور محکومی و محرومی ان کا مقدر بنی۔

بنگال کی وسعت اور گوناں گوں انتظامی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے کئی انگریز حاکموں نے وقتاً فوقتاً اس کی تنظیم نو کے بارے میں مختلف تجاویز پیش کیں تاکہ عوام کی فلاح و بہبود اور دوسرے امور پر پوری توجہ دی جا سکے لیکن کسی تجویز پر بھی عملدرآمد نہ ہو سکا۔ دریں اثنا اڑیا زبان بولنے والوں نے جو بنگال' سی پی اور مدراس میں آباد تھے حکومت سے اپنے لئے ایک علیحدہ صوبے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ 1901ء میں جب ان کا معاملہ زیر غور آیا تو بنگال کی تقسیم کا مسئلہ بھی دوبارہ زندہ ہوا۔ لارڈ کرزن نے بنگال کے مختلف لیفٹیننٹ گورنروں کی سفارشات کا مطالعہ کرنے کے بعد حکومت برطانیہ کو ایک جامع منصوبہ پیش کیا جس میں بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

لندن میں حکومت نے پورے غور و خوض اور تفصیلی تجزیہ کے بعد 1903ء میں لارڈ کرزن کی تجویز کو منظور کرتے ہوئے بنگال کو تقسیم کرنے کا ابتدائی اعلان کیا۔ اگرچہ اس اعلان میں تقسیم بنگال کی تفصیلات شامل نہ تھیں اس کے باوجود ہندوؤں نے اس کے خلاف باقاعدہ مہم کا آغاز کیا اور ہر سطح پر اسے نہایت نامناسب اور عوام دشمن اقدام قرار دیا۔ ہندو اخبارات بھی جی کھول کر اس کی مخالفت پر اتر آئے اور اس فیصلہ کو بنگالی قوم کے خلاف ''ناپاک سازش'' کا نام دیا۔ کئی مسلمان بھی ہندوؤں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے اور مجوزہ تقسیم کا تفصیلی مطالعہ کئے بغیر اس کی مخالفت میں ہندوؤں کا ساتھ دینے لگے۔

19 جولائی 1905ء کو حکومت برطانیہ کی طرف سے تقسیم بنگال کے مجوزہ پلان کا رسمی اعلان کیا گیا جس کے مطابق یہ صوبہ دو حصوں میں منقسم ہوا۔ مشرقی حصہ میں صوبہ آسام کے علاوہ چاٹگام' میمن سنگھ اور ڈھاکہ ڈویژن شامل کئے گئے۔ اس کی کل آبادی تین کروڑ دس لاکھ تھی جس میں تقریباً ایک کروڑ اسی لاکھ مسلمان تھے جبکہ مغربی صوبے میں جو جنگال کے باقی علاقہ پر مشتمل تھا پانچ کروڑ چالیس لاکھ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد نوے لاکھ کے لگ بھگ تھی۔

تقسیم بنگال کا اعلان مسلمانوں کے لئے باعثِ اطمینان تھا۔ انہیں عظیم بنگال میں ایک اقلیت کی حیثیت سے جن مشکلات اور دشواریوں کا سامنا تھا اس سے ان کی بیشتر آبادی نے نجات پائی اور مشرقی صوبے میں اکثریتی فرقہ کا درجہ حاصل ہوا۔ لیکن بنگال کے علاوہ ملک بھر کے ہندو اس اقدام سے سخت برہم اور چراغ پا تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ اس منصوبے کی مخالفت کرنے لگے۔ کانگریسی لیڈروں نے بھی اسے ''بنگالیوں کے ساتھ انتہائی ناانصافی اور ظلم'' کہتے ہوئے مخالفانہ کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس ''غیر منصفانہ فیصلے'' کو منسوخ کرانے کے لئے سرگرم عمل ہوئے۔

ہندوؤں کو تقسیم بنگال کے بنیادی عوامل کا بخوبی علم تھا اور وہ جانتے تھے کہ اس صوبے کی بے اندازہ وسعت کے باعث انتظامی امور میں روز افزوں مشکلات پر قابو پانے کے لئے یہ اقدام نہ تو غیر مناسب تھا اور نہ ہی غیر منصفانہ لیکن وہ اسے فرقہ واریت کے مخصوص نقطہ نظر سے

دیکھتے تھے اور اسی انداز سے اظہار خیال بھی کرتے تھے۔ تقسیم بنگال کے بارے میں کانگریس کے سرکردہ لیڈر سریندر ناتھ بینرجی کا ردعمل ایسی ہی ذہنیت کا عکاس ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ اعلان ہم پر ایک بم کی طرح سے گرا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہماری توہین اور تذلیل کی گئی ہے۔ ہمارے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ بنگالی بولنے والی آبادی میں بڑھتی ہوئی یکجہتی اور بیداری پر جان بوجھ کر ایک کاری ضرب لگائی گئی ہے''۔

بہرحال 16 اکتوبر 1905ء کو جب تقسیم بنگال کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا گیا تو ہندوؤں کی مخالفانہ مہم میں بھی مزید تیزی پیدا ہوئی۔ بنگال کے ساتھ ساتھ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی احتجاجی جلوس نکالے گئے اور جلسے منعقد ہوئے جن سے مختلف ہندو تحریکوں کے رہنماؤں کے علاوہ کانگریسی لیڈروں نے بھی خطاب کیا اور حکومت سے اس فیصلے کو فوری طور پر منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ ایسے ہی ایک جلسے میں ہندوؤں کے سرکردہ لیڈر مہاراجہ مہندرا چندر نندی نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''نئے صوبے میں مسلمان چھائے رہیں گے۔ بنگالی ہندو اقلیت بن جائیں گے۔ ہم اپنے گھر میں اجنبی ہوں گے۔ اس عمل کے نتائج کا خوف مجھے دہلائے دیتا ہے۔ ہماری نسل کا مستقبل مجھے انتہائی تاریک نظر آتا ہے۔

یہ الفاظ ہندوؤں کے باطنی احساسات اور ان مخاصمانہ جذبات کے ترجمان تھے جو تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی مہم کے حقیقی محرک تھے۔

اگرچہ ہندو رہنما اس اقدام کو بنگالی قومیت کے خلاف ایک سازش سے تعبیر کرتے تھے اور بظاہر اسی بنیاد پر اس کی مخالفت بھی کر رہے تھے تاہم جیسا کہ مسٹر نندی کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے ہندوؤں کے حقیقی خدشات کی وجہ کچھ اور ہی تھی۔ انہیں یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ مشرقی صوبے کے قیام سے ان کی اقتصادی بالادستی اور سیاسی فوقیت کو شدید نقصان پہنچے گا۔ وہ مشرقی حصہ کا استحصال کرنے سے محروم ہو جائیں گے۔ جبکہ مسلمانوں کو ترقی و خوشحالی کے مواقع میسر آئیں گے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور علیحدہ قومیت کا جذبہ بیدار ہوگا۔

سودیشی تحریک:

ادھر کانگریس جو ایک غیر مذہبی اور قومی جماعت ہونے کی دعویدار تھی مسلمانوں کے مفاد کو یکسر نظر انداز کر کے ہندوؤں کے نقطہ نظر کی پاسداری کر رہی تھی اور تقسیم بنگال کو ختم کرانے کے لئے کسی بھی ہتھکنڈے کو آزمانے کیلئے تیار تھی۔ چنانچہ 7 اگست 1905ء کو کانگریسی رہنماؤں نے انگریزوں پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کی غرض سے ''سودیشی تحریک'' چلائی جس کا مقصد برطانوی مال کا بائیکاٹ کرنا تھا۔ بنگال میں یہی ترکیب ہندو سرمایہ داروں اور ساہوکاروں نے استعمال کی اور مسلمان کسانوں اور دستکاروں کو مالی دباؤ کے ذریعے مجبور کرنے لگے کہ وہ بھی سودیشی تحریک اور تقسیم بنگال کے خلاف مہم میں شریک ہوں لیکن انہیں اپنی اس مذموم حرکت میں چنداں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مسلمان ان کے ارادوں کو بھانپ گئے اور رفتہ رفتہ ان تحریکوں سے دونوں فرقوں میں دوری اور کشیدگی پیدا ہونے لگی جس نے بالآخر فرقہ وارانہ فسادات کی صورت اختیار کی اور کئی مقامات پر خونیں ہنگامے بھی ہوئے۔

اسی دوران کئی ہندو تحریکوں نے تشدد پسندانہ سرگرمیوں کا آغاز بھی کیا اور ہندو سرمایہ داروں کی مالی اعانت سے ایسے مراکز قائم کئے جہاں کارکنوں کو بدامنی پھیلانے کی عملی تربیت دی جاتی تھی۔ ان تنظیموں نے بعض یورپی ممالک میں تخریب کاری اور بارود سازی کی تربیت کے لئے بھی کافی افراد بھجوائے تاکہ حصول مقصد کے لئے اگر کشت وخون کا راستہ اختیار کرنا پڑے تو ان کے کارکن مطلوبہ صلاحیتوں سے مسلح ہوں۔ اسی نوعیت کی ایک دہشت پسند تحریک کے بارے میں جو کلکتہ میں قائم کی گئی تھی مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں۔

''ان دنوں انقلابی تحریکوں کے ارکان صرف ہندوؤں میں سے لئے جاتے تھے۔ درحقیقت تمام انقلابی گروہ مسلمانوں کے شدید مخالف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت مسلمانوں کو ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے خلاف استعمال کر رہی ہے۔ مشرقی بنگال ایک علیحدہ صوبہ بن چکا تھا۔ انقلابی کارکن سمجھتے تھے کہ مسلمان ہندوستان کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور دوسری تمام رکاوٹوں کی طرح انہیں بھی راستے سے ہٹانا ہوگا۔ (انڈیا ونز فریڈم)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریسی قائدین کو ان انتہا پسند تحریکوں کا بخوبی علم تھا۔ وہ ان کی خفیہ سرگرمیوں' دہشت پسندانہ عزائم اور مسلم دشمن پالیسی سے پوری طرح آگاہ تھے لیکن انہوں نے کبھی ان کارروائیوں پر تنقید کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ صرف ان سے چشم پوشی کی بلکہ بالواسطہ حوصلہ افزائی کی۔

1905ء میں مشرقی اور مغربی صوبوں کے قیام کے باوجود تقسیم بنگال کو ختم کرنے کی تحریک جاری رہی اور حکومت پر اس کا دباؤ بڑھتا رہا۔

مسٹر بی فلر کو مشرقی صوبے کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ اس نے عہدہ سنبھالتے ہی صوبے کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے تگ ودو شروع کی لیکن اسے ہر مرحلہ پر کافی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ ہندوؤں کی پوری قوت اور دولت اس کے ہر اقدام کو ناکام بنانے کے لئے وقف تھی۔ مختلف محکموں میں ہندو اہلکار کافی تعداد میں موجود تھے۔ انہوں نے دفتری کاروبار میں نہایت عیاری سے رکاوٹیں پیدا کیں۔ تعلیمی اداروں میں جہاں ہندو اساتذہ کی بھرمار تھی طلباء کو احتجاجی مظاہروں اور دہشت گردی پر اکسایا گیا۔ مظاہرین نے سرکاری اور نجی املاک پر حملے کئے اور انہیں شدید نقصان پہنچایا۔ طلباء کے گروہوں میں دہشت گرد بھی شامل ہو گئے۔ انہوں نے ہنگاموں کے دوران لوٹ مار اور آتش زنی کے علاوہ ایک انگریز افسر کو بھی قتل کر دیا۔ مرکزی حکومت کو ان حادثات سے گہری تشویش ہوئی اس لئے کہ یہ آگ ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی پھیل سکتی تھی۔ چنانچہ مسٹر فلر نے تمام واقعات کی مکمل تحقیقات کے بعد کلکتہ یونیورسٹی کی انتظامیہ کو حکم دیا کہ ان تمام تعلیمی اداروں کا یونیورسٹی سے الحاق ختم کر دیا جائے جہاں احتجاجی ہنگامے ہوئے تھے۔ لیکن حکومت ہند نے سیاسی مصلحتوں کی بنیاد پر مسٹر فلر کے اس فیصلے سے اختلاف کیا اور اسے اپنا فیصلہ واپس لینے کا مشورہ دیا۔ ایک صوبائی گورنر کے لئے جو صوبے کے نظم ونسق کا ذمہ دار تھا اس قسم کی مداخلت قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ اس نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ موجودہ صورت حال میں اس نوعیت کا اقدام ناگزیر تھا اور اگر حکومت کو اس فیصلے سے اتفاق نہیں تو پھر وہ مستعفی ہونا چاہیں گے۔ وائسرائے نے گورنر کا استعفیٰ منظور کر لیا اور مسٹر فلر اگست 1906ء کو گورنر کے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ مسلمان مسٹر فلر کے مستعفی ہونے پر بے حد ناخوش تھے۔ انہوں نے احتجاجی مظاہرے کئے وائسرائے کو اپنی ناراضگی سے مطلع کیا لیکن کہیں شنوائی نہ ہوئی۔ وائسرائے کی سرد مہری سے مسلمان سخت مایوس ہوئے اس لئے کہ مسٹر فلر پوری تندہی سے صوبے کو ترقی دینے اور عوام کی حالت کو بہتر بنانے میں مصروف تھے البتہ وہ عناصر جو تقسیم بنگال کے مخالف تھے حکومت کے اس فیصلے سے مطمئن نظر آتے تھے۔

اس واقعہ کو اگر وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو محسوس ہوگا کہ اس کی بنیادی وجہ برطانیہ میں حکومت کی تبدیلی تھی۔ اسی زمانے میں قدامت پسند پارٹی کی جگہ لبرل پارٹی کی حکومت نے لی تھی اور یہ پارٹی ہندوستان میں

برطانوی انداز کی جمہوریت رائج کرنا چاہتی تھی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں اور عوام کی تائید وحمایت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ تقسیم بنگال کے بارے میں بھی لبرل پارٹی سابقہ حکومت کے فیصلے کے حق میں نہیں تھی۔ چنانچہ لبرل پارٹی کی حکومت میں نئے وزیر ہند مسٹر مورلے نے بنگال میں ہونے والے ہنگاموں پر رائے زنی کرتے ہوئے وائسرائے کو اپنے ایک مکتوب میں لکھا کہ ''تقسیم بنگال کا تصور ہی نامعقول تھا۔ اب صورت حال کو بہتر بنانے اور قابو میں رکھنے کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ میرے خیال میں یہی مناسب ہوگا کہ احتجاج کرنے والے عناصر کو شکایات کا مزید مواقع فراہم نہ کیا جائے''۔

اگرچہ برطانیہ کی نئی حکومت اصولاً اس منصوبے کے خلاف تھی پھر بھی اس نے چند برس تک اس پر عملدرآمد کیا تاکہ حکومت کے فیصلوں کا بھرم برقرار رہے اور ہندوستانی عوام میں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ انگریز اس درجہ کمزور ہیں کہ وہ مظاہروں اور احتجاجی جلسوں کے دباؤ میں آ کر اپنے فیصلے بدل ڈالتے ہیں۔ لیکن تقریباً چھ سال تک تقسیم بنگال کو قائم رکھنے کے بعد حکومت برطانیہ نے بالآخر اپنا فیصلہ تبدیل کر دیا۔

12 دسمبر 1911ء کو جارج پنجم فرمانروائے برطانیہ نے دہلی دربار کے موقع پر تقسیم بنگال کے منصوبے کو عملاً منسوخ کرتے ہوئے کلکتہ' ڈھاکہ' چاٹگام' راجشاہی اور بردوان کے ڈویژنوں پر مشتمل ایک نئے صوبے کے قیام کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی بہار' چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ کو یکجا کر کے علیحدہ صوبہ بنایا گیا جبکہ آسام کو پہلے کی طرح چیف کمشنری کا درجہ دیا گیا۔

اس اعلان سے تقسیم بنگال کے مخالفین بہت خوش ہوئے اور اسے اپنی فتح قرار دیا۔ ایک ہندو مؤرخ نے اس موقع پر اس منصوبے کے بارے میں ہندوؤں کے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''ہندوستانیوں (ہندوؤں) کے لئے یہ صورت حال ایک قوم کی تقسیم کے مترادف تھی۔ یہ ایک ہم رنگ قوم کو تقسیم کرنے کی کوشش اور بنگالیوں کی روایات تاریخ اور زبان پر ناپاک حملہ تھا۔ تقسیم نے بنگال کے ہندوؤں کو دو ٹکڑے کر دیا تھا اور مشرقی بنگال میں غیر بنگالی (مسلمان) عددی اعتبار سے ان پر غالب آ گئے تھے''۔

اس فیصلے پر مسلمانوں کے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مشرقی بنگال کے سرکردہ مسلمان رہنما نواب سلیم اللہ نے کہا:

''تقسیم بنگال کی تنسیخ دراصل غداری اور فتنہ وفساد کے مرتکب عناصر کے لئے ایک انعام ہے اور اس اقدام سے عوام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ احکامات کی خلاف ورزی اور غیر ذمہ دارانہ سرگرمیوں سے حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور حکومت کے فیصلوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا''۔

اگرچہ تقسیم بنگال صرف چھ سال اور دو ماہ تک قائم رہ سکی لیکن اس ردوبدل سے مسلمانوں کو کچھ فائدے بھی حاصل ہوئے جو دوررس نتائج کے حامل تھے۔

1- ان چھ سالوں کے دوران مسلمانوں کو سرکاری محکموں میں خاطر خواہ ملازمتیں حاصل ہوئیں اور دوسرے شعبوں میں بھی ترقی کرنے کے مواقع ملے۔

2- مسلمان ایک عرصہ سے جس مایوسی ومحرومی میں گرفتار تھے اس سے انہوں نے کافی حد تک نجات پائی اور ان میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

3- سیاسی میدان میں مسلمان اپنے حریف اور حلیف کو پہچاننے لگے اور ہندوؤں کے عزائم سے باخبر ہو گئے۔

4- مسلمانوں کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے تقسیم بنگال کی مخالفت کے باعث کانگریس اپنے اصلی روپ میں سامنے آ گئی۔

5- مسلمانوں میں اپنے علیحدہ قومی تشخص کی جلا اور اس کے تحفظ کا جذبہ بیدار ہوا۔

6- اور سب سے اہم یہ کہ انہیں مستقبل میں بحیثیت قوم اپنی بقا کی جدوجہد کے لئے واضح حکمت عملی کا تعین کرنے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا۔

غرضیکہ ان واقعات سے برصغیر کے مسلمانوں میں بالعموم اور بنگالی مسلمانوں میں بالخصوص سیاسی بیداری' خود انحصاری اور اپنے حقوق کے لئے عملی اقدامات کا احساس پیدا ہوا۔ وہ اغیار کے ہتھکنڈوں اور پُرفریب وعدوں کی حقیقت سے آشنا ہوئے اور مستقبل میں ہندوؤں اور انگریزوں کی عیارانہ اور مکارانہ گرفت میں آنے سے کافی حد تک محفوظ ہو گئے۔

شملہ وفد اور جداگانہ انتخابات

سب سے اہم مسئلہ جو اب تک عارضی طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا' وہ مسلمانوں کے قومی تشخص کا مسئلہ تھا۔ جنگ آزادی سے پہلے اس تشخص کو مٹانے کی بھرپور کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ 1837ء میں فارسی زبان کو سرکاری اور دفتری حیثیت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ عیسائی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں زور پکڑنے لگیں۔ وہ مسلمانوں کے مذہب' طریقۂ تعلیم' تاریخ' تہذیب' ثقافت' ادب' غرضیکہ ہر چیز حتیٰ کہ لباس' رہن سہن' خوراک اور نشست و برخاست کا بھی کھلم کھلا مذاق اڑاتے تھے۔ پادریوں کو حکومت کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ رہی سہی کسر 1857ء کی جنگ آزادی نے پوری کر دی اور انگریز حکومت نے مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے کا تہیہ کر لیا۔

ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوؤں میں مذہبی وسماجی تحریکیں جاری ہوئیں۔ ان تمام تحریکوں میں قدر مشترک مسلم دشمنی تھی۔ ان سب کا ایک ہی نعرہ اور منشور تھا: ''ہندوستان ہندوستانیوں کے لئے ہے''۔ گویا اب مسلمانوں کے خلاف ایک نیا خطرہ اُبھر رہا تھا۔ یہ نظریاتی خطرہ تھا۔ یہ خطرہ اُن تصورات ونظریات سے پیدا ہوا تھا جو مغربی تعلیم کے ذریعے نوجوان نسل کے ذہن میں زہر گھول رہا تھا۔ یہ تصورات قومیت اور جمہوریت کے مغربی تصورات تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ تصورات یورپ میں مقبول ہوئے اور محکوم ملکوں میں بھی پھیلنے پھولنے لگے۔ انہی تصورات نے نیشنل کانگریس کی تحریک کو جنم دیا۔ اس کے جلسے اور جلوسوں کی رونق کو بڑھایا۔ کانگریس کی پوری کارروائی انگریزی زبان میں ہوتی تھی۔ اس کے ابتدائی دور میں اس کے کرتا دھرتا بال گنگا دھر تلک' سریندر ناتھ بینرجی اور پنڈت مدن موہن مالویہ جیسے ہندو لیڈر تھے۔ ان کے نزدیک انڈین نیشنلزم کا مطلب صرف ہندو نیشنلزم تھا۔

ان لیڈروں نے مطالبات کی ایک فہرست تیار کی جو ہر سال کانگریس کی طرف سے حکومت کو پیش کی جاتی تھی۔ ان تمام مطالبات میں ''نمائندہ حکومت'' (Representative) کا مطالبہ مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ جیسا طرز حکومت قائم کیا جائے اور حکومت کے تمام اختیارات ایک منتخب پارلیمنٹ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ کانگریس کے ان تھنک مقرر اس بات پر بار بار زور دیتے تھے کہ انگریز جو اپنے ملک میں آزادی کی نعمت سے مالا مال ہیں' وہ ہندوستان کے لوگوں کو آزادی کی نعمت سے محروم رکھ رہے ہیں۔ بظاہر اس سیدھی سادی منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سے بہت سے انگریز بھی متاثر ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس منطق کی تہ میں مسلم دشمنی کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ نمائندہ حکومت کا صاف مطلب تھا کہ حکومت بلا روک ٹوک

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

یٰاَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡآ اِلَی اللّٰہِ تَوۡبَۃً نَّصُوۡحاً

اے ایمان والو توبہ کرو اللہ کی جناب میں سچی توبہ

(التحریم آیت-8)

(ایک بندۂ خدا)

1905ء: انگریز حکومت کی ہندو پروری اور کانگریس کے پے در پے اقدامات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو اس ملک پر بلاشرکت غیرے حکومت کرنا چاہتے ہیں

اکثریت کے ہاتھ میں ہو اور اقلیتی قومیں ہمیشہ کے لئے اکثریت کے رحم و کرم کی محتاج ہو جائیں۔ یہ نکتہ مسلمانوں میں سب سے پہلے سرسید احمد خان نے سمجھا۔

تاہم سرسید نے اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کیا۔ انہوں نے ''نمائندہ حکومت'' کے مطالبے کی پُر زور مخالفت کی اور مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا۔ کانگریس کے وجود میں آنے سے پہلے بھی انہوں نے 1883ء میں وائسرائے کی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ ''مغربی جمہوریت نہ اس ملک کے مزاج کے مطابق ہے اور نہ ہماری روایات سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے اکثریت کو تو بلاشبہ فائدہ ہوگا۔ لیکن وہ آبادی کے تمام طبقوں کی جائز خواہشات اور امنگوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اگر انتخاب کا مغربی طریقہ یہاں رائج کرنا مقصود ہو تو اس میں پسماندہ طبقوں کے لئے موزوں تحفظات کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب تبدیلیاں کی جائیں، ورنہ یہ طبقے تیزی کے ساتھ زوال و پستی کے غار میں گر جائیں گے''۔

بلدیاتی انتخابات میں مسلمانوں کی ناکامی

لارڈ رپن ہندوستان کا ایک نیک نام وائسرائے تھا۔ وہ لبرل خیالات رکھتا تھا اور مغربی جمہوری اداروں کا دل دادہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے شہروں میں میونسپل کمیٹیاں قائم کر کے جمہوری اداروں کی بنیاد رکھی۔ کمیٹیوں کے بہت سے ممبر انتخابات کے ذریعے چنے جانے لگے۔ اس زمانے کے انتخابات آج کل کے سے انتخابات نہ تھے۔ اب تو ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا حق حاصل ہوتا ہے لیکن اُس زمانے میں یہ حق صرف اُن کو ملتا تھا جو صاحب جائیداد ہوں یا ایک مقررہ حد تک تعلیم یافتہ ہوں۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن حلقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی، وہاں بھی مسلمان رائے دہندگان اقلیت میں ہوتے۔ یہ صورت حال اکا دکا حلقوں تک محدود نہ تھی، بلکہ کم و بیش ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ انتخابات کے نتائج یوں نکلتے کہ مسلمان اپنی اکثریت کے حلقوں میں بھی ناکام رہتے۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ عام طور پر ہندو ووٹر ہندو نمائندوں ہی کو ووٹ دیتے اور کبھی کسی مسلمان امیدوار کو ووٹ نہ دیتے تھے۔ اگر کبھی کبھار حالات سے مجبور ہو کر وہ کسی مسلمان امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالتے تو ان کی نظر کرم صرف ایسے امیدواروں پر پڑتی جو اپنی قوم کی نظروں میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے، بلکہ منتخب ہونے کے بعد ہندوؤں کے مفاد کی حفاظت کرتے تھے۔ اس طرح مغربی جمہوری اداروں کے قیام سے مسلمانوں کے مفاد کو ایک کاری ضرب لگی اور وہ عملی طور پر حق نمائندگی سے محروم ہو گئے۔ سید امیر علی نے اپنے مضامین میں مسلمانوں کی اس محرومی کا جائزہ لیا اور سرسید نے اپنی پبلک تقریروں اور مضامین میں آنے والے خطرے کی واضح طور پر نشاندہی کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر حالات کا رخ یہی رہا تو مسلمان مکمل طور پر ملک کی حکومت سے بے دخل ہو جائیں گے اور بالآخر ہندو اکثریت کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ جب 1892ء کے ایک قانون کی رو سے کونسلوں میں توسیع ہوئی اور ان میں منتخب نمائندوں کے لئے مزید گنجائش نکالی گئی تو یہ خطرہ اور بھی کھل کر سامنے آ گیا۔ انتخابات کا مجوزہ طریقہ مسلمانوں کے قومی تشخص کو ختم کرنے کا سب سے آسان راستہ تھا۔

ہندو اکثریت کو مطمئن کرنے کی کوشش

کانگریس کے پلیٹ فارم سے تیز و تند تقریریں کرنے والوں سے تو حکومت دبتی تھی، لیکن مسلمانوں کی ضروریات کو ناقابل التفات قرار دیتی تھی اور اُن کی ہر بات سنی ان سنی کر دیتی تھی۔ حکومت کی یہ ہندو پروری کی روش اِس مسلک کی ایک روشن مثال تھی۔ بعد کے پے در پے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو اپنی اکثریت، تعلیم، ثروت و دولت اور اقتصادی برتری کی بنیاد پر اس ملک پر بلا شرکت غیرے حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور بدیشی حکومت کے کل پرزے بھی اُن پر مائل بہ کرم ہیں۔ اپنے مستقبل کی تیاریاں کرتے کرتے ''جمہوریت'' اور ''نمائندہ حکومت'' کے تذکرے ہر وقت سرکردہ ہندوؤں کی زبان پر ہوتے تھے۔ مسلمان اس سارے منظر کو بے چینی اور اضطراب سے دیکھ رہے تھے اور تذبذب کے عالم میں تھے۔ تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی شورش نے ان کو ایک اور جھٹکا دیا۔ پہلے پہل تو حکومت نے ہندوؤں کی ناراضگی کو

KHALID TRADERS

NATIONAL DISTRIBUTOR NTN BEARINGS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

PLEASE CONTACT

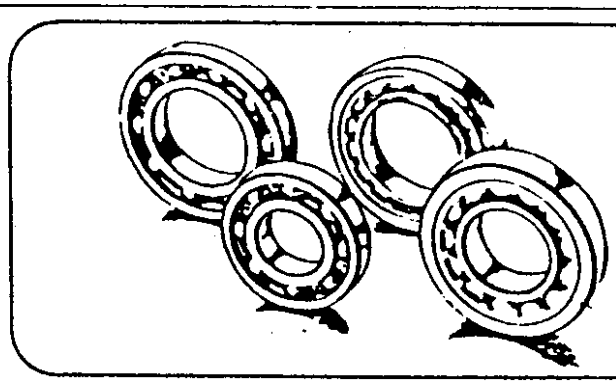

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan
G.P.O. Box # 1178 **Phones** : 7732952 - 7730595 **Fax** : 7734776 - 7735883
E-mail : kintn@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : **SIND BEARING AGENCY**, 64 A-65 Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones 7639618,7639718,7639818, Fax: (42) : 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

اتنی اہمیت نہ دی' لیکن جب حالات خراب ہوئے تو انگلستان کی لبرل حکومت کے وزیر ہند لارڈ مارلے نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ہندوؤں کے نمائندہ حکومت والے مطالبے کو کسی حد تک تسلیم کر کے اُن کے احتجاج کا زور توڑا جائے۔ مارلے نے اپنے اعلان میں بتایا کہ کونسلوں کے ارکان کی تعداد بڑھائی جائے گی اور ان میں منتخب نمائندوں کو زیادہ جگہ دی جائے گی۔ کونسلوں کے اختیارات وسیع کر کے اُن کے ارکان کو حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کا حق بھی دیا جائے گا۔ اس سے اکثریت کا دبدبہ اور بھی بڑھے گا اور اقلیت کی کمزور آواز اور بھی دب جائے گی۔

شملہ وفد 1906ء

وزیر ہند لارڈ مارلے کے خیالات سے مسلمان لیڈروں کو بہت پریشانی ہوئی۔ ان نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اُن میں باہمی گفت وشنید ہوئی۔ ابتدا علی گڑھ تحریک کے قائدین کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے دوسرے صوبوں کے سرکردہ مسلمان رہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور قرار پایا کہ مسلمانوں کے خدشات سے حکومت کے سربراہ یعنی وائسرائے لارڈ منٹو کو آگاہ کیا جائے۔ اس ضمن میں محسن الملک نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچ بولڈ کو (جو تعطیلات کے دن حکومت کے گرمائی صدر مقام شملہ میں گزار رہا تھا) ایک خط لکھا کہ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ سمتھ کے پاس جا کر دریافت کرے کہ اگر وائسرائے مسلمانوں کی جائز شکایات سننے کے لئے آمادہ ہو تو مسلمانوں کا ایک وفد ملاقات کے لئے ترتیب دیا جائے۔ ڈنلپ سمتھ سے تفصیلات طے کرنے کے بعد آرچ بولڈ نے محسن الملک کو اثبات میں جو خط لکھا' اس کا اصل تو موجود نہیں' لیکن اس کا اردو ترجمہ نفیس احمد بنگلوری کی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں مل جاتا ہے۔ اس خط میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تحریر کا انداز زمانے کے قاعدے کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جن پر الزام تراشیوں کا ایک طومار باندھ دیا گیا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ آرچ بولڈ نے اس بات کی پیشکش کی کہ وائسرائے کے روبرو پیش کیا جانے والا ایڈریس مجھ سے لکھوایا جائے' کیونکہ میں سپاس نامے لکھنے کے فن میں طاق ہوں۔ اس کے علاوہ پرنسپل نے محسن الملک (سیکرٹری علی گڑھ کالج) کو یہ سبق پڑھانے کی کوشش بھی کی کہ وفد انتخابی اصول پر زور نہ دے' بلکہ یہ مطالبہ کرے کہ بننے والی کونسلوں میں مسلمانوں کی کمی کو حکومت اپنی پسند اور مرضی کے مطابق پورا کرے۔ سپاس نامے کا مسودہ عماد الملک حسین بلگرامی نے تیار کیا۔ لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں اس کی منظوری دی گئی۔

وفد کے مطالبات اور وائسرائے کا جواب

وفد کے 35 ارکان نے' جو مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے تھے' آغا خان کی سرکردگی میں یکم اکتوبر 1906ء کو شملہ میں وائسرائے منٹو سے ملاقات کی۔ سپاس نامہ کسی قدر طویل تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر وہی باتیں کہی گئی تھیں جو سرسید کے وقت سے مسلم حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھیں' یعنی مغربی جمہوریت کو ہندوستان جیسے ملک میں مناسب تبدیلیوں کے بغیر رائج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ کونسلوں کو موثر نمائندگی ملے اور مسلمانوں کے نمائندے صرف مسلمان ووٹروں کی رائے سے چنے جائیں۔ وائسرائے نے اس ایڈریس کا حوصلہ افزا جواب دیا' جس سے مسلم حلقوں میں یہ امید بندھ گئی کہ شاید اُن کی بات مان لی گئی ہے' لیکن یہ خوش فہمی کسی قدر قبل از وقت تھی۔

مخالفوں کی کوشش

جب وائسرائے منٹو نے حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کا یہ مطالبہ قبول کرنے کی سفارش کی تو ایک غیر متوقع صورت حال پیدا ہو گئی۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک درجن کے قریب حکومتی پارٹی کے ایسے ارکان تھے جو ہندوستان میں ملازمت کر چکے تھے۔ یہاں کے حالات پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ ہندو لیڈروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور بعض حالتوں میں ان کے تنخواہ دار ایجنٹ بھی تھے۔ ان ہندو نواز ارکان نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کی سرتوڑ مخالفت کی اور بار بار اس مسئلے کو چھیڑ کر اپنی حکومت کو پریشان کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ کامیاب ہو جاتے ہیں' لیکن ہندوستان کے اندر مسلمانوں نے اس رویے کے خلاف پُرجوش احتجاج کیا۔

جداگانہ انتخابات کی منظوری

انگلستان میں سید امیر علی نے اپنی بے نظیر فراست اور اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے مخالفوں کے دلائل کو بے اثر کر دیا۔ چنانچہ برطانوی حکومت کو وائسرائے کے وعدے کی پاسداری کرنی پڑی۔ یہ بات یاد رکھنا از حد ضروری ہے کہ مسلمانوں نے نہایت استقلال کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور یہ مہم تین سال کی جدوجہد کے بعد سر کی۔ بعد ازاں 1909ء میں جو اصلاحات رائج کی گئیں' اُن میں جداگانہ انتخابات کا اصول شامل کر لیا گیا۔ مسلمان اور ہندو ووٹروں کے نام علیحدہ علیحدہ رجسٹروں میں درج کئے جانے لگے اور دونوں قوموں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے بنائے گئے۔ یہ طریقہ انتخاب برطانوی دورِ حکومت کے آخر تک جاری رہا۔

جداگانہ انتخابات اور ہندوؤں کا رویہ

جداگانہ انتخابات کا حصول مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا جو حصولِ پاکستان کا ذریعہ بنا۔ اگر مخلوط انتخابات کا طریقہ جاری رہتا تو مسلمان علیحدہ طور پر اپنے آپ کو منظم نہ کر سکتے اور جلد یا بدیر اکثریت میں جذب ہو کر اپنا قومی تشخص کھو بیٹھتے۔ جداگانہ انتخابات کے اجرا سے ہندو بہت برہم ہوئے اور اُن کے لیڈروں نے بہ یک زبان اس کی شدید مخالفت کی۔ صرف گوکھلے نے اپنی قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر تم اس ملک میں اقلیت میں ہوتے تو تم بھی اپنی حفاظت کا انتظام اسی طرح کرتے' لیکن نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ ہندو لیڈر یہ بات کہتے نہ تھکتے تھے کہ حکومت نے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور جداگانہ انتخابات کے بل پر مسلمانوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ سارا شور اور ہنگامہ حکومت برطانیہ کو دھمکانے کے لئے تھا' ورنہ مسلمانوں کو 1909ء کے آئین کے تحت جو نفع پہنچا' وہ صرف اتنا تھا کہ سارے ہندوستان کی ساری کونسلوں کی کل 214 نشستوں میں جداگانہ بنیاد پر مسلمانوں کو صرف 16 نشستیں دی گئی تھیں۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہندو اتنا بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کونسلوں کی رکنیت کا 13 فی صد حصہ بھی مسلمانوں کو ملے۔

❁❁❁

قائد اعظم کا فرمان

پاکستان کی سرزمین میں زبردست خزانے چھپے ہوئے ہیں مگر اس ملک کو ایک مسلمان کے رہنے کے قابل بنانے کے لئے اپنی قوت اور محنت کے زبردست ذخیرے کا ایک ایک ذرہ صرف کرنا پڑے گا۔

(خطبہ الوداع۔ 17 اگست 1947ء)

حصہ سوم

قیام مسلم لیگ سے خطبہ الٰہ آباد تک

1906ء — 1930ء

مسلم لیگ کی بنیاد دسمبر 1906ء میں ڈھاکا میں رکھی گئی۔ اس سال ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے سالانہ اجلاس کا انعقاد اسی شہر میں قرار پایا تھا۔ مندوبین کو پہلے سے اطلاع دی جا چکی تھی کہ کانفرنس کے اختتام پر ایک دن کے لئے سیاسی معاملات پر صلاح و مشورہ ہوگا۔ 30 دسمبر کا دن اس مقصد کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اُس دن تمام صوبوں کے سرکردہ اور نمائندہ مسلمانوں کا ایک اجلاس کانفرنس کے پنڈال میں ہوا۔ رسمی کارروائی کے لئے کم وقت رکھا گیا تھا' کیونکہ بہت سے نمائندے اُسی دن دوپہر کو سپیشل گاڑی کے ذریعے کلکتہ واپس جا رہے تھے۔ لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے دوران مسلمانوں کی اپنی ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کے موضوع پر مندوبین کے درمیان بات چیت ہوتی رہی تھی۔ مقررہ وقت سے کچھ عرصہ بعد پٹنہ کے مسٹر مظہر الحق نے وقار الملک کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا اور ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے نوجوان' سیاست کے میدان میں کودنے کے لئے بے تاب ہیں۔ ان کے گرم خون اور پُر جوش جذبوں کی رہنمائی کا فریضہ وقار الملک کا تدبر اور توازن ہی انجام دے سکتا ہے۔

مسلمانوں کے خدشات

رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد وقار الملک نے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کیا اور مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: ''مسلمانوں کی آبادی اس ملک کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ جب کبھی حکومت برطانیہ یہاں سے رخصت ہوگی تو اقتدار اعلیٰ اس قوم کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جو تعداد میں ہم سے چار گنا زیادہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت صورتِ حال کیا ہوگی؟ ہماری زندگیاں' ہماری املاک' ہمارا ناموس اور ہمارا مذہب سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔ موجودہ وقت میں جب کہ برطانوی حکومت جیسی قومی حکومت ہمارے درمیان موجود ہے' تو ہم اپنے اقتدار کے بھوکے ہمسایوں کے ہاتھوں ہر صوبے' ہر ضلعے اور ہر شہر میں پریشان ہیں۔ جب یہ دور ختم ہو جائے گا تو ہم ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہوں گے جو مسلمانوں سے اورنگ زیب عالمگیر اور اس سے پہلے کے مسلمان بادشاہوں کے حقیقی یا فرضی مظالم کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں اپنی قوت کو ایک مرکز پر لانا ہوگا۔ ہمیں کانگریس سے کوئی عداوت نہیں۔ ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ اخلاق' ہمدردی اور انصاف سے پیش آئیں گے۔ کانگریس نے چند ایسے کام کئے ہیں جن کا فائدہ ہم کو بھی پہنچا ہے۔ اعتدال ہماری طبیعت کا خاصا ہے اور یہی ہماری جماعت کا امتیازی نشان ہوگا''۔

نواب سلیم اللہ خان کے خیالات

جب وقار الملک اپنی تقریر ختم کر چکے تو نواب سلیم اللہ خان نے سیاسی جماعت کی تاسیس کی قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا: ''اگر ہم اپنی روایتی پالیسی پر کاربند رہتے اور تعلیم کی اشاعت ہی سے ہمارے سب قومی مقاصد پورے ہو جاتے تو آج ہم کو کوئی سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ قدم صرف مجبوری کی حالت میں اٹھایا جا رہا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ برطانیہ کا صاحب اقتدار طبقہ ہندوستان کے حقیقی حالات سے بے خبر ہے۔ ان کی نظروں میں خاموشی سے کام کرنے والے بے لوث کارکنوں کی کوئی قدر نہیں۔ اقلیت کے مفاد کو ایک طاقتور اکثریت مسلسل نظر انداز کرتی چلی جا رہی ہے۔ حالات و واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہماری شکایات بالکل جائز ہیں۔ ہمارے بزرگ لیڈر سرسید احمد خان نے 1887ء میں قوم کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا تھا۔ یہ مشورہ قطعی طور پر صائب تھا۔ انہوں نے 1893ء میں ''ڈیفنس ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی۔ 1901ء میں بھی لکھنؤ میں اس غرض سے مسلمان عمائد کا ایک اجتماع ہوا تھا۔ آج کل مشرقی بنگال جس بحران سے گزر رہا ہے' اُس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک فیصلہ کن قدم اٹھا کر اپنے آپ کو منظم کریں۔ اس وقت ہمارے سامنے چار راستے ہیں:

اول' ہم پہلے کی طرح سیاست سے بے تعلق رہیں۔

دوم' سیاست کے میدان میں داخل ہو کر براہِ راست ہندوؤں کی مخالفت شروع کر دیں۔

سوم' خود ہی کانگریس کے حاشیہ بردار بن جائیں۔

چہارم' اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنائیں۔

کانگریس میں شامل ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ 1887ء سے لے کر اب تک ہم اسی موقف پر قائم ہیں۔ صرف ہندوؤں کی مخالفت کرنے کے لئے علیحدہ جماعت بنانا بھی خارج از بحث ہے۔ ہمارے بدترین دشمن بھی ہم پر کسی قسم کی مخالفت کا الزام نہیں دھر سکتے۔ سیاست سے لاتعلق رہ کر بھی دیکھ لیا۔ ہماری خاموشی نے ہمیں کمزور بنا کر ہمیں بہت سی صبر آزما مشکلوں میں ڈال دیا ہے۔ ہم اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ شر پسندی اور شورش سے دور رہیں گے۔ سیاست کے میدان میں داخل ہو کر سلامت روی اور اعتدال پسندی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ ہم متحد ہوں گے۔ ہماری جماعت ایک نمائندہ جماعت ہوگی جو مسلمانوں کے احساسات کو حکومت تک پہنچائے گی۔

حکیم اجمل خان نے قرارداد کی تائید کی۔ دوسری تائیدی تقریریں مولانا ظفر علی خان' صاحبزادہ آفتاب احمد خان' شیخ عبداللہ اور مسٹر محمد علی کی طرف سے ہوئیں۔ جماعت کا نام ''مسلم لیگ'' رکھا گیا۔ اس کی رکنیت 400 تک محدود کی گئی۔ محسن الملک اور وقار الملک اس کے جائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے (بعد میں آغا خان اس کے صدر مقرر ہوئے)۔ مسلم لیگ کا آئین بنانے کے لئے ایک مختصر کمیٹی نامزد کی گئی۔ چوتھی اور آخری قرارداد میں ''تقسیم

بنگال'' کی حمایت کی گئی۔ اس کو مسلمانوں کے حق میں مفید بتایا گیا اور اس کے خلاف برپا ہونے والی ہندوؤں کی طوفانی شورش کی حوصلہ شکنی کا مطالبہ کیا گیا۔

سیاسی حالات کا تجزیہ

اگر مسلم لیگ کے تاسیسی اجلاس (30 دسمبر 1906ء) کی کارروائی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مسلم لیگ کے بانیوں کے خیالات اور اُس وقت کے سیاسی حالات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

(1) مسلم لیگ کے بانی زیادہ تر وہی لوگ تھے جو ماضی قریب میں سرسید کی تعلیمی تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ اُن کے نزدیک سیاست ایک بدمزا چیز تھی۔ وہ اپنی خوشی سے سیاست کے میدان میں نہیں آئے' بلکہ حالات کے مجبور کن دھارے نے اُن کو سیاست کی طرف دھکیل دیا تھا۔

(2) مسلمانوں کی طرف انگریز حکمرانوں اور ہندو ہمسایوں کا رویہ یکساں طور پر معاندانہ تھا۔ انگریزوں کے دل سے 1857ء کے ہنگامے کے خونی نقوش ابھی تک محو نہیں ہوئے تھے۔ وہ بدستور مسلمانوں سے کھچے کھچے رہتے تھے۔ سرسید نے مسلمانوں کو حکمرانوں کے قریب لانے کے لئے جو کوششیں کیں' اُن کی کامیابی جزوی تھی۔ شروع ہی سے ہندوؤں کے تجارتی و اقتصادی مفاد انگریزوں سے وابستہ تھے۔ انہوں نے ہر موقع پر انگریزوں اور مسلمانوں کی باہمی چپقلش میں اضافہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب حکومت کسی اہم یا غیر اہم عہدے پر کسی مسلمان کے تقرر کا فیصلہ کرتی تو ہندو اخبار فوری طور پر منتخب ہونے والے مسلمان کی اہلیت کا مقابلہ اُس کے ہندو حریفوں سے کرتے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ انتخاب جلدی میں کیا گیا ہے اور تمام امیدواروں کی صلاحیتوں کا مناسب جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس طرح کی نکتہ چینی کے خوف سے حکومت مسلمانوں کو اُن کے جائز حقوق دینے میں بھی پس و پیش کرتی تھی۔ دوسری طرف کانگریس کے پلیٹ فارم پر جو ہندو لیڈر حکومت کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے' اُن کو حکومت کے ایوانوں میں باریابی حاصل ہوتی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کے فہم سے بالاتر تھی کہ ہماری قوم تو حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے سے ہمیشہ پرہیز کرتی ہے' لیکن حکومت اپنے مخالفوں کی دل جوئی اور عزت افزائی کرتی ہے۔ اس لئے جدید تعلیم پائے ہوئے مسلمانوں کا ایک طبقہ کانگرس کی رہنمائی اور کارگزاری سے متاثر تھا اور اس بات کے لئے مضطرب تھا کہ کانگریس کے پلیٹ فارم سے اپنی شکایتوں کا اظہار کرے۔ مسلم زعما کو نوجوانوں کے رویے سے خاصی تشویش تھی اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے کانگریس جیسا ایک پلیٹ فارم ہونا چاہئے' جو نوجوانوں کے قومی جوش کو قومی مفاد کی خاطر استعمال کر سکے۔

(3) ہندوستان میں متعین انگریزی حکومت کے کارکن مسلمانوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرتے تھے' لیکن انگلستان کے عمائد یہاں کے حقیقی حالات سے بالکل بے خبر تھا۔ اُن کو نہ تو ہندو مسلم اختلافات کا علم تھا اور نہ ہی وہ اپنے ہم وطنوں کی مسلم دشمنی سے آگاہ تھے۔ ہندوستان کے معاملات پر برطانوی پارلیمنٹ کی نگرانی برائے نام تھی۔ پارلیمنٹ کے ارکان مسلمانوں کے حالات اور اُن کی ضروریات سے ناواقف تھے۔ البتہ دارالعوام (ہاؤس آف کامنز) میں ایک درجن کے قریب ایسے ممبر تھے جو کانگریس کے لیڈروں کے ساتھ قریبی رابطہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کی معرفت ہندوؤں کا نقطۂ نظر پارلیمنٹ کے سامنے پیش ہوتا رہتا تھا۔ یہ صورت حال کئی سال سے چلی آ رہی تھی۔ بعض انگریز کانگریس سے باقاعدہ رقم لے کر انگلستان کے بااثر حلقوں میں ہندوؤں کے حق میں پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ مسلمان ان وسائل سے بالکل محروم تھے' پارلیمنٹ کے روبرو ان کا کیس پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس مشکل کا شدت سے احساس تو تھا' لیکن اس سلسلے میں قوم نے کوئی ٹھوس قدم نہ اٹھایا تھا۔ توقع یہی تھی کہ ایک سیاسی جماعت کے قیام سے یہ مشکل کسی حد تک رفع ہو جائے گی۔

(4) تقسیم بنگال سے پہلے بھی ہندوؤں کا قومی شعور بہت حد تک بیدار ہو چکا تھا۔ تقسیم بنگال کی منسوخی کے بعد جو شورش ہوئی' اُس میں بارود بھرنے کے لئے ہندو لیڈروں نے مذہب کا سہارا لیا۔ دہشت گردی کی تحریکوں کو مقبول عام بنانے کے لئے اُن میں بہت سی خالص ہندووانہ رسمیں شامل کر لی گئیں۔ کلکتے کے بااثر اخبارات اپنے پڑھنے والوں کو دن رات اس بات کا یقین دلاتے رہتے تھے کہ یہ تقسیم صرف بنگالی ہندوؤں کو اُن کی سیاسی بیداری کی سزا دینے اور مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے' اس لئے وہ ایک سانس میں مسلمانوں اور انگریزوں دونوں پر برستے تھے اور دونوں کو گولیوں کی بوچھاڑ کا نشانہ بناتے تھے۔ ایک ہندو دیوی نے اُن مسلمان سپاہیوں کے خلاف' جنہوں نے ایک فرقہ وارانہ فساد میں زیادتی کرنے والے فریق سے نمٹنا چاہا تھا' ایک اخبار کو یہ خط لکھا کہ جب تک ان خطاکاروں کو زندہ آگ میں نہیں جلا دیا جاتا' ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ ایسی باتوں سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں بگاڑ پڑا' یہاں تک کہ اس مسموم فضا میں بعض سکولوں میں ہندو طلبہ نے اپنے ہم جماعت مسلمان طلبہ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھنے سے انکار کر دیا' اس لئے سکولوں کی انتظامیہ کو ہندو اور مسلمان طلبہ کی تعلیم کا بندوبست علیحدہ علیحدہ کمروں میں کرنا پڑا۔ مسلمانوں کے خلاف مخالفت کا لاوا ہر دم پھوٹتا اور اُس کی تندی اور شدت میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وقار الملک کی صدارتی تقریر' جس کا اقتباس اوپر دیا جا چکا ہے اسی ذہنیت کی نشاندہی کرتی ہے۔

مسلم لیگ کے ابتدائی سال

پہلے پانچ برسوں میں تو مسلم لیگ اپنے بیان کردہ مقاصد کے مطابق اپنے پروگرام پر کاربند رہی' لیکن اپنی تمام تر اعتدال پسندی اور رواداری کے باوجود مسلم لیگ کے لئے بنگال کی شورش کے بارے میں منہ بند رکھنا مشکل تھا۔ 1908ء میں امرتسر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے منتخب صدر سید امیر علی کی غیر حاضری میں سید علی امام نے جو خطبہ صدارت پڑھا' اس میں کانگریس کی سیاست اور اس کے عزائم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے' ہمیں حکومت خود اختیاری صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے باہمی اختلافات اس حد تک رفع ہو جائیں کہ اُن کے دلوں میں متحدہ قومیت کا جذبہ بیدار ہو جائے' لیکن موجودہ حالات میں یہ امر محال نظر آتا ہے' جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ملک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبے یعنی بنگال کے اندر ایک دل آزار اور تعصب سے بھرے ہوئے ''بندے ماترم'' کے نعرے کو قومی نعرہ بنایا جاتا ہے اور راکھی بندھن کی فرقہ وارانہ رسم کو قومی رسم کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو میرا دل مایوسی کے جذبات سے بھر جاتا ہے اور میرا یہ شبہ کہ خالص ہندووانہ تصورات کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے لبادے میں پیش کیا جا رہا ہے' یقین میں بدل جاتا ہے.....

میں کلکتہ اور پونا میں بسنے والے قوم پرستوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ مسلمانوں سے یہ توقع کیونکر لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر بندے ماترم کا گیت گائیں یا سیواجی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریروں میں شرکت کیں۔ جس جمہوریت کا راگ الاپا جا رہا ہے' وہ مسلمانوں کے لئے صرف آقاؤں کی تبدیلی کا پیغام ہے۔

سر امام علی نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ مسلمانوں کو تو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے ہر پہلو میں اپنے اعمال اور افعال کے لئے مذہبی احکام کا جواز تلاش کرتے ہیں' لیکن اس بات کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا سارے کا سارا نیشنلزم مذہبی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اسی اجلاس میں ایک طویل تقریر میں مسٹر محمد علی نے' جو ابھی مولانا نہیں کہلاتے تھے' حکومت برطانیہ کی اُن خفیہ بلکہ سازشی کارروائیوں کو بے نقاب کیا جن سے وائسرائے منٹو کے وعدے کے باوجود وہ نہایت چابکدستی سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کے حق سے محروم کرنا چاہتی تھی۔

1911ء کے بعد لیگ کے رویے میں تبدیلی

1911ء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا۔ دسمبر میں ہندوؤں کی زبردست احتجاجی تحریک کے نتیجے میں ''تقسیم بنگال'' منسوخ ہوئی۔ اس کی منسوخی دراصل نازیبا احتجاج اور دہشت زدگی کی فتح تھی۔ ہندوؤں کو حکومت برطانیہ کے اس اقدام سے بے پایاں خوشی ہوئی۔ انہوں نے شہروں بلکہ دیہات میں بھی چراغاں کیا۔ کھلے میدانوں میں ہزاروں من ایندھن جلایا اور روشنی کر کے فتح کا جشن منایا۔ اس سے مسلمانوں کو بھی اپنی حیثیت کا اندازہ ہو گیا۔ وقار الملک نے لکھا کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان ایک توپ خانے کی مانند تھا جو ہماری زندہ لاشوں کے اوپر سے گزر گیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس اعلان کو حکومت کی بدترین بدعہدی اور غداری سے تعبیر کیا۔ ملک کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کا ردِعمل اس سے مختلف نہ تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مسلسل اور واضح احتجاج کے باوجود مچھلی بازار' کان پور کی مسجد کا ایک حصہ گرائے جانے اور نہتے مسلمان مظاہرین پر فائرنگ سے مسلمانوں کی طرف انگریز حکام کی فرعونیت عیاں ہو گئی۔ مسلم یونیورسٹی کے مطالبے پر حکومت کے معاندانہ رویے نے قوم کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں اور اُن کے بارے میں حکومت برطانیہ کے مسلم کش رویے نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ان تمام واقعات سے قوم کا اندازِ فکر یکسر بدل گیا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلک میں بھی تبدیلی آئی۔ انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ عارضی طور پر مسلم لیگ کو کانگریس کے قریب لے گیا۔ 1911ء میں لیگ کے صدر نبی اللہ نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندوستان کے انگریز حکام پر الزام لگایا کہ وہ دو بڑی قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ حکومت کے خلاف اس قسم کا الزام لیگ کے پلیٹ فارم پر پہلے کبھی نہیں لگایا گیا تھا۔ 1912ء کے سالانہ اجلاس میں ہندو لیڈر بھی موجود تھے۔ مقصد بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں میں حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی کے جذبے کو کانگریس کا اثر رسوخ بڑھانے کے لئے استعمال کیا جائے۔

مسلم لیگ میں جناح کی شمولیت

1913ء کے موسم گرما میں مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن کان پور کی مسجد اور دوسرے قومی معاملات کے متعلق حکومت برطانیہ تک مسلمانوں کے جذبات پہنچانے کے لئے انگلستان گئے۔ محمد علی جناح بھی (جو ابھی قائداعظم نہیں بنے تھے) وہیں قیام پذیر تھے۔ مولانا محمد علی اور وزیر حسن دونوں جناح صاحب سے ملے اور انہیں لیگ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند کے آئندہ قائد اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مولانا محمد علی جس مقصد کے لئے انگلستان گئے تھے' وہ تو پورا نہ ہوا' لیکن اُن کے اپنے الفاظ میں ''میرے سفر کا ٹھوس نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میں جناح کو لیگ میں لے آیا ہوں۔ اس واقعے کی جو لفظی تصویر کشی مسز سروجنی نائیڈو نے کی ہے' وہ شاعرانہ مبالغے کی عمدہ مثال ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ جناح نے وزیر حسن اور محمد علی دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں لیگ کی رکنیت تو قبول کرتا ہوں' لیکن اس شرط پر کہ اگر کہیں کسی مرحلے پر لیگ اور کانگریس میں تضاد یا تصادم ہوا تو میری وفاداری کا مرکز کانگریس ہوگی' لیگ نہیں۔ جناح صاحب کے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی مشترکہ رکنیت اختیار کرنے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت کی جو کوششیں 1912ء میں شروع ہوئی تھیں' اُن کا نتیجہ 1916ء میں ''میثاق لکھنؤ'' کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس معاہدے سے مسلمانوں کو کچھ خسارہ تو ضرور ہوا' لیکن اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت اور جداگانہ حق انتخاب کو قبول کر لیا۔ بدلی ہوئی فضا میں کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس 1915ء سے لے کر 1921ء تک ساتھ ساتھ ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔

مسلم انڈیا کی سیاست میں بحران

(1911ء-1913ء)

1911ء سے 1913ء تک کے دو برسوں میں مسلمانانِ ہند کی سیاست میں دور رس بلکہ انقلابی تبدیلیاں آئیں۔ ہر چند کہ مسلم لیگ 1906ء میں قائم ہو چکی تھی اور اس کے سالانہ اجلاس بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے' پھر بھی اس کے لیڈر سرسید کے مکتبۂ فکر کے محتاط ارکان تھے۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو حکومت کی بدگمانی سے بچاتے تھے' اس لئے لیگ کی قراردادوں اور اس کے پلیٹ فارم پر ہونے والی تقریروں میں احتیاط کا پہلو غالب ہوتا تھا۔ البتہ تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی شورش کی بھرپور مذمت کی جاتی تھی اور جداگانہ انتخابات کے متعلق حکومت برطانیہ کے منفی رویے پر حرف گیری ہوتی تھی۔ باقی ماندہ معاملات پر بحث و تمحیص کے دوران نیازمندی کا رنگ جھلکتا تھا۔

بحران کے اسباب

1911ء کے بعد پے در پے پیش آنے والے واقعات نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ بدل دیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا اہم واقعہ تقسیم بنگال کی تنسیخ تھی۔ یہ تقسیم 1905ء میں عمل میں آئی تھی۔ اُس وقت حکومت کا کہنا یہ تھا کہ یہ اقدام مشرقی بنگال کے علاقوں کی کسمپرسی دور کرنے اور ان کی انتظامی حالت کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ کئی سال پہلے ایک دو موقعوں پر سید امیر علی کی قائم کردہ ''نیشنل سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن'' نے تقسیم بنگال کے حق میں ایک آدھ قرارداد پاس کی تھی' لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے اس مطالبے کے پیش کرنے یا اس کے منظور کروانے میں کوئی سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ تقسیم کے ابتدائی ایام میں چند مسلمانوں نے ہندوؤں کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ لیکن جلد ہی مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ تقسیم سے گزشتہ بے انصافیوں کا تدارک ہوگا۔ علاقے کے حالات بہتر ہوں گے اور امن عامہ کی فرضی ابتری کی اصلاح ہوگی' اس لئے مسلمان بہ یک زبان تقسیم کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ نئے صوبے میں کسی حد تک چند اصلاحی اقدامات کئے گئے۔ لیکن روزمرہ کی بدامنی' سودیشی تحریک کی گرما گرمی اور دہشت زدگی کے دھماکوں نے حکومت کو مفلوج کر کے رکھ دیا اور عملاً تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو متوقع فائدہ نہ پہنچا۔

تقسیم بنگال کی تنسیخ

کہنے کو تو وزیر ہند لارڈ مارلے نے تقسیم ہند کو ایک ''طے شدہ'' حقیقت قرار دیا تھا اور انگریز افسروں نے لوگوں کو بار بار یقین دلایا تھا کہ تقسیم کی تنسیخ خارج از بحث ہے' لیکن تقسیم کے مخالفوں کی زیر زمین سازشیں' سرگرمیاں اور احتجاجی تحریک کامیاب رہیں اور حکومت برطانیہ نے خفیہ خفیہ تقسیم کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کا اعلان ڈرامائی طور پر برطانیہ کے بادشاہ کی زبان سے 1911ء کے ''دربار دہلی'' کے موقع پر کروایا۔ یہ شاہی اعلان ہندوؤں کی زبردست فتح تھی۔ قدرتی طور پر مسلمانوں کو اس سے سخت مایوسی ہوئی' بلکہ ان پر یہ اعلان بجلی بن کر گرا' کیونکہ تقسیم کو برقرار رکھنے کی متواتر یقین دہانیوں کے باوجود حکومت برطانیہ اپنے وعدوں سے مکر گئی تھی۔ وقار الملک' محمد علی اور نواب سلیم اللہ نے شاہی اعلان پر بہت سخت انداز میں نکتہ چینی کی۔ اب مسلمانوں کے پاس اس بات کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے انگریزوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں اور صرف اپنی قوت بازو پر بھروسا کریں۔

مچھلی بازار کانپور کی مسجد

مسلمانوں کے اس عزم میں پختگی پیدا کرنے والا دوسرا واقعہ کان پور میں مچھلی بازار والی مسجد کے متعلق تھا۔ یہ مسجد ایک سڑک کے کنارے پر واقع تھی۔ کانپور شہر کی میونسپلٹی اس سڑک کو چوڑا اور سیدھا کرنا چاہتی تھی۔ راستے میں مسجد حائل تھی۔ چنانچہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسجد کے ایک حصے کو گرا کر حاصل ہونے والی زمین کو سڑک کی توسیع کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس فیصلے سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلی۔ چنانچہ بہت سے مقامی اور غیر مقامی مسلمانوں نے حکومت کے متعلقہ افسروں کو لاتعداد یادداشتیں اس مضمون کی ارسال کیں کہ میونسپل کمیٹی اپنے فیصلے کو واپس لے۔ صوبے کے گورنر میسن سے مولانا محمد علی جوہر کی پرانی رسم وراہ تھی۔ انہوں نے اس معاملے کو اپنے اخبار میں تو جگہ نہ دی' لیکن اپنے طور پر گورنر پر برابر دباؤ ڈالتے رہے کہ حکومت مسلمانوں کے صبر کا امتحان نہ لے اور اپنے فیصلے کو بدل کر حالات کو بگڑنے سے روکے' لیکن نہ تو لاٹ صاحب پر اس استدعا کا کچھ اثر ہوا اور نہ ہی حکومت کے کسی افسر نے اس بات کا نوٹس لیا۔

چنانچہ 13 جولائی 1913ء کو حکومت کے کارندوں نے چند ہزار احتجاج کرنے والے مسلمانوں کی موجودگی میں مسجد کے ایک حصے کو گرا دیا۔ 2 اگست کو مسلمانوں نے پھر اسی جگہ مظاہرہ کیا۔ یہ لوگ صرف احتجاج کرنے کی غرض سے یہاں جمع ہوئے تھے۔ لڑنا یا مرنا مارنا اُن کا مقصد نہ تھا۔ ایک مجسٹریٹ نائر کی نگرانی میں پولیس نے نہتے مظاہرین پر گولی چلائی۔ بہت سے مسلمان موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ اس المیے سے بھی حکومت کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ بلکہ انہوں نے خون مسلم کی ارزانی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا۔ مسلمانوں پر سرکاری منطق کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس واقعے کے تاثرات کو بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے طور پر قلم بند کیا' شبلی نعمانی نے جو نظم لکھی' اس کا عنوان تھا: ''ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں''۔ یہ قطعہ مسلمانوں کے زخم خوردہ دل کی فریاد تھی۔ برطانیہ کے اخبار روز بروز مسلمانوں کے دینی جوش کو غلط رنگ میں پیش کر کے اُن کے زخموں پر نمک پاشی کرتے تھے۔ معاملہ یہیں پر بس نہیں ہوا بلکہ پولیس مظاہرین کو بلوائی قرار دے کر عدالتوں میں لے گئی۔ اس سے مسلمانوں کی برہمی بڑھی اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگ گئی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ملزموں کی صفائی کے لئے درجنوں وکیلوں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ حالات کا یہ رُخ دیکھ کر گورنر صاحب چار مہینے کی چھٹی لے کر انگلستان چلے گئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد وائسرائے ہارڈنگ نے محسوس کیا کہ اس معاملے کو رفت و گزشت قرار دینے سے بگاڑ بڑھے گا۔ چنانچہ اس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنی انتظامیہ کونسل کے مسلم رکن سر علی امام کو اپنے ہمراہ لے کر وہ خود کان پور گیا۔ سرکردہ مسلمانوں کے وفد سے گفت وشنید کے بعد اس نے مسجد کے گرائے ہوئے حصے کو بنوانے کا متبادل انتظام کیا۔ ہارڈنگ نے اپنی جیب سے مسجد کے تعمیر ہونے والے حصے کے لئے چندہ دیا۔ برطانیہ کے اخباروں نے اس پر سخت تند وتیز اداریے لکھے' جن میں وائسرائے کی اس ''فیاضی'' کی مذمت اس لئے کی گئی کہ اس نے باغیوں اور شورش پسندوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس سے معاملہ وقتی طور پر تو ختم ہو گیا لیکن مسلمانوں کا زخم مدتوں مندمل نہ ہو سکا۔

الحاقی مسلم یونیورسٹی سے انکار

کان پور کی مسجد کا قضیہ ابھی اختتام کو نہ پہنچا تھا کہ مسلمانوں پر حکومت کا ایک اور عذاب نازل ہوا۔ علی گڑھ کالج 1875ء میں قائم کیا گیا تھا۔ 1877ء میں وائسرائے لارڈ لٹن کے ہاتھوں اس کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اُس وقت کالج کے بانی سرسید نے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ اُن کا تعلیمی منصوبہ اُس دن تکمیل کو پہنچے گا' جب اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ مل جائے گا۔ سرسید سرکاری کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کارکردگی سے سخت بددل تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ درس گاہیں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں' کیونکہ ان میں نہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے' نہ ہی عربی کی تدریس کا معقول انتظام ہوتا ہے۔ یہاں مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض پورا کرنے کی بھی آزادی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں ان اداروں پر ہندو اساتذہ چھائے ہوئے ہیں اور ان کو مسلمان طلبہ سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ ان سب باتوں کے علاوہ ان درس گاہوں کا معیار تعلیم بھی پست ہوتا ہے' کیونکہ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں کبھی کوئی نامور فلسفی یا سائنسدان پیدا نہیں ہوا۔ اُن کے اپنے الفاظ یہ تھے کہ سرکاری یونیورسٹیاں صرف ''فیکٹریاں'' بناتی ہیں۔

سرسید دل و جان سے چاہتے تھے کہ علی گڑھ کالج پھل پھول کر ایک معیاری یونیورسٹی بنے اور مسلمانوں کی پرانی علمی روایات کو تازہ کرے۔ ان کی زندگی میں کالج میں علمی اور دینی فضا تو قائم ہوئی لیکن سرسید کا بنیادی مقصد یعنی کالج کو یونیورسٹی بنانے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ اُن کی زندگی کے آخری برسوں میں کچھ ایسے حوصلہ شکن حالات پیدا ہو گئے تھے کہ وہ اس طرف کوئی توجہ ہی نہ دے سکے۔ 1903ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دہلی میں منعقد ہونے والے اجلاس کی صدارت آغا خان نے کی اور مسلمانوں کی توجہ یونیورسٹی کے قیام کی طرف دلائی۔ اس وقت سے یہ مسئلہ گفتگو کا موضوع تو بن گیا' لیکن عملی طور پر پیش رفت ہونے میں زیادہ عرصہ لگا۔ 1911ء میں اس تجویز کا پھر جائزہ لیا گیا۔ اور اس سلسلے میں عملی اقدامات شروع ہوئے۔ حکومت سے سلسلۂ جنبانی کی گئی تو جواب ملا کہ کالج کو یونیورسٹی بنوانے کے لئے مسلمان پہلے تو تیس لاکھ روپیہ یونیورسٹی فنڈ میں جمع کریں۔ پھر اس تجویز پر غور ہوگا۔ اس زمانے میں تیس لاکھ روپیہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ حکومت کے مشیروں کا یہ خیال تھا کہ نہ اتنا روپیہ جمع ہوگا اور نہ ہی اس تجویز پر غور کرنے کی ضرورت پڑے گی' لیکن قوم اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم تھی' اس لئے روپیہ جمع کرنے کی تگ و دو فوری طور پر شروع ہو گئی۔ سرمایے کی فراہمی کے لئے چھوٹی چھوٹی پارٹیاں ملک کے کونے کونے میں پھیل گئیں' لیکن اس تگ و دو میں آغا خان اور مولانا شوکت علی نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ انہوں نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ ہندوستان کے کونے

1911ء: اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا' جسے آج کل لیبیا کہتے ہیں۔ یہ عثمانی سلطنت میں شمالی افریقہ کا ایک صوبہ تھا اور یہاں کے باشندے تجارت پیشہ تھے

کونے سے مسلمانوں نے یونیورسٹی کے لئے چندہ فراہم کیا' جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ 31اکتوبر 1911ء تک جمع شدہ رقم میں سے جو چندے وصول ہوئے تھے' ان کی تفصیل یہ ہے:

صوبہ سرحد اور بلوچستان (24ہزار 863روپے گیارہ آنے چھ پائی)

بنگال (20ہزار 308روپے)

صوبہ بہار (42ہزار 543روپے)

بھوپال (ایک لاکھ روپے)

بہرحال مطلوبہ رقم بہت جلد پوری ہوگئی۔ یہ بات حکومت کی توقع کے خلاف تھی۔ حکومت نے جب سنجیدگی سے اس معاملے پر غور شروع کیا تو مسلمانوں کے دو بنیادی مطالبات کو فوراً رد کر دیا۔ پہلا مطالبہ تو یہ تھا کہ مجوزہ ادارے کا نام مسلم یونیورسٹی ہو۔ حکومت کو لفظ ''مسلم'' سے عناد تھا۔ اس کی جوابی تجویز یہ تھی کہ اسے صرف ''علی گڑھ یونیورسٹی'' کہا جائے گا۔ ''مسلم'' کا لاحقہ غیر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان یہ بھی چاہتے تھے کہ تمام ملک کے مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام مسلم یونیورسٹی کے سپرد کر دیا جائے اور اس بات کی مجاز ہو کہ تمام اسلامیہ سکولوں اور کالجوں کا اپنے ساتھ الحاق کر سکے۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو ہندوستان کے مسلمان تعلیم کے معاملے میں خودمختار ہو جائیں۔ یہ بات بھی حکومت کے مقاصد کے خلاف تھی۔ جواب ملا کہ اگر مسلمان کالج کو یونیورسٹی بنانے پر تلے ہوئے ہیں تو اس کی حیثیت صرف مقامی ہوگی اور اسے الحاق کے اختیارات نہیں دیئے جاسکتے۔ حکومت کی شرائط کا اعلان ہونا تھا کہ اسلامی ہند میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مولانا محمد علی نے شروع سے آخر تک اپنے اخبار میں یونیورسٹی کے مطالبے کی پُرزور حمایت کی تھی اور حکومت کی منطق کا ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ حکومت کی ضد کے آگے سب بے بس تھے (پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے پر معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور بالآخر 1920ء میں مسلم یونیورسٹی کو اقامتی اور مقامی یونیورسٹی کا چارٹر ملا)۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ اور کانپور کی مسجد کے سانحے سے مسلمان پہلے ہی بگڑے بیٹھے تھے۔ تازہ ترین حملے سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ حکومت مسلمانوں کی کوئی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔

مسلمانانِ عالم کے مصائب

ابھی مسلمان اندرونِ ہند انگریزوں کے ہاتھوں صدموں پر صدمے برداشت کر رہے تھے کہ بیرون ملک چند تکلیف دہ واقعات پے بہ پے رونما ہوئے' جن سے مزید رنج والم پیدا ہوا۔ مسلمانانِ ہند ہمیشہ اُمت مسلمہ کے رنج وغم میں شریک اور اُن کی تکالیف دور کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اُس وقت ترکوں کی عثمانی سلطنت' اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ جنوب مشرقی یورپ میں بلقان کی ریاستیں اور دنیائے عرب کے بہت سے حصے اس کے زیرنگیں تھے۔ سلطان ترکی مسلمانانِ ہند کے لئے خلیفۃ المسلمین بھی تھا۔ یہاں کے مسلمانوں کو ترکوں سے اور ان کے سلطان سے بہت عقیدت تھی۔ وہ ترکوں کے لئے ہر وقت سینہ سپر رہتے تھے۔ لیکن یورپی ممالک مدت سے ترکی کو یورپ کا ''مردِ بیمار'' قرار دے چکے تھے اور ترکوں کی وسیع سلطنت کے حصے بخرے کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اُن کی سازشوں کی بدولت انیسویں صدی میں فرانسیسیوں اور انگریزوں نے شمالی افریقہ کے وسیع حصوں پر اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا۔

جنگ طرابلس (1911ء)

اس بانٹ میں برطانیہ اپنا حصہ وصول کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کی حریصانہ نظریں طرابلس پر تھیں جو عثمانی سلطنت میں شمالی افریقہ کا ایک صوبہ تھا۔ اسے آج کل لیبیا کہتے ہیں۔ اس کی آبادی عربوں پر مشتمل ہے۔ اٹلی کے بہت سے تجارت پیشہ باشندے یہاں مستقل یا نیم مستقل بنیادوں پر آباد تھے۔ اُن کی مدد سے سازش تیار ہوئی۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ حکومت کے کارکن اطالوی باشندوں پر بہت سی پابندیاں لگاتے اور ان سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ اطالوی حکومت نے اس بدسلوکی کو اپنی برداشت سے باہر قرار دیتے ہوئے ترکی حکومت کو الٹی میٹم دے دیا' لیکن جواب آنے سے پہلے ہی اپنی پچاس ہزار اطالوی فوج طرابلس میں داخل کر دی۔ اس فوج نے درندگی کے بدترین مظاہرے کئے۔ گھروں میں گھس کر خواتین کی بے حرمتی کی۔ بوڑھوں اور بچوں تک کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ محب وطن عربوں کو سنگینوں سے اذیت دے دے کر ہلاک کر دیا۔ بہت سے مخالفوں کو بیک وقت موت کے گھاٹ اتارنا ہوتا تو ان کو یک لخت گولیوں کی بوچھاڑ کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تھا' بلکہ ایک ایک کر کے بندوق کی گولی سے مار دیا جاتا۔ برطانوی اخباروں کے نمائندوں نے یہاں آ کر اُن تمام نظاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے اخباروں کو بے لاگ رپورٹیں بھیجیں۔ برطانوی حکومت اٹلی کی حمایت پر تھی۔ جب برطانوی پارلیمنٹ کے بعض ارکان نے صدائے احتجاج بلند کی تو اُن کی آواز کو دبا دیا گیا۔ کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ٹریولین' جو اٹلی اور اٹلی والوں کے بہت مداح تھے' اس بات پر بہت تلملائے کہ انگلستان جیسے دوست ملک میں اٹلی کو خواہ مخواہ بدنام کیا جا رہا ہے۔ بہرحال حقائق خود اپنے منہ سے بول رہے تھے۔ سید امیر علی' جو انگلستان میں ایک بہت بڑے عدالتی عہدے پر فائز تھے' اخباروں کو اس قسم کے مراسلے لکھے کہ اٹلی کی عیسائی حکومت' طرابلس کے مسلمانوں کے ساتھ جس قسم کا وحشیانہ سلوک کر رہی ہے' اگر اس کا دسواں حصہ بھی کوئی مسلمان حکومت عیسائیوں کے ساتھ روا رکھتی تو یورپ والے قیامت کا شور مچاتے اور ایک صلیبی جنگ کا منظر برپا کر دیتے۔ ایک سال کے بعد طرابلس کی جنگ ختم ہوئی۔ اس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ بربریت اور تشدد کی فتح ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمان خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ علامہ اقبال نے عرب لڑکی ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کی تحسین میں ایک نظم لکھی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی تھی:

فاطمہ! تو آبروئے اُمتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

اقبال بڑے دُکھ اور اضطراب کے ساتھ اُمت کی فریاد لے کر رسول کریم ﷺ کے حضور پیش ہوئے اور دردمندی سے ایک نظم تخلیق کی ''حضور رسالت مآب ﷺ میں''۔ اس نظم کا آخری بند ملاحظہ کیجئے:

''حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں' ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو' وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے' جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں''

اخباروں نے متواتر اور طویل مضامین' شذرے اور اداریے لکھے' اور جلسے منعقد کر کے قراردادیں پاس کیں۔ برطانیہ اٹلی کی پیٹھ ٹھونک رہا تھا۔ جنگ کے دوران ترکی حکومت مصر کے راستے طرابلس میں اپنی فوج کو کمک پہنچانا چاہتی تھی۔ مصر برائے نام عثمانی سلطنت کا حصہ تھا' لیکن انگریزوں کے تسلط میں تھا۔ انگلستان کا پریس بھی اپنی حکومت کا ہم نوا بن گیا۔ برطانوی حکومت اٹلی کے وقار کو اپنا وقار سمجھتی تھی' اور دنیائے اسلام کے متعلق اُس کا رویہ سخت سے سخت تر ہوتا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ معاندانہ فضا پیدا ہو چکی

تھی اور یوں حکومت برطانیہ اور مسلمانوں کے درمیانی فاصلے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

طرابلس پر حملے سے تمام ہندوستان میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی' اور کلکتہ' ڈھاکا' مدراس' پونا' الہ آباد' لاہور' کراچی' گورکھ پور اور دوسرے شہروں میں اٹلی کے خلاف جلسے منعقد ہوئے۔ کلکتہ کے مسلمانوں نے اس سلسلے میں پہل کرتے ہوئے 12 اکتوبر 1911ء کو ترکوں کی امداد کی غرض سے ''انڈین ریڈ کریسنٹ سوسائٹی'' قائم کی۔ 7 اکتوبر 1911ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس لکھنو میں منعقد ہوا' جس میں طرابلس پر اٹلی کے حملے کی مذمت اور اطالوی مال کا بائیکاٹ کرنے سے متعلق تین قراردادیں منظور کی گئیں' جن سے مسلمانانِ ہند کی ترکی کے ساتھ گہری جذباتی وابستگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس حملے سے پیدا شدہ اضطراب کو خود گورنر جنرل ہارڈنگ نے بھی محسوس کیا۔ اس نے وزیر ہند کو لکھا کہ ''صوبہ سرحد سے خبر ملی ہے کہ وہاں گاؤں گاؤں اور قبائل میں صرف طرابلس پر اٹلی کا حملہ ہی موضوعِ سخن بنا ہوا ہے اور یہ خبر عام ہے کہ ہم نے اٹلی کے ساتھ ساز باز کر رکھی ہے۔

جنگ بلقان (1911ء)

ابھی طرابلس کی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ بلقانی ریاستوں کے ایک گروپ نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یہ ریاستیں گزشتہ تین سو سال سے سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھیں۔ ان سب کو اندرونی خود مختاری حاصل تھی۔ ان کے باشندوں کی غالب اکثریت عیسائیت کی پیرو تھی۔ ترکوں نے یہاں اسلامی رواداری کی درخشاں مثالیں قائم کر رکھی تھیں۔ یورپی ممالک کو عیسائی دنیا میں مسلمانوں کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا اور اُن کو یہاں سے بے دخل کرنے کی سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس لئے بلقانی ریاستوں سے آئے دن بغاوت کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ 1911ء کی جنگ بلقان کے آغاز میں تو مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا۔ بعد میں پانسا پلٹا تو برطانوی حکمرانوں نے بغلیں بجائیں اور اپنی مسلم دشمنی اور ترک دشمنی کا کھلم کھلا اعلان کیا۔ بعضوں نے اس جنگ کو صلیبی جنگوں کے سلسلے کی ایک کڑی قرار دیا۔ اسی دوران میں ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو جنگ کا ایک فریق تصور کرتے تھے۔ نوجوانوں میں بے پناہ جوش و خروش تھا۔ علی گڑھ کالج کے طالب علموں نے اپنے کمروں کے پردے بیچ ڈالے۔ ناشتہ کرنا چھوڑ دیا۔ گوشت کا استعمال ترک کر دیا۔ ہو سکا تو فاقے کئے اور بچا ہوا روپیہ ترکوں کے امدادی فنڈ میں دیا۔ مولانا ظفر علی خان جمع شدہ سرمایے کا ایک حصہ لے کر خود ترکی گئے اور یہ رقم خود سلطان کو پیش کی۔ ترک زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کے لئے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی قیادت میں ایک طبی وفد ترکی بھیجا گیا۔ مولانا محمد علی جوہر طبی وفد کو رخصت کرنے کے لئے بمبئی تک ساتھ گئے۔ بھوپال میں مولانا کے ساتھ طبی وفد کا ایک گروپ فوٹو ہوا جو ''الہلال'' (کلکتہ) میں 18 دسمبر 1912ء کو مولانا کی اس تحریر کے ساتھ شائع ہوا:

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست
تا نہ پنداری کہ تنہا می روی

''اے وہ لوگو! جو کہ زخمیوں کے ملک میں جا رہے ہو' جب وہاں پہنچ کر زخموں کو دھونا تو خدارا ان پر سختی نہ کرنا کہ وہ زخم زخمیوں کے نہیں بلکہ اسلام کے ہیں''۔

اس موقع پر مولانا شبلی نعمانی کی نظموں نے مسلمانوں کے جذبات کو گرمانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ مولانا نے لکھنو کے ایک جلسۂ عام میں مندرجہ ذیل نظم پڑھی۔ خود بھی روئے اور حاضرین کو بھی رلایا۔ اس نظم سے امت مسلمہ کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کی تڑپ اور اضطراب کا اظہار ہوتا ہے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
مرائش جا چکا' فارس گیا' اب دیکھنا یہ ہے
کہ یہ جیتا ہے رُک رُک کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں' زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
بکھرتا جاتا ہے شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

ترکی بھائیوں کی خدمت کے بعد جب یہ طبی وفد واپس لوٹا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مولانا شبلی نعمانی جو اس موقع پر موجود تھے' جب ڈاکٹر انصاری کے پاؤں کو چھونا چاہا اور ڈاکٹر صاحب نے معذرت کی تو مولانا نے فرمایا ''یہ تمہارے پاؤں نہیں' اسلام کے مجسمۂ غربت کے پاؤں ہیں''۔

سلطنت عثمانیہ کو یورپی ممالک نے' اور ایران کو روسیوں نے تختۂ مشق بنایا۔ 30 مارچ 1912ء کو روسیوں نے مشہد پر گولہ باری کر کے امام علی رضا کے مقبرے کو نقصان پہنچایا اور ایرانی علماء کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ان تمام واقعات نے مسلمانوں کے جذبات کو سخت مجروح کیا' ''الہلال'' اور ''کامریڈ'' کے مضامین اور اداریوں اور شعلہ بیان تقریروں نے ہندوستان بھر میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ لگا دی۔ ان حالات میں مسلم رائے عامہ کی طرف سے مسلم لیگ پر دباؤ بڑھنے لگا کہ اس کے آئین میں تبدیلی کی جائے' یہاں تک کہ مسلم اخبارات نے دھمکی دی کہ اگر لیگ نے اپنے آئین میں تبدیلی نہ کی تو ایک نئی جرأت مند جماعت قائم کر دی جائے گی۔

مسلمانانِ ہند کی نئی قیادت

1911ء-1913ء کے سال مسلمانانِ ہند کی سیاست کے بحرانی سال تھے۔ پرانے رہنما ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا گوشہ نشین تھے۔ ہوا کا رخ بدلا تو قوم کی سیاست بھی بدلی۔ نئے سیاسی حالات کے تقاضوں سے نپٹنے کے لئے نئی قیادت ابھری۔ اس قیادت کے اہم ارکان محمد علی (جو ابھی مولانا نہیں بنے تھے)' مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں ارکان' ادیب اور اخبار نویس تھے۔ تینوں کو اسلام سے گہری وابستگی تھی۔ تینوں بلا کے مقرر تھے۔

محمد علی نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے آپ کو جوہر نہیں کہلوایا۔ یہ بدعت اُن کی وفات کے تیس چالیس بعد چلی۔ انہوں نے اوکسفورڈ سے تاریخ عصر جدید میں ڈگری حاصل کی تھی اور برسوں محمد علی (اوکسن) کہلاتے رہے۔ کلکتہ سے ہفت روزہ ''کامریڈ'' نکال کر انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ تقسیم بنگال منسوخ ہوئی تو وہ اپنے اخبار کو ساتھ لے کر نئے دارالحکومت میں چلے آئے۔ انہیں انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ اس لئے اُن کے اخبار انگریزوں میں بھی بہت مقبول تھا۔ ساتھ ہی انہوں نے عوام کی ذہنی تربیت کے لئے اردو اخبار ''ہمدرد'' بھی نکالا۔

مولانا ظفر علی خان نے اخبار ''زمیندار'' کے ذریعے مسلمانوں کا سیاسی شعور بیدار کیا۔ وہ بہت اعلیٰ درجہ کے مترجم اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ ''الہلال'' کلکتے سے نکلتا تھا۔ اس کے مضامین اپنی ادبیت اور دینی حرارت و جوش کی وجہ سے خاص طور پر مقبول تھے۔

علامہ اقبال بھی اُس زمانے میں اپنی شہرت کے

نصف النہار تک پہنچ چکے تھے۔ ان کی نظمیں ''ہلال عید'' ''شکوہ' جواب شکوہ'' ''فاطمہ بنت عبداللہ'' ''حضور رسالت مآبؐ'' اور دوسری نظموں میں امت مسلمہ کے مصائب و مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔

محمد علی جناح 1913ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ اگرچہ جواں سال تھے' لیکن سیاست کے پیچ و خم سے بہت واقف تھے۔ کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی ایسا اتحاد ہو جائے' جس کے ذریعے ملک کو غیر ملکی سامراج سے نجات ملے۔ ان کی تجویز پر 22 مارچ 1913ء کو مسلم لیگ کے آئین میں تبدیلی کی گئی اور حکومت سے وفاداری کی بجائے ''تاج برطانیہ کے تحت' ہندوستان کے حالات کے مطابق' آئینی طریقے سے سلف گورنمنٹ کا قیام' لیگ کا مطمح نظر قرار پایا۔

اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سلف گورنمنٹ (حکومتِ خود اختیاری) کے مطالبے کو مسلم حقوق کے تحفظ کی خاطر ''ہندوستان کے حالات کے مطابق'' سے مشروط کر دیا گیا۔

یوں 1913ء سے مسلمانانِ ہند کی سیاست نئی قیادت کی رہنمائی میں' نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔

پہلی جنگ عظیم (1914-1918ء)

پہلی جنگ عظیم

جولائی 1914ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ ترکی نے انگریزوں کے مخالف جرمنی اور اس کے ساتھیوں سے تعاون کرنے کا فیصلہ کیا۔ ترکی کے اس اقدام سے مسلمان جہاں کے لئے بالعموم اور مسلمانانِ ہند کے لئے بالخصوص نہایت دشوار صورت حال پیدا ہوئی جس سے برصغیر میں مسلم انگریز تعلقات کشیدگی کا شکار ہونے لگے۔ برطانوی حکومت کی خواہش تھی کہ جنگی کارروائیوں میں اسے برصغیر کے تمام فرقوں کی پوری تائید و حمایت حاصل ہو اور اس نازک موقع پر کسی قسم کے اختلافات رونما نہ ہوں۔ چنانچہ برطانوی وزیراعظم مسٹر اسکوتھ نے ہندوستان کے عوام کو مطمئن کرنے کے لئے اعلان کیا کہ ''ہندوستان کے مسئلے کو نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت ہے''۔ مسٹر اسکوتھ کے جانشین مسٹر لائیڈ جارج نے بھی وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد کہا کہ جنگ ختم ہوتے ہی ہندوستانی عوام کو حکومت کے نظم و نسق میں شرکت کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کئے جائیں گے۔

حکومت کے ان دلفریب بیانات سے متاثر ہو کر کئی ہندو رہنماؤں نے برطانیہ کی جنگی کارروائیوں کی پُر زور حمایت کا اعلان کیا جبکہ گاندھی جی نے تو اس حد تک کہہ دیا کہ ''اگر ہم فرانس کے جنگی میدانوں کو آزادی کے ناقابل تسخیر متوالوں کی فوج سے بھر دیتے اور اتحادیوں کی فتح و نصرت کے لئے نبرد آزما ہوں تو یہ اقدام ہمارے اپنے مقاصد کے لئے جنگ کے مترادف ہوگا اور اس طرح مستقبل قریب میں ہوم رول ملنے کے لئے یہ ایک اہم اور نتیجہ خیز قدم ہوگا''۔ حکومت برطانیہ نے گاندھی کی ان خدمات سے خوش ہو کر اسے ''قیصر ہند'' کے خطاب سے نوازا۔ البتہ مولانا ابوالکلام آزاد گاندھی کے اس رویئے سے ناخوش تھے۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے مسلسل کوشش کی کہ کانگریس جنگ کے بارے میں حقیقت پسندانہ انداز اختیار کرے۔ اس وقت گاندھی جی نے یہ موقف اپنایا کہ آزادی ہند کی اہمیت اپنی جگہ لیکن عدم تشدد پر عمل پیرا ہونا اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ درحقیقت انہوں نے کئی مواقع پر حتمی طور پر کہا تھا کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا واحد راستہ تشدد کا ہے تو وہ کبھی اسے نہیں اپنائیں گے۔ اور اب وہ کہنے لگے کہ اگر ہندوستان کی آزادی مل سکتی ہے تو کانگریس کو برطانیہ کے ساتھ (جنگ میں) تعاون کرنا چاہئے۔ یہ بات ان کے سابقہ موقف کے بالکل متضاد تھی جس سے ملک کے اندر اور باہر کافی ذہنی انتشار پیدا ہوا''۔

اس کے برعکس مسلمانوں کی حیثیت مختلف تھی۔ خلافت عثمانیہ کے فیصلے سے انہیں ایک پیچیدہ صورت حال کا سامنا تھا۔ ترکوں سے ان کی روحانی وابستگی برطانوی مفادات سے متصادم تھی۔ اس لئے مسلم زعماء کے بیانات کا لب و لہجہ بھی نسبتاً جداگانہ تھا۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' میں مسلمانوں کے احساسات کی بھرپور اور ایماندارانہ ترجمانی سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اسی زمانہ میں ''لندن ٹائمز'' نے ''چوائس آف دی ٹرکس'' (Choice of the Turks) کے عنوان سے نہایت سخت انداز میں ایک اداریہ لکھا اور ترکوں کو ماضی میں برطانیہ کے ''مربیانہ اقدامات'' کی یاد دہانی کراتے ہوئے مشورہ دیا کہ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں۔ مولانا محمد علی نے اسی عنوان سے اپنے اخبار ''کامریڈ'' میں اس اداریئے کا نہایت مدلل اور مفصل جواب لکھا جس میں ترکوں سے انگریزوں کے معاندانہ سلوک اور منافقانہ روش کی مثالیں دیں اور تاریخی شواہد سے ''لندن ٹائمز'' کے استدلال کو بے بنیاد اور بے معنی ثابت کیا۔ بایں ہمہ مولانا محمد علی نے جذباتیت سے بالاتر ہو کر حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے اپنے ہم وطنوں اور خصوصاً مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ:

''ہمیں حکومت سے جو بھی شکایتیں رہی ہیں، اصلاحات کے متعلق ہمارے مطالبات جو بھی کچھ ہوں یہ ساری باتیں مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھنی چاہئیں۔ ایسے موقع پر اگر حکومت خود بھی ہمارے سارے مطالبات اور ہماری خواہشات کی تکمیل کے لئے رضامند ہو جائے تو ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ہم حکومت کی اس پیشکش کو شکریئے کے ساتھ واپس لوٹا دیں گے۔ مراعات طلب کرتے وقت امن کا زمانہ ہوتا ہے ہم حکومت سے رشوت نہیں مانگتے''۔

''کامریڈ'' نے اپنے مضمون میں جس خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کیا برطانوی حکومت نے اس کی کوئی قدر نہ کی بلکہ نہایت لغو بنیاد پر ''کامریڈ'' کی ضمانت ضبط کر لی اور اخبار بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی کا دوسرا اخبار ''ہمدرد'' بھی اسی نوعیت کی پابندی کا شکار ہوا اور پھر کچھ ہی روز بعد مولانا محمد علی اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی گرفتار کر لئے گئے۔

نئی انقلابی تحریکیں

جنگ کے زمانے میں برصغیر کے بعض حصوں میں انگریزوں کے خلاف کچھ تحریکوں کا آغاز بھی ہوا جنہیں حکومت نے پوری سختی سے دبانے کی کوشش کی۔ چنانچہ کئی طلباء اور انقلابی کارکن ہندوستان سے فرار ہو کر دوسرے ممالک کو چلے گئے تاکہ نسبتاً آزاد ماحول میں حصولِ آزادی کے لئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔

5 مارچ 1915ء کو مختلف کالجوں کے پندرہ (15) مسلم طلباء جن میں سے بیشتر کا تعلق لاہور سے تھا، ترکی جانے کے لئے پشاور کے راستے خفیہ طور پر افغانستان پہنچ گئے۔ ان کا مقصد ترک بھائیوں کی خدمت اور اپنے وطن کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کے لئے جدوجہد کرنا تھا۔ چند ہفتوں بعد پشاور اور کوہاٹ کے کئی طلباء بھی ان سے کابل میں جا ملے اور جلد ہی نامور مسلم مفکر عبیداللہ سندھی بھی پہنچ گئے۔ کابل کے قیام کے دوران آزادی ملت کے یہ جانباز مستقبل کی منصوبہ بندی اور اپنی تحریک کو فعال رکھنے میں مصروف رہے۔ اس دوران یکم اکتوبر 1915ء کو راجہ مہندر اپرتاپ کی سرکردگی میں ایران کے راستے ''انڈین ٹرکش جرمن'' تنظیم کا وفد کابل وارد ہوا

1915ء: مولانا عبیداللہ سندھی نے عربستان میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ رکھنے کے لئے پوری روداد ایک ریشمی رومال پر تحریر کر کے بھجوائی

اور مسلم طلباء کے گروہ سے رابطہ قائم کیا تا کہ انگریزوں کو شمالی مغربی سرحد پر جنگی کارروائیوں میں الجھانے کے لئے افغان حکمرانوں کو ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ اگرچہ بظاہر اس وفد کے مجوزہ حملے کا ہدف انگریز تھے لیکن کیپٹن ظفر حسین جو مسلم گروہ کے رکن تھے، اپنی سرگزشت میں لکھتے ہیں کہ راجہ مہندر اپرتاپ کا نصب العین ہندوستان میں ایک ہندو سلطنت کا قیام تھا۔

حریت پسندوں کا ایک اور گروہ دارالعلوم دیوبند کے محمود الحسن کی قیادت میں ترکوں کی امداد کے لئے حجاز مقدس روانہ ہوا۔ عربستان میں قیام کے دوران محمود الحسن نے ترک فوجی گورنر غالب پاشا سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان حاصل کیا۔ اس اعلان میں برصغیر کے مسلمانوں کو ترک بھائیوں کی جانی و مالی امداد کی تلقین کی گئی تھی۔

ادھر عبیداللہ سندھی کابل سے برصغیر میں انقلابی تحریک کو متحرک رکھنے کے لئے بدستور سرگرم عمل تھے۔ انہوں نے عربستان میں محمود الحسن کو اپنی سرگرمیوں سے آگاہ رکھنے کے لئے پوری روداد ایک ریشمی رومال پر تحریر کر کے بھجوائی۔ یہ رومال شیخ عبدالحق نامی ایک شخص لے کر روانہ ہوا جو اسے ہندوستان میں شیخ عبدالرحیم نامی کسی شخص کے حوالے کرنا تھا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق شیخ عبدالرحیم کو یہ پیغام خود یا کسی قابل اعتماد نامہ بر کے ذریعے حجاز مقدس میں محمود الحسن کو پہنچانا تھا لیکن بدقسمتی سے منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ خط سرکاری کارندوں کے ہاتھ لگ گیا۔ حکومت نے ان خفیہ سرگرمیوں کو ''ریشمی رومال کی سازش'' کے نام سے موسوم کیا اور تحقیقات کا حکم دیا۔

میثاق لکھنؤ (1916ء)

جنگ کے دوران ہندوستان کے تمام فرقوں کا تعاون اور جنگی کارروائیوں میں ان کی عملی شرکت حاصل کرنے کے لئے حکومت برطانیہ نے وقتاً فوقتاً سیاسی اصلاحات کے بارے میں اعلانات کئے۔ 1916ء میں جب لارڈ چیمسفورڈ وائسرائے ہند مقرر ہوا تو سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آئی اور توقع پیدا ہوئی کہ حکومت عوام کے مطالبات کو مدنظر رکھتے ہوئے سیاسی اصلاحات کے لئے کوئی اقدام کرے گی۔

ان حالات میں سیاسی زعماء نے محسوس کیا کہ حکومت سے کسی قسم کی گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ تمام جماعتوں کے باہمی تعاون سے مشترکہ حکمت عملی اختیار کی جائے تا کہ برصغیر کے رہنے والوں کے حقوق و مطالبات کی مؤثر اور جامع نمائندگی کی جا سکے۔

کچھ عرصہ سے بعض سیاسی حلقے مسلسل کوشاں تھے کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو پس پشت ڈال کر اجتماعی مفاد کے لئے ہم آہنگی سے کام لیتے ہوئے غیر ملکی حکمرانوں سے معاملات طے کریں۔ حالیہ واقعات کو دیکھتے ہوئے مسلم قائدین نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ انگریزوں سے کچھ حاصل کرنے کے لئے برصغیر کی دوسری قوموں سے اشتراک عمل سودمند ثابت ہوگا۔ کانگریسی رہنما بھی جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کے مجموعی اور مکمل تعاون کی اہمیت سے آگاہ تھے اور دونوں قوموں میں سیاسی اشتراک کے خواہاں تھے۔ چنانچہ دسمبر 1915ء میں برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ایک ہی وقت میں بمبئی میں منعقد ہوئے جن میں دونوں جماعتوں کے قائدین نے جو تقاریر کیں ان کے انداز اور بنیادی تفکر میں نمایاں مماثلت اور یکسانیت تھی۔ اگرچہ انگریزوں کے ایماء پر بعض عناصر نے ان اجلاسوں کو درہم برہم کرنے اور ناکام بنانے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ عوام میں انگریزوں سے آزادی کے مشترکہ نصب

خوشخبری!

شعبہ تحقیق اسلامی (IRTS) کی اعزازی ممبرشپ!

قرآن اکیڈمی میں شعبہ تحقیق اسلامی (IRTS) کے دفاتر کے قیام اور انتظام کا ابتدائی مرحلہ بحمداللہ مکمل ہو چکا ہے۔ شعبہ میں مختلف موضوعات پر تحقیق و تصنیف کے لئے بعض ریسرچ ایسوسی ایٹس کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں ایسے تمام حضرات کو دعوت دی جاتی ہے جو تحقیق و تصنیف کے کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور کم سے کم ایم اے تک تعلیم یافتہ ہوں (ترجیحاً وہ افراد جو ایم فل یا پی ایچ ڈی کے پراجیکٹ پر کام جاری رکھے ہوئے ہوں یا کرنا چاہتے ہوں) تو وہ شعبہ ہذا میں بطور اعزازی ریسرچ ایسوسی ایٹ ممبرشپ حاصل کر سکتے ہیں۔

ممبرشپ حاصل کرنے کی صورت میں انہیں شعبہ میں مندرجہ ذیل سہولیات میسر ہوں گی:

1) صبح 8 بجے سے رات 8 بجے تک ریسرچ ڈیسک کی سہولت۔
2) کمپیوٹر و انٹرنیٹ اور پرنٹنگ کی سہولت۔
3) لائبریری میں کثیر تعداد میں پائی جانے والی کتب و جرائد تک رسائی۔
4) Bibliographies اور Indices تک رسائی۔
5) مختلف موضوعات کے ضمن میں Resource Persons سے رہنمائی کی سہولت۔
6) تحقیقی مضامین کو ریسرچ میگزینز میں شائع کروانے کی سہولت۔
7) ریسرچ سکالرشپ کے حصول میں معاونت۔

اعزازی ممبرشپ حاصل کرنے کے خواہش مند حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ایک سادہ کاغذ پر اپنے مکمل کوائف تحریر فرمائیں' اور جس موضوع پر تحقیق و تصنیف کا کام کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اس کا مختصر تعارف بھی تحریر فرمائیں۔ درخواستوں کی پڑتال کے بعد درخواست دہندگان کو انٹرویو کے لئے پیش ہونا ہوگا جس کی تاریخ اور وقت کی اطلاع بذریعہ خط ارسال کی جائے گی۔ مزید معلومات اور خط و کتابت کیلئے:

حافظ عاطف وحید' انچارج شعبہ تحقیق اسلامی'

قرآن اکیڈمی' 36/K ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 03-5869501' ای میل: irts@tanzeem.org

العین کے حصول کے لئے باہمی مفاہمت کا احساس بڑھنے لگے اور دونوں جماعتوں میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی کے امکانات روشن ہوگئے۔

1916ء میں جب مسٹر جناح دوبارہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے رکن بنے تو انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے از سرنو کوششوں کا آغاز کیا اور انہی کے مشورہ سے حکومت ہند کو دونوں قوموں کی طرف سے متفقہ طور پر ایک محضر نامہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ محضر نامے پر ملک کی انیس سرکردہ شخصیتوں نے دستخط کئے جن میں چودہ ہندو تھے اور پانچ مسلمان۔ اس محضر نامے میں کئی سیاسی اور انتظامی اصلاحات کی تجاویز شامل تھیں۔ اگرچہ اس کا کوئی فوری نتیجہ تو نہیں نکلا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں متحدہ محاذ بنانے کا جذبہ مزید استوار ہوا۔

اب اگلا قدم کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کا مشترکہ اجلاس تھا جو کلکتہ میں نومبر 1916ء کو منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں کئی اہم سیاسی امور پر فیصلے کئے گئے جن میں قانون ساز اداروں کی تشکیل اور دونوں قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندگی کے مسائل شامل تھے۔ ان فیصلوں کو ایک معاہدے کی شکل دی گئی جسے دسمبر 1916ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں میں پیش کیا گیا۔ یہ اجلاس لکھنو میں ہوئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت محمد علی جناح نے کی جو اتحاد عمل کے لئے کی جانے والی کوششوں کے روح رواں تھے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''آج پورے ملک میں عزم و عمل کی ایک نئی روح رواں دواں ہے۔ ہر طرف ایک نئی زندگی کی تحریک دکھائی دیتی ہے۔ برصغیر کے مسلمان اپنی روایات اور اپنے تشخص کا بطلان کریں گے اگر وہ اس امید نو میں شریک نہ ہوں جو اس سرزمین کے فرزندوں کے دلوں کو گرما رہی ہے۔ ہماری نظریں مستقبل پر لگی ہیں جس طرح ہمارے ہم وطن ہندوؤں کی۔

لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے معزز شرکائے اجلاس۔ یاد رکھئے اس وقت پوری قوم اور تمام ملک کی نظریں آپ پر لگی ہیں۔ اس تاریخی ہال میں اور مسلم لیگ کے اس تاریخی اجلاس میں آپ جو فیصلے کریں گے، وہ اس پوری قوت اور وزن کے ساتھ مستقبل پر اثر انداز ہوں گے جس کا دعویٰ سات کروڑ مسلمانوں کے منتخب نمائندے جائز طور پر کر سکتے ہیں۔ انہی فیصلوں پر زیادہ تر ہندوستان کے مستقبل' ہندوستان کے اتحاد' ہمارے مشترکہ نصب العینوں اور آئینی آزادی کے لئے ہماری امنگوں کا انحصار ہوگا۔

فیصلے کا وقت آ گیا ہے۔ متبادلات نہایت واضح اور بالکل صاف ہیں۔ انتخابات ہمارے ہاتھ میں ہیں''۔

کانگریس کے اجلاس میں بھی اسی مفاہمت آمیز انداز میں اظہار خیال کیا گیا۔ اور دونوں جماعتوں کے درمیان ایک یادگار معاہدہ طے پایا جسے ''میثاق لکھنؤ' کا نام دیا گیا۔

اس معاہدے کے تحت حکومت سے سیاسی اصلاحات کے سلسلے میں حسب ذیل مطالبات پیش کرنے کا فیصلہ ہوا۔

☆ بڑے صوبوں میں کونسلوں کے ممبروں کی تعداد 125 اور چھوٹے صوبوں میں 50 سے 75 تک رکھی جائے۔

☆ صوبائی کونسلوں کے کل ممبروں میں سے 4/5 ممبر عام رائے شماری کے ذریعے منتخب کئے جائیں۔

☆ مرکزی کونسل کے 150 ارکان میں سے بھی منتخب ارکان کی تعداد 4/5 ہو جنہیں صوبائی کونسلوں کے ارکان منتخب کریں۔

☆ صوبائی اور مرکزی عاملہ کے ارکان کی کم از کم نصف تعداد منتخب ممبروں پر مشتمل ہو۔

☆ ممبروں کو تحریک التوا پیش کرنے کا حق دیا جائے۔

☆ گورنر یا گورنر جنرل کونسلوں کی تحاریک کو رد کرنے کے مجاز نہ ہوں۔ انہیں صرف التوا کا اختیار حاصل ہو۔

☆ صوبائی کونسلوں کو مالیاتی اختیارات دیئے جائیں۔

☆ مرکزی کونسل کو دفاعی افواج کے امور کے علاوہ کسٹم' مواصلات' نمک' افیون اور سکہ سازی کی آمدن پر اختیار حاصل ہو۔ باقی تمام مالیاتی مراعات پر صوبائی کونسلوں کو اختیار دیا جائے۔

ان اجلاسوں میں فرقہ وارانہ مسائل بھی زیر غور آئے اور انہیں حل کرنے پر خصوصی توجہ دی گئی۔ مختلف فرقوں کی نمائندگی کے اہم سوال پر مفاہمت حاصل کرنے کے لئے متعدد تجاویز پر بحث ہوئی اور آخر کار مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریق انتخاب کے تحت دونوں فریقوں کی نمائندگی کے لئے حسب ذیل تناسب طے پایا۔

صوبہ	مسلمانوں کی تعداد
پنجاب	کل نشستوں کا 50 فی صد
صوبہ جات متحدہ	30
بنگال	40
بہار	25
وسطی صوبے	15
مدراس	15
بمبئی	ایک تہائی

اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ

☆ امپریل کونسل میں منتخب نمائندوں میں ایک تہائی مسلمان ہوں گے۔

☆ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں انہیں نشستوں کا تحفظ حاصل ہوگا۔ اسی طرح مسلم اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کی نشستیں محفوظ ہوں گی۔

☆ صوبائی یا مرکزی کونسل میں کوئی بل جو کسی فرقے کے خلاف ہو پیش نہیں کیا جا سکے گا اگر متعلقہ فرقے کے دو تہائی ارکان اس کی مخالفت کریں۔

☆ عاملہ کو عدلیہ سے علیحدہ کیا جائے۔

☆ سیکرٹری آف سٹیٹ کو بھی وہی اختیارات دیئے جائیں جو دوسری نوآبادیات کے متعلقہ سیکرٹریوں کو حاصل ہیں اور اس کی تنخواہ برطانوی خزانے سے دی جائے۔

میثاق لکھنو برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تھا۔ اس معاہدے کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب کو قبول کر لیا جس کی وہ اب تک شدید مخالف تھی اور مسلمانوں کو یہ حق پنجاب اور سی پی میں بھی حاصل ہو گیا جو انہیں منٹو مارلے اصلاحات کے تحت حاصل نہ تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو یہ تحفظ بھی ملا کہ کسی بھی صوبے میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکے گا جو ان کے مفاد کے منافی ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا جسے وہ اب تک کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔

اس سمجھوتے کے لئے مسلمانوں نے جو قربانی دی وہ ان کی فراخدلی' امن پسندی اور رواداری کی عکاس تھی۔ وہ پنجاب اور بنگال میں اپنی واضح اکثریت سے رضا کارانہ طور پر دستبردار ہو گئے اور اقلیت کے مساوی حیثیت کو قبول کر لیا۔ اس طرح انہیں ملک بھر کے کسی صوبے میں بھی اکثریت حاصل نہ رہی۔ یہ فیصلہ بے شک بہت اہم اور جرات مندانہ تھا جس کے ممکنہ دور رس نتائج سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مسلمانوں نے ملک میں افہام و تفہیم کی فضا پیدا کرنے کے لئے اس اقدام سے بھی گریز نہیں کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ وہ اور ان کی قومی جماعت مسلم لیگ ملک کی مجموعی بھلائی کے لئے ہندوؤں سے پورے خلوص کے ساتھ تعاون کرنے پر تیار ہیں۔

''میثاق لکھنؤ'' سے ملک میں ہندو مسلم تعاون کی جو امیدیں پیدا ہو چلی تھیں ان سے ماحول میں ایک خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی جس کا مظاہرہ تحریک خلافت کے دوران

دیکھنے میں آیا لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ مسلمانوں کی بہترین کوشش اور انتہائی مخلصانہ تگ و دو کے باوجود یہ مفاہمت اور تعاون دیرپا ثابت نہ ہوا اور کچھ ہی عرصہ بعد ہندو رہنماؤں کے خود غرضانہ رویئے نے اس جذبہ تعاون کو پامال کر دیا اور مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندو کبھی مسلمانوں کے ہمدرد اور رفیق کار نہیں بن سکتے۔

ہوم رول لیگ (1917ء)

جنگ عظیم کی ابتداء سے ہی حکومت کو ملک کی تمام آبادی کا تعاون حاصل رہا۔ اس نازک موقع پر کسی طرف سے بھی مشکلات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن حکومت برطانیہ نے خیر سگالی کے ان جذبات کا خاطر خواہ انداز میں جواب نہ دیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ واضح ہو گیا کہ حکومت سیاسی اصلاحات کے سلسلے میں ان وعدوں کو پورا کرنے میں مخلص نہیں جو اس نے جنگ کے شروع ہونے کے بعد کئے تھے۔ یہ صورت حال سیاسی قائدین کے لئے نہایت تشویش ناک تھی۔ چنانچہ ہوم رول لیگ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی جس کے رہنما مسز اینی بسنت اور جی بی تلک تھے۔ یہ تنظیم تشدد اور تخریب کاری کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنے پر یقین رکھتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ملک بلوؤں اور ہنگامہ آرائیوں کی گرفت میں آ گیا۔ اس سنگین صورت حال سے مجبور ہو کر برطانوی وزیر ہند مسٹر ایڈون مانٹیگو نے 20 اگست 1917ء کو پارلیمان میں سیاسی اصلاحات کا وعدہ پورا کرنے پر حکومت کی آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''حکومت برطانیہ ہندوستان کی انتظامیہ میں ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ شرکت چاہتی ہے اور خود مختار اداروں کی تدریجی ترقی کے ذریعے ہندوستان میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کی خواہاں ہے جو سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ ہوگی''۔

رولٹ ایکٹ (1919ء)

ہندوستان میں روز افزوں تخریب کاریوں اور ہنگامہ آرائیوں کی بنیادی وجوہات اور محرکات کا کھوج لگانے اور ان کی روک تھام کے لئے مناسب قانون بنانے کی غرض سے حکومت نے جسٹس ایس اے رولٹ کی نگرانی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس نے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد اپریل 1918ء میں حکومت ہند کو اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی سفارشات کو مدنظر رکھتے ہوئے ''بدامنی اور انقلابی جرائم کا قانون'' جو ''رولٹ ایکٹ'' کے نام سے مشہور ہوا، مارچ 1919ء میں منظور کیا گیا۔ یہ قانون نہایت سخت گیر اور جابرانہ تھا جس کے ذریعے شخصی آزادی، سیاسی سرگرمی اور اخبارات پر پابندیاں نافذ کر دی گئیں اور انتظامیہ کو اختیار دیا گیا کہ وہ ملک دشمنی کے الزام میں کسی کو بھی مقدمہ چلائے بغیر قید یا ملک بدر کرنے کی سزا دے سکتی تھی۔

اس ظالمانہ قانون کے نفاذ سے ملک کے طول و عرض میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ عوام کو اندیشہ تھا کہ حکومت یہ قانون اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی مخالفین کو دبانے کے لئے استعمال کرے گی۔

اگر دیکھا جائے تو انگریزوں نے کمال عیاری سے کام لیتے ہوئے یہ قانون اس وقت نافذ کیا جب وہ یورپ میں جنگ عظیم کی مشکلات سے چھٹکارا پا چکے تھے اور پوری یکسوئی کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی محاذ پر توجہ دے سکتے تھے۔

قائداعظم محمد علی جناح اس زمانے میں مرکزی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ چونکہ وہ آئینی طریق کار پر یقین رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے رولٹ ایکٹ کے نفاذ پر احتجاجاً کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ وائسرائے کو اپنا استعفیٰ کے خط میں قائداعظم نے لکھا:

سید قاسم محمود کی تصانیف

شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا

پاکستان کی سب سے قیمتی کتاب کا آٹھواں ایڈیشن۔ بڑے سائز کے دو ہزار صفحات پر محیط، ردیف وار ترتیب میں چار ہزار مضامین، چار سو سے زائد رنگین تصویریں، نقشے، شجرے، آرٹ پیپر پر چھپا ہوا رنگین ''اسلامی اٹلس''، مفصل اشاریہ، دو جلدوں میں مکمل طور پر نظر ثانی ایڈیشن۔

قیمت 2400 روپے

انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا

اس میں وہ سب کچھ ہے جو پاکستان میں ہے اور پاکستان سے متعلق ہے۔

شخصیات، مقامات، تحریک پاکستان، تاریخ، جغرافیہ، رسوم و روایات، تہذیب و ثقافت، آئین و سیاست، معیشت و معاشرت، مفصل اشاریہ۔ قیمت 2000 روپے

ہماری کائنات

کائنات کی تخلیق کب ہوئی؟ کیونکر ہوئی؟ کائنات کا نظام کیونکر چل رہا ہے؟ کائنات کا انجام کیا ہوگا؟ چار ہزار سالہ انسانی تاریخ میں کس مفکر نے کائنات کے بارے میں کیا سوچا؟ تمام قدیم و جدید نظریات کا محاکمہ قرآن مجید کی روشنی میں۔ باتصویر۔ بڑا سائز۔ قیمت 250 روپے

مسلم سائنس

ظہور اسلام سے لے کر عصر حاضر تک، جابر بن حیان سے ڈاکٹر عبدالقدیر خان تک، دنیائے اسلام کے 145 سائنس دانوں کے حالات زندگی اور کارناموں میں ایک شاہکار تصنیف جس میں پہلی بار سائنس دانوں کی تصاویر استنبول کے عجائب گھر سے بطور خاص منگوا کر شامل کی گئی ہیں۔

بڑا سائز، باتصویر، قیمت 250 روپے

اسلامی سائنس

اُس عہد زرین کے سائنسی علوم کی داستان جب پوری دنیا پر اسلام کا سورج جگمگا رہا تھا۔ ریاضی، حساب، جیومیٹری، مساحت، فلکیات، علوم نجوم، طبیعیات، کیمیا، طب، ارضیات، معدنیات، حیوانیات، جغرافیہ اور زراعت پر سیر حاصل معلومات افروز تصنیف۔ بڑا سائز، باتصویر۔ قیمت 250 روپے

الفیصل ناشران، اردو بازار، لاہور، فون نمبر: 7230777

1919ء: امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں انگریز فوج کی فائرنگ سے 319 آدمی مارے گئے اور 1200 سے زیادہ زخمی ہوئے۔ احتجاجی جلسے اور جلوس کا سلسلہ جاری ہوا

''اس قانون کی منظوری نے امپریل کونسل کی آئینی حیثیت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ یہ قانون ساز ادارہ محض برائے نام ہے جسے ایک غیر ملکی انتظامیہ چلا رہی ہے۔ جہاں نہ تو غیر سرکاری ہندوستانی ارکان کی رائے کا اور نہ ہی ایوان سے باہر عوام کی رائے اور جذبات کا ذرہ برابر احترام کیا گیا۔

......لہٰذا میں مذکورہ بل کے پاس ہونے اور جس انداز سے اسے پاس کروایا گیا ہے اس کے خلاف احتجاج کے طور پر امپریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہوں کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان حالات میں کونسل کے اندر میں اپنے عوام کے لئے سودمند نہیں ہوسکتا''۔

خط کے آخر میں قائداعظم نے نہایت بے باکانہ انداز میں کہا:

''میری رائے میں ایک ایسی حکومت جو زمانہ امن میں اس طرح کے قانون منظور کرتی یا اس کی اجازت دیتی ہے ایک مہذب حکومت کہلانے کا حق کھو دیتی ہے''۔

قائداعظم نے جس آئینی راستے کو اپنا کر کونسل سے استعفیٰ دیا اگر دوسرے ارکان بھی یہی راہ اختیار کرتے اور اجتماعی طور پر مستعفی ہو جاتے تو حکومت آئینی دباؤ سے مجبور ہو کر اس قانون کے بارے میں اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ ہو سکتی تھی لیکن دوسرے ممبروں نے مختلف طرزِ عمل اپنایا جو ہنگامہ آرائی اور تباہ کاری کا راستہ تھا۔

مسٹر گاندھی جو 1915ء میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان پہنچا تھا برصغیر کی سیاست میں کانگریس کے رہنما کی حیثیت سے پیش پیش تھا۔ اس نے رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجاً حکومت برطانیہ کا دیا ہوا خطاب ''قیصر ہند'' واپس کر دیا۔ یہ خطاب گاندھی کو جنگی خدمات کے صلے میں دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاندھی نے 24 فروری 1919ء کو احمد آباد میں 25 سیاسی رہنماؤں سے ایک حلف نامے پر دستخط کروائے کہ وہ رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں سول نافرمانی کی تحریک میں شرکت کریں گے۔

عوام کے جوش و خروش کو دیکھتے ہوئے گاندھی نے 16 اپریل کو ملک گیر ہڑتال کی اپیل کی جو کافی حد تک نتیجہ خیز رہی۔

سانحہ جلیانوالہ باغ (1919ء)

دریں اثناء عوام کی روز افزوں بے چینی اور بڑھتی احتجاجی سرگرمیوں کو پوری قوت سے دبانے کے لئے حکومت کی تمام انتظامیہ حرکت میں آ گئی اور ملک کے طول و عرض میں مظلوم اور نہتے عوام پر جبر و تشدد کے لامتناہی سلسلے کا آغاز ہوا۔

20 مارچ 1919ء کو دہلی میں ایک جلوس نکالا گیا جسے منتشر کرنے کے لئے پولیس نے بے تحاشا لاٹھی چارج کیا۔ اگلے روز پھر جلوس نکلا جس کی رہنمائی آریا سماج کا متعصب ترین لیڈر سوامی شردھانند کر رہا تھا۔ انگریز فوج نے جلوس کا راستہ روکنا چاہا لیکن جب ہجوم بے قابو ہونے لگے تو گولی چلانے کا حکم دیا گیا جس سے کئی آدمی زخمی ہوئے۔

احتجاجی جلسے اور جلوسوں کا سلسلہ پورے ملک میں پھیل چکا تھا اور سیاسی رہنماؤں کی گرفتاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ 10 اپریل کو لاہور میں کانگریس کے دو رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ستیہ پال گرفتار ہوئے تو عوام نے احتجاجی جلوس نکالا جس پر فوج نے گولیاں برسائیں۔

13 اپریل کو امرتسر میں جلیانوالہ باغ میں حکومت کے ظالمانہ اقدامات کے خلاف احتجاج کرنے کی غرض سے ہزاروں افراد جمع ہوئے۔ اس سے ایک دن بیشتر ہی امن و امان کی حالت زیادہ تشویش ناک ہونے پر شہر کا نظم و نسق عملاً جنرل ڈائر کے حوالے کر دیا گیا جس نے ہر طرح کے اجتماعات پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی لیکن بوجوہ یہ اطلاع عوام تک نہ پہنچی اور ان احکامات سے لاعلمی کے باعث ہزاروں شہری جلیانوالہ باغ پہنچ گئے جن میں بے شمار دیہاتی بھی شامل تھے جو شہر میں بیساکھی کا تہوار منانے آئے تھے۔ جیسے ہی جلسہ شروع ہوا جنرل ڈائر بھی فوجی دستہ لے کر وہاں پہنچا اور نہتے حاضرین پر بغیر کسی اشتعال کے فائرنگ کا حکم دیا۔ چونکہ جلسہ گاہ سوائے باہر نکلنے کی چند تنگ راہوں کے چاروں اطراف سے بند تھی، اس لئے فوجیوں کی آتش بازی سے کافی جانی نقصان ہوا۔ سرکاری حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1605 گولیاں چلائی گئیں اور فائرنگ اس وقت ختم ہوئی جب سپاہیوں کے پاس کوئی گولی باقی نہ رہی۔ حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 379 آدمی مارے گئے اور 1200 زخمی ہوئے جبکہ غیر سرکاری ذرائع کا کہنا تھا کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔

اس خونیں واقعہ سے پورے پنجاب میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ حالات پر قابو پانے کے لئے حکومت کو مارشل لاء لگانا پڑا۔

تحریکِ خلافت کا آغاز

تحریک خلافت مسلمانانِ ہند کے ایمان و ایقان، عزم و عمل، جرأت و جسارت اور اتحاد و اتفاق کا بہترین مظہر تھی۔ انگریزوں کے ظالمانہ طرزِ عمل کے تلخ تجربات کے باوجود انہوں نے اپنے ترک بھائیوں کے لئے جس طرح تحریک خلافت کو نکتہ عروج تک پہنچایا، اس کی مثال عصر حاضر کی تاریخ میں شاید ہی کہیں سے مل سکے۔ جذبہ ایمان سے سرشار مسلمانانِ ہند نے دینی رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھنے کے لئے دنیاوی مفادات کو نظر انداز کیا۔ انگریزوں کی ترک دشمنی پالیسی کو للکارا اور اس کے خلاف ملک گیر سطح پر نہایت جرات مندی سے متعدد اقدامات کئے جن سے حکومت کو خاصی پریشانی لاحق ہوئی۔

تحریک خلافت کا جن حالات میں آغاز ہوا اور جس سرعت سے یہ آگے بڑھی، اس کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ مختصراً اس کے تاریخی پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس طرح ہمیں برصغیر کے مسلمانوں کی اس عظیم تحریک کے اسباب کو صحیح سیاق و سباق میں سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

نظام خلافت سے کیا مُراد ہے؟

پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی معاملات میں خلفائے راشدین نے نیابت کے فرائض انجام دیئے اور سرکار دو عالمؐ نے تعلیمات قرآنی کے مطابق اسلامی نظام حکومت کی جو روایات قائم کی تھیں ان پر کاملاً عمل پیرا رہے۔ انہوں نے عدل و انصاف، اخوت و مساوات اور ایثار و قربانی کی ایسی ناقابل فراموش اور تابندہ مثالیں چھوڑیں جن کی نظیر تاریخ عالم پیش کرنے سے قاصر ہے۔ خلفائے راشدین کا عہد ہر اعتبار سے اسلامی حکومت کا ایک جامع نمونہ تھا جو آج بھی مسلمانوں کے لئے جہانگیری و جہانبانی کے فن میں رہبری و رہنمائی کا حامل ہے۔

سانحہ طرابلس کے زخم ابھی تازہ تھے کہ 1912ء میں بلقان کی غیر مسلم ریاستیں مل کر ترکی پر حملہ آور ہوئیں۔ درحقیقت یہ حملہ برطانیہ کی ایما پر کیا گیا تھا اور درپردہ یورپی حکومتیں بھی اس کی پشت پناہی کر رہی تھیں۔ ترک فوجوں نے انتہائی حوصلے اور جوانمردی سے مقابلہ کیا لیکن دشمنوں کا پلہ بھاری رہا اور عثمانیہ افواج کو کئی محاذوں پر شکست ہوئی۔ یورپی ممالک بلقانی ریاستوں کی کامرانیوں پر بہت خوش تھے اور جب سالونیکا پر ان کا قبضہ ہوا تو برطانیہ کے لبرل وزیراعظم نے بھی مبارک باد دی۔

ان دردانگیز حالات پر مسلمانانِ ہند نہایت دلگیر اور مضطرب تھے۔ انہوں نے برطانوی وزیراعظم کے بیان پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور احتجاجی مراسلے بھیجے۔ مسلم لیگ نے بھی اس کی شدید مذمت کی۔ لیکن ان بیانات کے ساتھ

1919ء: ''انجمن خدام کعبہ'' کے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک پر ترکوں کی امداد کے لئے ''کل ہند خلافت کمیٹی قائم کی۔

ساتھ عملی اقدامات کی بھی ضرورت تھی چنانچہ ترک فوجیوں کے علاج معالجے کے لئے ایک طبی وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی قیادت ڈاکٹر انصاری نے کی۔ اس کے علاوہ ترکوں کی امداد کے لئے کئی انجمنیں قائم کی گئیں اور انگریزوں کے ترک دشمن کردار پر غم وغصہ کے اظہار کے لئے برطانوی مال کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ بھی ہوا۔

سلطنت عثمانیہ کی شکست و ریخت کے آثار واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ ان حالات میں مسلمانانِ ہند کو مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ 31 دسمبر 1913ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ایک اجلاس ہوا جس میں اس سنگین صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ''انجمن خدام کعبہ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو انجمن کی قیادت و صدارت کے فرائض سپرد کئے گئے جبکہ مولانا شوکت علی اور شبیر حسین قدوائی کو انتظامی ذمہ داریاں سونپی گئیں اس انجمن کی سرگرمیوں میں سیاسی زعماء کے علاوہ کئی ممتاز علماء نے بھی بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا اور عوام میں اسلام دشمن طاقتوں کے خلاف مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے لئے یک جہتی اور ایثار و قربانی کا جذبہ بیدار کیا۔

جولائی 1914ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو ترکوں نے انگریزوں کے خلاف جرمنی کا ساتھ دینے کا تہیہ کیا جس سے مسلمانانِ برصغیر کے لئے کافی پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی۔ انگریز مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ تھے۔ انہوں نے جنگ کے دوران مسلمانوں کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے اعلان کیا کہ عرصہ جنگ میں ترکی خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کا تحفظ کیا جائے گا لیکن یہ وعدے صرف وقتی مصلحتوں کے تحت کئے گئے تھے اور سیاسی مکر و فریب کے علاوہ کچھ نہ تھے۔ ان کی حقیقت اس وقت طشت از بام ہوئی جب انگریزوں نے اپنے حلیف ممالک کے مشورہ سے سلطنت عثمانیہ کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ تیار کیا اور جنگ عظیم کے اختتام پر اسے عملی جامہ پہنایا گیا۔ مکہ معظمہ میں شریف حسین اور چند دوسرے قوم پرست عرب پہلے ہی خود مختار ریاست کا اعلان کر چکے تھے۔ یونان، برطانیہ اور فرانس کے کئی علاقوں پر قابض ہو چکے تھے جبکہ ترک سلطان صرف اپنی عظیم اسلامی سلطنت کے کھنڈرات کا والی بن کر رہ گیا تھا۔

کل ہند خلافت کمیٹی

ہندوستان کے مسلمان ان اندوہناک تبدیلیوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ وہ اپنے ترک بھائیوں کی عملی امداد کرنا چاہتے تھے لیکن بدقسمتی سے اس وقت مسلمان قائدین کی اکثریت جیلوں میں بند تھی اور کچھ ملک بدر تھے۔ ان نامساعد حالات میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے جو ''انجمن خدام کعبہ'' کے صدر تھے ترکوں کی امداد کے لئے ملک گیر تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور لکھنو میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس بلایا جس میں کئی اہم شخصیتوں نے شرکت کی جن میں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے۔ کانفرنس نے مختلف تجاویز پر غور کرنے کے بعد ''کل ہند خلافت کمیٹی'' کے قیام کا اعلان کیا جس کا صدر دفتر بمبئی میں قائم کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس ادارے کو وسیع مقبولیت حاصل ہوئی اور ملک کے مختلف مقامات پر اس کی ذیلی شاخیں کھل گئیں۔

کانفرنس نے اپنے عملی پروگرام کی ابتداء کرتے ہوئے عوام سے ترکوں کے لئے ''یوم دعا'' منانے کی اپیل کی جس پر ملک بھر میں پورے خلوص سے عمل ہوا اور لوگوں نے ترک بھائیوں سے اپنی گہری وابستگی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ اسی سال 24 نومبر کو کانفرنس کے منتظمین نے ایک عام اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت شیر بنگال مولوی فضل حق نے کی۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مسلم زعماء نے ترکوں سے اپنے دینی رشتوں پر روشنی ڈالی اور حکومت پر واضح کیا کہ وہ اپنے ترک بھائیوں کی مشکلات و مصائب سے چشم پوشی نہیں کر سکتے اور ان کی امداد کے لئے ضروری اقدامات کرنا اپنا اخلاقی اور مذہبی فرض سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں اجلاس کے شرکاء نے کئی تجاویز پر غور کرنے کے بعد جو فیصلے کئے ان کے اہم نکات حسب ذیل ہیں۔

1۔ مسلمان انگریزوں کے جشن فتح کی تقریبات میں شرکت نہیں کریں گے۔

2۔ اگر مسلمانوں کے مطالبات پر فوری توجہ نہ دی گئی تو مسلمان برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تحریک چلائیں گے۔

3۔ اور انگریزوں سے عدم تعاون کی مہم کا آغاز کریں گے۔

اس اجلاس میں مسلمان قائدین کے علاوہ کئی ہندو رہنما بھی شریک ہوئے جن میں مسٹر گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مدن موہن مالویہ شامل تھے۔ کانفرنس کے اجلاس عام کے بعد مختلف رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس ہوا جس سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے کہا:

''آصف علی نے دعوت نامہ لکھا ہے کہ خلافت کے موضوع کے ساتھ ہی گائے کے تحفظ کا مسئلہ بھی زیر بحث لایا جائے لیکن ہم ہندو اپنی روایات پر یقین رکھتے ہوئے اس چیز کو باعث اعزاز نہیں سمجھتے کہ ایک اچھے مقصد کی امداد کے عوض کوئی چیز قبول کریں۔ اگر بعض ہندو یہاں اس خیال سے آئے ہیں تو انہیں یہ خیال دل سے نکال دینا چاہئے۔ کیونکہ اس وقت ہندو جو مدد بھی مسلمانوں کو دیں گے وہ قومی اور اخلاقی ذمہ داریوں کی بنیاد پر ہوگی۔ اس کے عوض کسی چیز کی توقع نہیں ہوگی۔ ترکوں کا معاملہ انصاف پر مبنی ہے۔ ہم اس کی حمایت کریں گے۔

مسٹر گاندھی کی یہ تقریر ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا شاہکار تھی۔ مسلمان ان کے خیالات سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس طرح مسٹر گاندھی نے مسلم عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیں اور بعد میں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے اس سے خوب فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

خلافت کانفرنس کی تجاویز نے دوسری سیاسی جماعتوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور 6 دسمبر کو جمعیت العلماء نے ان کی مکمل تائید کا اعلان کیا۔

کانگریس اور مسلم لیگ نے بھی اسی مہینے کے آخری ہفتہ میں امرتسر میں اجلاس منعقد کئے۔

مسلم لیگ کا اجلاس 29 دسمبر 1919ء کو شروع ہوا اور تین دن تک جاری رہا۔ ابتدائی اجلاس میں کئی کانگریسی لیڈروں نے بھی شرکت کی جن میں مسٹر گاندھی بھی شامل تھے۔

حکیم اجمل خان نے اپنے صدارتی خطبہ میں ملک کی سیاسی صورت حال اور انگریز حکومت کی تشدد آمیز حکمت عملی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انہوں نے جلیانوالہ باغ اور دوسرے مقامات پر حکومت کی طرف سے پُرامن شہریوں پر توڑ جانے والے مظالم اور سیاسی کارکنوں سے غیر انسانی سلوک پر سخت تنقید کی۔ ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کو سراہا اور ہندو رہنماؤں کو یقین دلایا کہ مسلمان ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں اپنے ہم وطنوں کے ساتھ پوری طرح شریک ہوں گے۔ اس موقع پر انہوں نے خلافت عثمانیہ اور ترکی کے ساتھ انگریزوں کے ظالمانہ طرزِ عمل کی بھی شدید مذمت کی اور ایران کے خلاف کئے جانے والے اقدام کو انتہائی غیر منصفانہ اور جابرانہ فعل قرار دیا۔ انہوں نے پیرس امن کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے کو شریک نہ کرنے پر بھی احتجاج کیا۔ اور اپنی تقریر کے اختتام پر خلافت عثمانیہ کے خلاف برطانیہ کے اقدامات پر غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''ترکی کی حالیہ صورت حال سے متعلق پیچیدہ مسائل اور ایران کی آزادی کا عملاً نابود ہونا ان وجوہات میں سے ہیں جو عالم اسلام میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی موجودہ بے چینی اور اضطراب کا سبب ہیں۔ میری رائے

میں یہ وجوہات کسی قسم کے عارضی عوامل سے تقویت حاصل نہیں کرتے اس لئے کہ ان کا تعلق ہمارے ایمان سے ہے اور اس بے چینی میں عارضی کمی کو اس کے ختم ہونے پر تعبیر کرنا غلط ہوگا۔ موجودہ حالات کے باعث خلافت کمیٹی وجود میں آئی ہے جو مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے گی۔ ترکی کے لئے منصفانہ حل کی جدوجہد جاری رکھے گی اور ایران کی آزادی اور سلامتی کے لئے کوشاں ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ کمیٹی کے ارکان اپنے خیالات کو پوری جرأت اور بے باکی سے ظاہر کریں گے"۔

دریں اثنا خلافت کانفرنس اور جمعیت العلماء ہند نے بھی امرتسر میں اجلاس بلائے اور داخلی موضوعات کے علاوہ خلافت اور ترکی کے مسئلے پر بھی غور کیا۔

ادھر انہی دنوں حکومت نے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ چھنڈواڑہ جیل سے آزاد ہو کر امرتسر پہنچے جہاں ان کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ وہیں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی طلب کیا گیا تھا۔ مولانا شوکت علی نے خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے فرائض ادا کئے۔ اپنی تقریروں میں رواں حالات کا جائزہ لیتے ہوئے برطانیہ اور دوسری یورپی طاقتوں کو متنبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا بند کریں اور مسلم ممالک کے خلاف سازشوں کا ناپاک سلسلہ ختم کریں ورنہ مسلمان اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ انہوں نے ان تمام جماعتوں اور اداروں کا بھی شکریہ ادا کیا جو اس مسئلے پر مسلمانوں کے ہم نوا تھے۔

کانفرنس میں فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد یورپ کے دورے پر جائے اور مختلف ممالک کے زعماء کو عالم اسلام کے احساسات اور نکتہ نظر سے آگاہ کرے اور بیرون ملک جانے سے پہلے یہ وفد وائسرائے سے بھی ملے اور اسے ہندوستانی مسلمانوں کے مطالبات اور ان کی روز افزوں بے چینی کے بنیادی اسباب سے مطلع کرے۔

خلافت کانفرنس کے فیصلوں کو عوام کی مکمل تائید حاصل ہوئی اور ملک کی دوسری مسلم تنظیموں نے بھی ان فیصلوں کی حمایت کا اعلان کیا۔ کانفرنس کے فیصلے کے مطابق 19 جنوری 1920ء کو خلافت کانفرنس، مسلم لیگ، جمعیت العلماء اور کانگریس کے نمائندوں پر مشتمل ایک وفد نے وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ سے ملاقات کی اور اسے مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کیا۔ لارڈ چیمسفورڈ نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے وفد کے ارکان کو بتایا کہ یہ معاملہ حکومت برطانیہ اور کچھ دوسرے ممالک سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا وہ اس میں مداخلت کے مجاز نہیں بہرکیف وہ ہندوستانی عوام خصوصاً مسلمانوں کے جذبات سے حکومت کو آگاہ کر دیں گے اور ممکنہ کوشش کریں گے کہ یہ مسئلہ برطانوی کابینہ کے سامنے پیش کیا جائے۔

وائسرائے سے ملاقات کے بعد مولانا محمد علی کی قیادت میں ایک وفد لندن روانہ ہوا۔ اس وفد میں مولانا سلیمان ندوی، سید حسین اور حیات محمد خان شامل تھے جبکہ مولانا ابوالقاسم اور شیخ مشیر حسین قدوائی کچھ دنوں بعد روانہ ہو کر لندن میں وفد سے جا ملے۔ ان کے علاوہ انگلستان میں موجود کئی ہندوستانی زعماء بھی وفد کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ ان میں مولوی عبدالرحمٰن صدیقی، محمد شعیب قریشی، مارماڈیوک محمد پکتھال، عبدالقیوم ملک اور پروفیسر محمد حبیب شامل تھے۔

وفد کے اراکین نے صرف چند لیڈروں سے ملاقات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ برطانیہ اور فرانس کے مختلف

قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورسز

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں:

۱) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے، مزید برآں 44 آڈیو کیسٹس کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

۲) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I, II, III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کے لئے درج ذیل پتے پر رجوع فرمائیں

ناظم شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-5869501

شہروں میں دانشوروں، صحافیوں اور معاشرے کی دوسری بااثر شخصیات سے خطاب کیا اور ان پر ہندوستانی مسلمانوں کا نکتہ نظر واضح کیا۔ مولانا محمد علی کی پُر جوش تقریروں نے کافی حد تک اثر دکھایا اور ان ممالک کے عوام ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات و احساسات کو پہلے سے بہتر سمجھنے لگے۔ برطانوی وزیراعظم مسٹر لائیڈ جارج نے وفد سے 17 مارچ کو ملاقات کی مگر اس کا رویہ نہایت غیر ہمدردانہ اور درشت تھا۔ اس نے وفد پر واضح کر دیا کہ ترکی کسی خاص امتیازی سلوک کا قطعاً روادار نہیں۔ اسے جنگ میں برطانیہ کے دشمن سے تعاون کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اگرچہ وفد کو اپنے مقاصد میں چنداں کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن وہ برطانیہ میں عوام اور اہل الرائے حضرات کو برصغیر کے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی سے آگاہ کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا۔

اندرون ملک کے حالات

اس دوران ملک کے اندر بھی تحریک خلافت کے کارپردازان کافی فعال رہے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا شوکت علی نے ملک کے مختلف حصوں میں جا کر لوگوں کو ترکوں کے خلاف کئے گئے غیر منصفانہ فیصلوں سے آگاہ کیا اور خلافت کمیٹی کے مجوزہ اقدامات کی روشنی میں مکمل تعاون پر زور دیا۔ ان زعماء کے دورے نہایت نتیجہ خیز رہے اور عوام کے تمام طبقوں نے ترکوں سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے خلافت کمیٹی کے ہر فیصلے کی تائید کا اعلان کیا۔ 25 مئی 1920ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے بمبئی میں خلافت کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور اس میں عوام کے پُر جوش اور حوصلہ افزا ردعمل کو مدنظر رکھتے ہوئے عدم تعاون کی تحریک چلانے کی تجویز پیش کی۔ تمام شرکاء نے اس تجویز کو منظور کرتے ہوئے اسے جلد از جلد زیر عمل لانے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی کے اس فیصلے کو موثر انداز میں عملی شکل دینے کی غرض سے عوامی تائید حاصل کرنے کے لئے رابطہ مہم کا آغاز کیا گیا۔ ملک کے گوشے گوشے میں جلسے اور بڑے بڑے اجتماعات میں اس تحریک کی ضرورت اور اہمیت بیان کی گئی جہاں عوام نے نہایت گرم جوشی سے اس اقدام کی توثیق کی۔ اس کے ساتھ ہی ہندو مسلم ارکان پر مشتمل ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی گئی جسے عدم تعاون کی ملک گیر تحریک کا پروگرام مرتب کرنے کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ کمیٹی کے ارکان نے نہایت محنت و جاں فشانی سے دو ماہ کے عرصے میں تحریک کا پروگرام تیار کر لیا تو مسٹر گاندھی نے محض رسماً وائسرائے کو ایک خط کے ذریعہ مختلف رہنماؤں کی ایک مشترکہ کانفرنس بلانے کا مشورہ دیا تاکہ موجودہ مسائل کو افہام و تفہیم کے ذریعہ حل کیا جا سکے لیکن وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے مجوزہ تحریک کو خام خیالی پر مبنی غیر حقیقت پسندانہ اقدام کہتے ہوئے رد کر دیا۔ وائسرائے کے اس آمرانہ فیصلے سے عوام کے اشتعال میں مزید اضافہ ہوا۔

دریں اثناء مسلمانانِ ہند کو ایک اور صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ 10 اگست کو سامراجی طاقتوں نے معاہدہ سائرس کے ذریعہ ترکی کو عملاً ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ترک دشمن حکومتوں کا یہ اقدام نہ صرف ترکوں کے خلاف تھا بلکہ عالم اسلام کی عظیم سلطنت کو بے دست و پا کر کے مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے کے مترادف تھا۔ برصغیر کے مسلمان جو خلافت عثمانیہ کی بقاء کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار تھا معاہدہ سائرس کے پردے میں امت مسلمہ کی تباہی کے لئے اس نئی سازش سے بے حد برہم ہوئے اور اس کے خلاف پوری شد و مد سے مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس مہم کا آغاز کرنے کے لئے 31 اگست کو ملک کے طول و عرض میں یوم خلافت منایا گیا۔ جس میں عوام نے نہایت جوش و خروش سے شمولیت کی اور حکومت پر واضح کر دیا کہ برصغیر کے مسلمان ترک دشمنوں کے ناپاک عزائم کی مخالفت میں پوری طرح متفق و متحد ہیں۔

یوم خلافت کی شاندار کامیابی سے تحریک خلافت کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے خلافت کمیٹی نے ستمبر کے وسط میں کلکتہ میں اجلاس منعقد کیا۔ کمیٹی کے نصب العین سے مکمل یکجہتی اور ہم آہنگی کا اظہار کرنے کے لئے جمعیت العلماء، مسلم لیگ اور کانگریس نے بھی کلکتہ میں اپنے اجلاس بلائے اور خلافت کمیٹی کے عدم تعاون کی تحریک کی تائید کرتے ہوئے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ سیاسی جماعتوں کے اس فیصلے کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب کئی ممتاز علماء نے عدم تعاون کی تحریک کو شرعی نکتہ نگاہ سے جائز قرار دیا اور ایک فتوے کے ذریعہ مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔

سیاسی رہنماؤں نے عدم تعاون کی تحریک سے عوام کی وابستگی کو مزید استوار کرنے کے لئے ملک بھر میں جلسوں سے خطاب کیا اور تحریک کے اغراض و مقاصد کی تشریح کی۔ انہی دنوں مولانا محمد علی بھی اپنے وفد کے ہمراہ لندن سے واپس پہنچ چکے تھے۔ وہ بھی اس رابطہ مہم میں شریک ہو گئے اور مسٹر گاندھی کے ساتھ مل کر ہندوستان کے کونے کونے کا دورہ کیا اور عدم تعاون کی تحریک کو حقیقی معنوں میں ایک جاندار تحریک بنا دیا۔ مسٹر گاندھی نے اس موقع سے اپنے مخصوص عزائم کے لئے خوب فائدہ اٹھایا جس کا تذکرہ ہندو مصنفین مہاجن اور سیٹھی نے اپنی کتاب ''انڈیا سنس 1526ء'' میں یوں کیا ہے:

''مسلمانوں نے تحریک شروع کی تھی اور مہاتما گاندھی نے فوراً ہی اس تحریک کے ساتھ اپنے آپ کو پوری طرح وابستہ کر لیا۔ مہاتما گاندھی کو یقین تھا کہ ان حالات میں کانگریس عدم تعاون کی تحریک شروع کر دے تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ مسلمان کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اسی طرح ایک سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہئے''۔

مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کی جذباتی کیفیت سے استفادہ کرنے کی جس ''صلاحیت'' کا مظاہرہ کیا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے چودھری محمد علی کہتے ہیں:

''ہندوؤں میں صرف وہی ایک ایسے رہنما تھے جن میں اتنی بصیرت تھی کہ وہ محسوس کریں کہ مسلم عوام میں پائی جانے والی بے پناہ طاقت جسے تحریک خلافت نے بیدار کیا ہے سوراج کی حمایت کے لئے استعمال کی جا سکے تو وہ ہندو اور مسلم قوموں کے درمیان ایک سیاسی عمل سے اتحاد پیدا کر سکتے ہیں اور پرانی آئینی تحریک کو ایک انتہائی انقلابی نوعیت کی عوامی تحریک میں بدل سکتے ہیں۔ مسلمان خلافت کے مسئلے میں کامیاب ہوں یا ناکام، دونوں صورتیں ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے بے معنی تھیں اس لئے کہ اہم ترین معاملہ یہ تھا کہ اس تحریک سے آزادی ہند کا مقصد کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے''۔

جس ڈرامائی انداز میں مسٹر گاندھی تحریک خلافت کا سہارا لے کر ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں ہوئے وہ ان کے سیاسی ذہن رسا کا بے مثال شعبدہ تھا۔ وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہوئے اور دونوں فرقوں میں موجود سالہا سال کے تفرقات تیزی سے معدوم ہونے لگے جو سوراج کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک بنیادی ضرورت تھی۔ حکومت نے عدم تعاون کی تحریک کو دبانے کے لئے تمام حربے استعمال کئے۔ پولیس اور فوج نے طرح طرح کے مظالم توڑے، لاکھوں افراد گرفتار ہوئے۔ جیل خانے بھر گئے لیکن عوام کے جوش و جذبہ کو ختم کرنے کے لئے حکومت کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی۔ حکومت کے احکام کی خلاف ورزی اور غیر ملکی سامان کا بائیکاٹ زندگی کا معمول بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ملک بھر میں کھدر نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ معاشرے کے مغرب زدہ طبقوں میں بھی دیسی سامان کا استعمال عام ہو گیا۔ برطانوی صنعت پارچہ بافی کے لئے اس تحریک کے نتائج بہت

1921ء: خلافت کانفرنس میں انقلابی تقریر کرنے کے الزام میں مولانا محمد علی جوہر پر مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا صاحب کو دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

نقصان دہ تھے جبکہ مقامی صنعت کو جو ہندوؤں کے قبضے میں تھی خوب فائدہ پہنچا اور ہندو صنعت کاروں نے جی کھول کر کانگریس کی مالی امداد کی۔

تحریک عدم تعاون پورے زور و شور سے جاری تھی۔ مسلمان نہایت انہماک سے مذہبی فریضہ سمجھتے ہوئے اسے کامیاب بنانے کے لئے سرگرم عمل تھے۔ بعض علماء نے موجودہ حالات میں سرکاری ملازمت کو بھی خلاف اسلام قرار دے دیا جس سے سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی شرح جو پہلے ہی بہت کم تھی، مزید متاثر ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ان تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا جنہیں حکومت سے مالی امداد ملتی تھی۔ علی برادران نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے منتظمین سے مطالبہ کیا کہ وہ سرکاری امداد لینا ترک کر دیں۔ منتظمین نے نامساعد حالات کے پیش نظر ایسا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تو علی برادران کی اپیل پر کئی طلباء اور اساتذہ یونیورسٹی سے علیحدہ ہو گئے اور وہیں نیشنل مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جو بعد میں دہلی منتقل ہو کر ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کہلائی۔ لیکن اس کے برعکس بنارس میں ہندو یونیورسٹی جسے متعصب ہندو لیڈر پنڈت مالویہ کا تحفظ حاصل تھا، اس نوعیت کی آزمائشوں سے محفوظ رہی۔

تحریک ہجرت اور تحریک عدم تعاون

تحریک عدم تعاون پوری شدت اور تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور روز بروز بگڑتے ہوئے حالات سے حکومت کو خاصی مشکلات کا سامنا تھا کہ اچانک مسلم عوام میں ایک نئی لہر پیدا ہوئی اور بعض جوشیلے حضرات نے فیصلہ کیا کہ برطانیہ کے زیر تسلط ہندوستان میں رہنا مناسب نہیں لہٰذا انہوں نے اپنا کاروبار بند کر کے مال و متاع اونے پونے بیچ کر افغانستان کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ صوبہ سرحد اور سندھ کے ہزاروں گھرانے اپنا سب کچھ فروخت کر کے افغانستان پہنچ گئے۔ افغان حکمرانوں نے اقتصادی مجبوریوں اور سیاسی مصلحتوں کی بناء پر مہاجرین کی حوصلہ شکنی کی۔ چنانچہ یہ تارکین وطن کچھ ہی عرصے بعد نہایت خستہ حالی میں ہندوستان واپس آئے۔ لیکن اب ان کے پاس نہ کوئی مالی وسائل تھے اور نہ ہی سر چھپانے کی کوئی جگہ۔ اپنے بے خانماں بھائیوں کی بحالی کے لئے مسلمانوں نے ہر ممکن امداد مہیا کی جو اسلامی جذبہ اخوت کا بے مثال مظاہرہ تھا۔

تحریک خلافت جو ایک مخصوص نصب العین کے تحت شروع کی گئی تھی تا کہ انگریزوں کو خلافت عثمانیہ کو نقصان پہنچانے سے باز رکھا جا سکے تحریک عدم تعاون کا جزو بن کر رہ گئی اور اس طرح نہ صرف اس کی جداگانہ حیثیت ختم ہو گئی بلکہ اس کے بنیادی مقاصد بھی متاثر ہوئے۔ کئی مسلمان رہنماؤں نے جن میں قائداعظم محمد علی جناح نمایاں تھے مسلمانوں کو اس طرز عمل سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوئے۔ قائداعظم کو تحریک خلافت کے مقاصد سے پوری ہمدردی تھی' لیکن جب گاندھی کی رہنمائی میں اس تحریک نے سول نافرمانی کا رخ اختیار کیا اور اپنا جداگانہ تشخص کھو بیٹھی تو قائداعظم نے مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ قائداعظم جانتے تھے کہ گاندھی مسلمانوں کی جذباتی کیفیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا ورنہ عدم تشدد اور سول نافرمانی کی تحریکیں بنیادی طور پر ایک دوسرے سے متضاد تھیں۔ قائداعظم کو یقین تھا کہ جب بھی سول نافرمانی کی تحریک نے زور پکڑا اس میں تشدد کا عنصر غالب آئے گا اور حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے قائداعظم کی اس سوچ کی تصدیق کر دی۔

اسی طرح ترک موالات کے فیصلے سے قائداعظم کے اختلاف کا حقیقی سبب یہ تھا کہ مسلمانوں میں تعلیمی پسماندگی کے باعث وہ اس بات کے حق میں نہ تھے کہ مسلمان نوجوان تعلیمی سرگرمیاں ترک کر دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہم انگریزوں سے مالی امداد لینے والے اداروں سے استفادہ نہیں کرنا چاہتے تو ان کا بائیکاٹ کرنے سے پہلے متبادل انتظامات کریں تا کہ ہماری نئی نسل تعلیم کے میدان میں اپنے ہم وطنوں سے مزید پیچھے نہ رہ جائے کیونکہ ایسی صورت حال مسلمانوں کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔

برطانوی حکومت نے تحریک عدم تعاون کی شدت کم کرنے کے لئے خلافت کمیٹی کے صدر سیٹھ چھوٹانی کو مذاکرات کی دعوت دی۔ چنانچہ سیٹھ چھوٹانی کی قیادت میں ایک وفد لندن روانہ ہوا جس میں ڈاکٹر انصاری' سید حسن امام مشیر' حسین قدوائی اور قاضی عبدالغفار شامل تھے۔

وفد کے ارکان نے نہایت صراحت سے اپنے مطالبات پیش کئے لیکن برطانوی حکومت کے سخت اور غیر مفاہمت آمیز رویئے سے مذاکرات ناکام ہوئے اور وفد بغیر کچھ حاصل کئے واپس ہوا۔

اس زمانہ میں تحریک عدم تعاون پورے عروج پر تھی۔ حکومت کا ظلم و تشدد عوام کو ہراساں کرنے کی بجائے ان کے جوش و خروش میں مزید اضافے کا باعث ثابت ہوا۔ مختلف طبقوں کی یک جہتی میں استحکام پیدا ہوا۔ تحریک اپنی منزل مقصود کی طرف تیزی سے گامزن تھی کہ ہندوستان کے مشرقی ساحلی علاقے میں ایک خونیں واقعہ رونما ہوا۔ یہاں ایک عرب نژاد قبیلہ موپلا صدیوں سے آباد تھا۔ اس قبیلے کے افراد نہایت دیندار اور خدا ترس تھے جو کھیتی باڑی اور تجارت سے بسر اوقات کرتے تھے۔ جب تحریک عدم تعاون کے کچھ زعماء ان کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کے لئے موپلوں کے علاقے میں پہنچے تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ موپلے حکومت کے اس اقدام پر بہت برہم ہوئے اور پولیس سے مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حکومت نے موپلوں کی سرکوبی کے لئے فوج کو سخت ترین اقدام کا حکم دیا۔ چنانچہ فوجی کارروائی میں سینکڑوں موپلہ مرد' عورتیں' بچے اور بوڑھے مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے۔ اس دوران مقامی ہندوؤں نے موپلوں کے خلاف حکومت سے تعاون کیا اور انگریز افسروں کو موپلوں کی سرگرمیوں سے مطلع کرتے رہے۔ ہندوؤں کی اس حرکت سے موپلوں کی برہمی نے فرقہ وارانہ فسادات کی صورت اختیار کی۔ انگریزوں کے ایماء پر متعصب ہندو لیڈروں اور اخباروں نے ان فسادات کی خبروں کو بڑی مبالغہ آمیزی سے ملک بھر میں پھیلایا۔ اگرچہ مسٹر گاندھی نے موپلوں کا ساتھ دیا لیکن اس واقعہ سے تحریک عدم تعاون کو سخت نقصان پہنچا اور ہندو مسلم یکجہتی پارہ پارہ ہوئی دکھائی دینے لگی۔

مولانا محمد علی کی گرفتاری

حکومت کو علی برادران کی ولولہ انگیز تقاریر اور بے باکانہ طرز عمل سے کافی پریشانی لاحق تھی۔ چنانچہ مولانا محمد علی کو گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ مقدمہ کی بنیاد مولانا کی وہ تقریر تھی جو انہوں نے خلافت کانفرنس میں کی تھی۔ مقدمہ کی سماعت کا آغاز 26 ستمبر 1921ء کو خالقدینا ہال کراچی میں ہوا۔ مولانا محمد علی نے خود اپنی وکالت کرنے کا فیصلہ کیا اور سماعت کے دوران نہایت فصاحت و بلاغت اور جرات و اعتماد کے ساتھ حکومت کے عائد کردہ الزامات کا مدلل جواب دیا۔ لیکن مقدمے کا فیصلہ تو مقدمہ قائم ہونے سے پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ سماعت مکمل ہونے پر عدالت نے مولانا محمد علی اور ان کے رفقاء کو جن میں دو ہندو اور چار مسلمان تھے دو دو سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔

علی برادران کی سزایابی سے حکومت کے خلاف عوام کی تحریک کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ برطانوی ولی عہد پرنس آف ویلز کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر تمام تقریبات کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے تا کہ برطانوی حکومت ہندوستانی عوام کے برافروختہ جذبات کی

شعبہ سمع و بصر کی پیشکش

صدر موسس مرکزی انجمن خدام القرآن اور بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** صاحب کی تقاریر اب

DVD میں دستیاب ہے

منتخب نصاب

دین کے جامع تصور سے آگاہی اور دینی تقاضوں کا فہم و شعور حاصل کرنے کے ایک مؤثر قرآنی نصاب کے سلسلہ وار دروس

تعداد DVDs = 24

بیان القرآن

قرآن حکیم کا ترجمہ اور مختصر تشریح

ARY اور **Qtv** کا سب سے مقبول پروگرام جو کہ چار سال سے تقریباً روزانہ نشر ہو رہا ہے

تعداد DVDs = 27

عظمت مصطفی ﷺ

سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک انتہائی اہم اور جامع تقریر جس میں سیرت مصطفی ﷺ کو ایک اچھوتے انداز میں بیان کیا گیا ہے

تعداد DVDs = 01

خطبات خلافت

کیا موجودہ علاقائی اور عالمی حالات میں پاکستان میں خلافت کا قیام ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو اس کا قیام کیسے ممکن ہے؟ تین تقاریر مع سوال و جواب

تعداد DVDs = 03

Round Table

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا امریکہ، برطانیہ اور دیگر ممالک سے آئے ہوئے پروفیسر حضرات کو اہم موضوعات پر خطاب اور ان کے سوالات کے جوابات

تعداد DVDs = 03

اسلام میں پردے کے احکام

ایوان اقبال لاہور میں منعقد ہونے والا پروگرام جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام میں پردے کے احکامات پر روشنی ڈالی

تعداد DVDs = 01

رسول انقلاب کا طریق انقلاب

الحمراء ہال لاہور میں منعقد ہونے والی تقریر جس میں منہج انقلاب نبوی ﷺ کے موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مفصل خطاب ارشاد فرمایا

تعداد DVDs = 01

ختم نبوت اور تکمیل رسالت

خاتم المرسلین حضرت محمد مصطفی ﷺ کی تکمیل رسالت اور اس کے مظہر پر ایک مکمل اور جامع تقریر جس میں ختم نبوت کی نہایت جامع انداز میں تشریح کی گئی ہے

تعداد DVDs = 01

مکتبہ خدام القرآن

قرآن اکیڈمی، 36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501 فیکس: 5834000

ای میل: maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

شدت سے آگاہ ہو۔ وائسرائے اس فیصلے سے بہت پریشان ہوا۔ اس نے مسٹر گاندھی سے بالواسطہ بات چیت کی سلسلہ جنبانی کی' تا کہ سرکاری تقریبات کے مجوزہ بائیکاٹ کا سدباب کیا جا سکے لیکن اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی اور حکومت نے مسٹر گاندھی اور حکیم اجمل خان کے علاوہ کئی سیاسی لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ اس طرح حکومت اور عوام کے درمیان موجود اختلافات وسیع تر ہو گئے اور حالات نے سنگین تر صورت اختیار کر لی۔

کانگریس نے حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لئے 1921ء کے آخر میں اپنے احمد آباد کے اجلاس میں سول نافرمانی کی مہم چلانے کی منظوری دی اور اس کی قیادت مسز گاندھی کے سپرد کی۔ جنوری 1922ء تک اس مہم کو کامیابی سے آگے بڑھانے کے لئے تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے اور طے پایا کہ اس کی ابتدا سرکاری ٹیکسوں کی عدم ادائیگی سے کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی مسز گاندھی نے وائسرائے کو ایک خط کے ذریعے مطالبات تسلیم نہ ہونے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ لیکن وائسرائے نے خط کے مندرجات کو یکسر مسترد کر دیا جس سے حکومت اور عوام میں کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور عوام اپنے رہنماؤں کا اشارہ پاتے ہی سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہو گئے کہ اچانک مسٹر گاندھی نے اس تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ان کے اس فیصلے کا محرک چوراچوری کے مقام پر پولیس اور مقامی آبادی کے درمیان ہونے والا فساد تھا۔ چوراچوری ضلع گورکھپور میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں 3 فروری 1922ء کو لوگوں نے حکومت کے خلاف جلوس نکالا۔ پولیس نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لئے گولی چلا دی جس سے کئی افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہو گئے۔ عوام نے انتقاماً پولیس سٹیشن کو نذرِ آتش کر دیا جس میں بائیس سپاہی جل کر مر گئے۔ مسٹر گاندھی اس سانحہ سے اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک کو ہی معطل کر دیا۔ ڈی جی تندلکر اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب ''مہاتما'' میں لکھتے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے اس حادثہ کی خبر سن کر کہا کہ ''ابھی ہندوستان میں عدم تشدد کا ایسا ماحول پیدا نہیں ہوا جو کسی عوامی تحریک کا جواز مہیا کرے''۔ مسٹر گاندھی کے اس فیصلے سے عوام نہ صرف حیران بلکہ بہت مایوس ہوئے۔ اس لئے کہ ''اگر چوراچوری کے فسادات کے باوجود سول نافرمانی کی تحریک چلائی جاتی تو عوام کے خیال میں برطانوی حکومت ہندوستانی مطالبات کے سلسلے میں اہم مراعات دینے پر مجبور ہو جاتی۔

شعبہ مطبوعات قرآن اکیڈمی لاہور

کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسائل و جرائد

تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کا نقیب

غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کا حدی خواں

ماہنامہ **میثاق** لاہور

مدیر مسئول: **ڈاکٹر اسرار احمد**

قیمت فی شمارہ: 15 روپے سالانہ زرِ تعاون (اندرون ملک) 150 روپے

دعوت رجوع الی القرآن کا نقیب' علوم و حِکمِ قرآنی کا پرچارک

ماہنامہ **حکمت قرآن** لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیر مسئول: **ڈاکٹر اسرار احمد**

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ زرِ تعاون (اندرون ملک) 100 روپے

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ **ندائے خلافت** لاہور

حالات حاضرہ' سیاسی تجزیئے' ہلکے پھلکے علمی' معلوماتی' تحریکی مضامین اور رپورٹیں

مدیر مسئول: **حافظ عاکف سعید**

قیمت فی شمارہ: 5 روپے سالانہ زرِ تعاون (اندرون ملک) 250 روپے

مزید برآں 125 سے زائد چھوٹی بڑی کتب — فہرست مطبوعات بلا قیمت طلب کیجئے

ڈسٹری بیوٹر: **مکتبہ خدام القرآن لاہور**

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 03-5869501

علی برادران اور دوسرے کئی سیاسی لیڈر پہلے ہی قید تھے۔ اب حکومت نے گاندھی کو بھی بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے دو سال کی سزا سنا دی۔ سرکردہ رہنماؤں کی عدم موجودگی میں تحریک دم توڑ گئی اور عوام گم کردہ راہ کارواں کی طرح بھٹکنے لگے۔ ان حالات کو دیکھ کر مسلمان عجیب پریشانی میں مبتلا تھے۔ انہیں اپنی کامیابی کی منزل بہت قریب دکھائی دے رہی تھی جو مسٹر گاندھی کے اس فیصلے سے منزلوں دور ہوگئی' لیکن مسلمانانِ ہند کے لئے ابھی اس سے بھی زیادہ سنگین سانحہ رونما ہونے والا تھا۔ خلافت عثمانیہ جس کے لئے انہوں نے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نابود ہونے والی تھی۔ مارچ 1924ء میں ترکی میں نئی حکومت برسراقتدار آئی جس نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے ملک بدر کر دیا اور سلسلہ خلافت ختم ہوگیا۔ مسلمانانِ ہند کے لئے یہ خبر نہایت اندوہناک تھی۔ جس مرکزیت کی بقا کے لئے وہ مدتوں سرگرم عمل رہے، اس کا یہ افسوسناک انجام ان کی قربانیوں کے رائیگاں جانے کے مترادف تھا۔ لیکن یہ فیصلہ ترکی قوم نے اپنے حالات اور مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تھا جس کا انہیں پورا حق حاصل تھا۔ ترک میں سیاسی تبدیلی ہندوستان میں تحریک خلافت کے لئے ناقوس اجل تھا۔ عوام مایوسی اور بددلی کا شکار تھے جبکہ رہنما نامساعد حالات کے باعث اپنی بے بسی اور بے چارگی پر اشکبار تھے۔ لیکن جب کچھ ہی عرصے میں مصطفیٰ کمال نے یونانیوں کو عبرتناک شکست دے کر سمرنا اور قسطنطنیہ سے نکال باہر کیا تو مسلمانانِ ہند بے حد خوش ہوئے۔

اگرچہ تحریک خلافت کی ناکامی سے مسلمانوں کو مایوسی ہوئی تھی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تحریک کی بدولت ان میں فکر و نظر کی ہم آہنگی' عزم و عمل کی یک جہتی اور نظریاتی یگانگت کی صلاحیتوں نے جلا پائی جو آئندہ برسوں میں ان کی جدوجہد آزادی کے دوران بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

1920ء سے 1930ء تک

جولائی 1917ء میں مسٹر ایڈون مانٹیگو نے حکومت برطانیہ کے وزیر ہند کا عہدہ سنبھالا اور 20 اگست کو ہندوستان میں مجوزہ آئینی اصلاحات کے متعلق پارلیمنٹ میں ایک اہم بیان دیا' جس میں اعلان کیا گیا کہ ''حکومتِ برطانیہ ہندوستانیوں کو انتظامیہ کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ شرکت کا موقع دے گی اور ملک میں خودمختار اداروں کی تدریجی ترقی اور قیام کے لئے اقدام کرے گی' تاکہ وہاں ایک ذمہ دار حکومت کی تشکیل ممکن ہو سکے''۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر مانٹیگو نے کہا کہ وہ جلد ہی ہندوستان جائیں گے اور وہاں سرکردہ سیاسی رہنماؤں سے مختلف آئینی اور دوسرے متعلقہ مسائل پر تبادلۂ خیال کریں گے۔

1919ء کا ایکٹ

اس وقت یورپ میں جنگ عظیم کی صورت حال اتحادیوں کے حق میں نہ تھی اور برطانیہ کو خاصی مشکلات کا سامنا تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں بھی سیاسی دباؤ بڑھ رہا تھا اور حکومت سے آئینی اصلاحات کا تقاضا دن بدن زور پکڑ رہا تھا۔ برطانوی حکومت نے حالات پر قابو پانے اور عوام کی توجہ سیاسی مسائل سے ہٹا کر آئینی امور کی طرف مبذول کرانے کے لئے ضروری سمجھا کہ اس نوعیت کا اعلان کیا جائے۔

مسٹر مانٹیگو حسب وعدہ نومبر 1917ء میں ہندوستان پہنچے اور اپریل 1918 تک برصغیر میں قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ ممتاز سیاسی رہنماؤں اور اہل الرائے حضرات سے ملاقاتیں کیں اور ہندوستان کی سیاسی صورت حال سے آگاہی حاصل کی۔ اس دورہ کے اختتام پر جولائی 1918ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شائع کی گئی جس میں کہا گیا کہ حکومت بند بدستور برطانوی پارلیمان کو جوابدہ رہے البتہ صوبائی انتظامیہ کے بعض شعبوں کی ذمہ داری صوبائی پارلیمنٹ کے سپرد کی جائے۔

اس رپورٹ میں آئینی اصلاحات کی سفارشات کو برطانوی پارلیمان میں پیش کرنے سے پیشتر ان کا تفصیلی جائزہ لینے اور مجوزہ بل کو آخری شکل دینے کے لئے تین کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد 2 جون 1918ء کو آئینی اصلاحات کا مجوزہ بل برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوا اور 23 دسمبر 1918ء کو اسے تاج برطانیہ کی منظوری حاصل ہوئی۔ اس بل کے ذریعے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ڈھانچوں میں اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ نومبر 1920ء میں نئی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے گئے اور یکم جنوری 1921ء کو سیاسی اصلاحات نافذ العمل ہوئیں۔

نئے دستور کے تحت مرکز میں دوایوانی طرزِ حکومت رائج کی گئی' جس میں مجلس مقننہ (سنٹرل اسمبلی) کے ارکان کی تعداد 144 مقرر ہوئی جو 104 منتخب' 26 سرکاری اور 14 نامزد ارکان پر مشتمل تھی۔ اس اعتبار سے منتخب ارکان کو اکثریت حاصل تھی۔ مجلس مقننہ کی معیاد تین سال اور مجلس مملکت کی معیاد پانچ سال رکھی گئی۔ گورنر جنرل کو دونوں ایوانوں میں کسی مسئلے پر اختلاف کی صورت میں مشترکہ اجلاس بلانے کا اختیار دیا گیا۔ دونوں ایوانوں کے لئے براہِ راست انتخابات کے ذریعہ ارکان کے چناؤ کا طریق کار طے پایا۔ البتہ ووٹروں کے لئے جائداد کی شرط سے حق رائے دہی محدود ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریق انتخاب کا اصول نئے دستور کا حصہ تھا۔ مرکزی مقننہ کے اختیارات کا دائرہ کار بھی کافی وسیع کر دیا گیا تھا۔ ارکان مجلس کو تحریک التواء پیش کرنے کی اجازت تھی۔ ضمنی سوالات پوچھنے کا حق صرف سوال کرنے والے رکن کے علاوہ باقی تمام ارکان کو بھی دیا گیا۔ ان مراعات کے باوجود مجلس کے اختیارات محدود تھے۔ گورنر جنرل کی پیشگی منظوری کے بغیر سرکاری قرضوں' محصولات' ہندوستان میں رہنے والے برطانوی باشندوں کے مذہبی معاملات' فوج' بحریہ اور خارجی تعلقات' صوبائی امور' صوبائی مقننہ کے منظور شدہ قانون کی ترمیم یا تنسیخ اور گورنر جنرل کے جاری کردہ آرڈی نینس کے بارے میں کوئی بل پیش کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح مجلس مقننہ برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ کسی ایکٹ یا 1919ء کے ایکٹ کو منسوخ یا تبدیل کرنے کی مجاز نہ تھی۔ نئے دستور کے تحت صوبوں میں جو نظام رائج ہوا، اس کے مطابق صوبائی کونسلوں کو جن محکموں کا اختیار ملا ان میں مقامی حکومت' آبادکاری' تعلیم' صحت' صفائی' تعمیرات' صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ شامل تھے جبکہ مال گزاری' آبپاشی' امداد باہمی' عدالتیں' پولیس' جیل خانہ جات اور مزدوروں کے معاملات گورنروں کے خصوصی اختیارات کا حصہ تھے۔ اس کے علاوہ صوبائی گورنروں کو مخصوص حالات میں خود بھی قانون جاری کرنے کا اختیار تھا۔

نئی آئینی اصلاحات اس بنیادی تصور کی غماز تھیں کہ ''ہندوستان کے عوام ابھی خود اختیاری کے اہل نہ تھے لہٰذا مکمل ذمہ داری سنبھالنے سے پیشتر ان کی سیاسی تربیت ضروری تھی۔ اسی نکتہ نظر سے صوبوں میں نیا نظام رائج کیا گیا لیکن گورنروں کے خصوصی اختیارات نے اس کی افادیت کو کافی محدود کر دیا تھا جبکہ مرکزی حکومت کے طریق کار میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی اور وہ بدستور برطانوی پارلیمنٹ کو جوابدہ رہی۔

آئینی اصلاحات ایسی ہی بعض خامیوں کے باعث ہندوستان کی پیشتر سیاسی جماعتوں کے لئے اپنی موجودہ شکل میں قابل قبول نہ تھیں۔ کانگریس نے انہیں

1922ء: عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران تو ہندو مسلم اتحاد کے نعرے گونجتے تھے' لیکن اُن کے اختتام پر ہندو مسلم کشاکش کئی گنا بڑھ گئی۔

یکسر مسترد کر دیا جبکہ مسلم لیگ نے اصلاحات کو رد تو نہیں کیا البتہ ان اصلاحات کے تحت ہونے والے انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ کانگریس کے بعض ممبران اپنی جماعت کے فیصلے سے متفق نہ تھے چنانچہ انہوں نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر نیشنل لبرل پارٹی کے نام سے ایک نئی جماعت بنائی اور انتخابات میں حصہ لیا۔ کئی صوبوں میں لبرل پارٹی کے منتخب نمائندے وزیر بھی مقرر ہوئے۔ مدراس میں غیر برہمن ہندوؤں کی جسٹس پارٹی نے صوبائی کونسل میں اکثریت حاصل کی جبکہ بنگال میں مسلمان غیر منظم ہونے کے باعث صوبائی کونسل میں آزاد ممبر یا سوراج پارٹی کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوئے البتہ بعض قوانین کے سلسلے میں سوراج پارٹی کی ہندو نواز پالیسی کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے 1926ء میں اپنا علیحدہ گروہ بنا لیا تاکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ 1919ء کی اصلاحات کے فوائد سے صوبہ سرحد کو محروم رکھا گیا تا آنکہ 1932ء میں صاحب زادہ عبدالقیوم کی مساعی جمیلہ سے اسے باقاعدہ صوبے کا درجہ حاصل ہوا۔ سندھ کو الگ صوبہ بنانے کا مسئلہ تصفیہ طلب رہا اور بمبئی کے ساتھ بدستور ملحق رہنے سے سندھ کی مسلمان اکثریت حسب سابق اقلیت ہی رہی۔

آئینی اصلاحات سے ملک کی سیاسی صورت حال میں کوئی مثبت تبدیلی نہ آ سکی۔ مسلمان سراسر خسارے میں رہے۔ تحریک خلافت کے دوران انہیں ان اصلاحات کے حسن و قبیح پر توجہ دینے کی صورت ہی نہ ملی۔ ادھر مسٹر گاندھی کی رہنمائی میں سول نافرمانی کی لہر اس زور سے اٹھی کہ ہندو مسلمان سبھی اس میں بہہ گئے۔ اگرچہ (قائداعظم) محمد علی جناح اور ان کے بعض اعتدال پسند رفقاء نے مسلمانوں کو اس طرح جذباتیت کا شکار ہونے سے روکنا چاہا لیکن ان کا بروقت اور صائب مشورہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ اور جب مسٹر گاندھی نے تحریک کو اچانک ختم کرنے کا اعلان کیا تو مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ سیلاب کے طوفانی ریلے کے بعد برگ و گیاہ کی طرح بکھرے پڑے تھے جبکہ ہندوؤں کی نمائندگی کے لئے کانگریس کے علاوہ بھی کئی تنظیمیں تھیں جو سول نافرمانی سے الگ تھلگ رہی تھیں اور ہندوؤں کے مفادات کی نگہداشت کر سکتی تھیں۔

ان حالات میں عوام کے جوش و جذبہ نے دوسرا رخ اختیار کیا اور ملک فرقہ وارانہ فسادات کی گرفت میں آ گیا۔

ہندو مسلم فسادات کا دور

4 فروری 1922ء کو مسٹر گاندھی نے کسی مسلمان لیڈر سے مشورہ کئے بغیر' عدم تعاون کی تحریک کا گلا گھونٹ دیا۔ اس سے تحریک خلافت بھی بے جان ہو کر رہ گئی۔ اُس وقت بہت سے با اثر رہنما جیلوں میں تھے۔ گاندھی پر مقدمہ دائر ہوا۔ انہیں پانچ سال قید کی سزا ملی۔ ابھی یہ مدت پوری نہ ہوئی تھی کہ انہیں رہا کر دیا گیا۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران تو ہندو مسلم اتحاد کے نعرے گونجتے تھے' لیکن ان کے اختتام پر ہندو مسلم کشاکش کئی گنا قوت کے ساتھ واپس آ گئی۔ 1922ء سے 1931ء تک کے زمانے کو عام طور پر فسادات کا زمانہ کہا جاتا ہے۔

ابتداء 20 اکتوبر 1921ء کو مالابار سے ہوئی' جہاں ہندو مخبروں اور حکومت کے افسروں کی ملی بھگت سے مسلمانوں پر غیر انسانی تشدد کے تمام ریکارڈ مات کر دیئے گئے۔ ملتان' لاہور' کلکتہ' بمبئی اور دوسرے تمام بڑے بڑے شہروں' بلکہ قصبوں میں بھی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ سب سے زیادہ ہولناک فساد 1931ء میں کان پور میں ہوا' جہاں مسلمانوں کے جان و مال کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ فسادات کی ابتدا تو معمولی جھگڑوں اور رنجشوں سے ہوتی' مگر اُن کے نتائج نہایت سنگین ہوتے تھے۔

ہندو تحریکیں

اس مسموم فضا میں شدھی اور سنگھٹن کی ہندو تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان کا ہلکا سا تعارف گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ ''شدھی'' کے لفظی معنی پاک کرنا ہے۔ اس تحریک کا بانی جالندھر کا ایک وکالت پیشہ سماجی کارکن منشی رام تھا۔ فریب دہی اور ذرا ما بازی سے شردھا نند کہلایا۔ عدم تعاون کی تحریک کے پلیٹ فارم پر وہ دہلی کے جلسوں میں پیش پیش نظر آتا تھا۔ ایک مرتبہ تو اُس نے دہلی کی جامع مسجد سے مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کیا۔ وہ کسی سیاسی مقدمے میں ملوث ہو کر جیل بھیجا گیا' لیکن معینہ مدت سے

Tooba Girls College

Registered & Recognised by the BISE Lahore

TOOBA GIRLS COLLEGE TGC

For Intermediate and B.A Classes

- F.A (Arts Group)
- F.A (General Science)
- ICS (Maths+Stats+Comp. Sci.)
- B.A (Eco.+Maths & Other Combinations)

- Elegant College Building
- Modern Computing Facility
- Library Facility
- Indoor & Outdoor Games
- Pick & Drop Service
- Qualified and Experienced Teaching Staff
- Equipped with Modern Educational Tools
- Emphasis on Islamic Education & Training
- Compulsory Computer Education without Additional Fees

Scholarships for intelligent & deserving students

An Educational Project of
Iqtedar Ahmad Welfare Trust(Regd.)

78-Sector A-1, Township Lahore. Ph: 5114581

1925ء: کوہاٹ میں ہندو مسلم فسادات کے بعد گاندھی جی نے ایک طویل بیان شائع کیا: ''میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہر ہندو بزدل ہوتا ہے اور ہر مسلمان فسادی''۔

پہلے نامعلوم وجوہ کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔ جیل سے باہر نکلا تو اس نے شدھی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو بالخصوص نومسلموں کو دوبارہ ہندو مذہب میں (جو کبھی تبلیغی مذہب نہیں رہا تھا) داخل کر لیا جائے۔ بظاہر اس تحریک کے دو مقصد تھے۔ پہلے تو یہ اس طریقے سے ہندوستان میں مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اور اگر یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب نہ ہو تو ہندو اکثریت اتنی غالب ہو جائے کہ مسلمان اقلیت کی آواز' مغربی جمہوری نظام کے ماتحت' مکمل طور پر دبا دی جائے۔

ان ہندو تحریکوں کی کامیابی یا ناکامی تو اپنی جگہ پر رہی۔ اس سے ہندوؤں کا بگاڑ بہت زیادہ بڑھا' جو کئی مقامات پر' جہاں آریہ سماج پرچارک مسلمان عورتوں اور بچوں کو اپنے اثر سے ورغلا کر ہندو بنا لیا کرتے تھے' ہندو مسلم فسادات کا سبب بنا۔ اس دور میں ہندو قوم کا سب سے بااثر لیڈر' اردو زبان کا جانی دشمن اور ہندو یونیورسٹی بنارس کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھا۔ وہ کھلم کھلا ہندوؤں سے کہا کرتا تھا کہ تمہیں اپنے تاریخی دشمن (یعنی مسلمان) سے نمٹنا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو مقابلے کے لئے تیار کرو۔ اکھاڑوں میں جا کر ورزش کرو۔ جسمانی صحت کو بہتر بناؤ۔ دست بدست لڑائی کا فن سیکھو' تاکہ وقت پر اپنی اور عورتوں کی حفاظت کر سکو۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ تاریخی طور پر ہندوؤں کی نااتفاقی ان کی غلامی کا سبب بنی ہے۔ ہندوؤں کی آئندہ کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ان کے باہمی اختلافات ہمیشہ کے لئے ختم کر دیئے جائیں۔ اس اتحاد کی تحریک کو سنگھٹن کہا جاتا ہے۔ اس کا نشانہ صرف مسلمان تھے۔

اس کے علاوہ پنڈت مالویہ ''ہندو مہا سبھا'' کا بانی بھی تھا۔ پہلے پہل یہ جماعت اپنے آپ کو غیر سیاسی کہتی تھی' لیکن جلد ہی سیاست کے میدان میں کود پڑی اور اس نے جداگانہ انتخاب کی سرتوڑ مخالفت شروع کر دی۔ مسلمان جداگانہ انتخاب کو اپنے قومی تشخص اور وجود کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ہندو مہا سبھا کے اقدامات سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافقت کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی۔ 1925ء' 1926ء اور 1927ء میں ہندو مہا سبھا کے پلیٹ فارم پر ہونے والی تقریروں میں اس قسم کے خیالات ظاہر کئے گئے تھے:

مسلمان باہر سے آئے تھے۔ یہاں یہ ایک غیر قوم ہیں۔ ہندوستان کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں۔ اگر وہ ہندوستان کو چھوڑنا چاہیں تو خوشی سے اپنی راہ لیں۔ اگر یہاں رہنا ہے تو ہندو بن جائیں اور ہندو معاشرے میں اپنے آپ کو جذب کر لیں۔ ورنہ ان کا وہی حشر ہوگا جو چند سو سال پہلے سپین میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔ حکومت مسلمانوں پر متواتر مہربانیاں کرتی جاتی ہے' جو مراعات ان کو دی جاتی ہیں' اس سے ہندوؤں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے لئے لازمی ہے کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے گٹھ جوڑ کے خطرناک نتائج سے خبردار رہیں''۔

کانگریس اور سوراجی گروپ

خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے خاتمے پر کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک طبقہ تو عدم تعاون کے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہا۔ دوسرا طبقہ اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ ختم کر دیا جائے۔ کونسلوں کے اندر جا کر پارلیمانی حربوں سے کام لیتے ہوئے حکومت کی تدبیروں کو ناکمل العمل بنا دیا جائے۔ دونوں فریقوں کے جھگڑوں نے طول پکڑا۔ بالآخر مولانا محمد علی کی کوششوں سے ان کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا' جس کی رو سے بعض شرائط کے تحت کانگریسیوں کو انتخابات لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ کونسلوں کے اندر پہنچنے والے کانگریسی ''سوراجی'' کہلاتے تھے اور ان کے سب سے اہم لیڈر پنڈت موتی لال نہرو تھے جو مرکزی اسمبلی میں سوراجیہ پارٹی کے قائد تھے۔ بنگال اور سی پی میں سوراجیوں نے اپنی جارحانہ تنقیدوں سے ہر محاذ پر شکست دی۔

فسادات کی ذمہ داری

فرقہ وارانہ فسادات بار بار ہوتے۔ ہر فساد کے بعد انتقام کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ انتقام سے انتقام کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہندو مہا سبھا کے رہنما کھلم کھلا فسادات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ فساد برپا کرنے اور ان کو طول دینے سے ہندو نوجوانوں کو بہت سی کارآمد تربیت ملتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود تو ہندو ہر وقت فسادات کی تیاریوں میں مصروف رہتے یا فساد برپا کرنے کے لئے شوشے چھوڑتے رہتے' مگر جب فساد پھوٹ پڑتا تو اس کا سارا الزام مسلمانوں پر دھرتے اور مسلمان رہنماؤں سے مطالبہ کرتے کہ فسادیوں کی مذمت کرتے۔ جب فسادات میں ہندوؤں کی زیادتی ثابت ہو جاتی تو منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتے۔ 1925ء میں کوہاٹ میں ہندوؤں کی طرف سے ایک دل آزار نظم شائع کی گئی اور ایک خوں ریز فساد ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر گاندھی نے ایک طویل بیان شائع کیا: ''میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہر ہندو بزدل ہوتا ہے اور ہر مسلمان فسادی۔ اگر ایک فریق دنگئی ہو تو دوسرا لازمی طور پر بزدل ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں گاندھی جی نے فسادات کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ اور ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ اپنی بزدلی چھوڑ دو اور مقابلے پر آ جاؤ۔ گاندھی کی اس منطق سے بہت سے مسلمانوں کی خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ مولانا محمد علی جو گاندھی کی مہاتمائیت کا راگ الاپتے نہ تھکتے تھے' گاندھی سے کھٹک گئے۔

ہندو مہا سبھا' کانگریس اور جداگانہ انتخاب

1926ء کے اواخر میں ہونے والے عام انتخابات میں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد کانگریس ہندو مہا سبھا کی باندی بن گئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کا اثر رسوخ کم ہوا۔ کانگریسی ارکان سمیت اسمبلی کے تمام ہندو ارکان نے پنڈت مالویہ کی قیادت قبول کر لی۔ جو بات آج ہندو مہا سبھا کے لیڈر کہہ دیتے' کل کو کانگریس والے بھی بے سوچے سمجھے دہرا دیتے۔ اس سے کانگریس بدترین قسم کی فرقہ پرستی کی دلدل میں پھنس گئی۔ ہندو مہا سبھا نے جداگانہ انتخابات کے خلاف جس غوغا آرائی کا بندوبست کیا تھا۔ کانگریس بھی اس میں شریک ہو گئی۔ انہی دنوں برطانوی لیبر پارٹی کی حکومت کے ایک اہم رکن نے مدراس کے سوراجی سیتا مورتی کے نام اپنے ایک ذاتی خط میں جداگانہ طریق انتخاب کی پُرزور مذمت کی اور بتایا کہ یہ طریق برطانوی طرزِ فکر و عمل کے خلاف ہے۔ اس حوصلہ افزائی سے جداگانہ انتخاب کے مخالفوں نے اپنی مہم کو اور بھی تیز کر دیا۔ اسی نسبت سے مسلمانوں کو اور بھی تشویش ہوئی۔ ہر چند کہ برطانوی حکومت کا سرکاری موقف یہی تھا کہ جتنی دیر تک مسلمان جداگانہ انتخاب کی ضرورت محسوس کرتے رہیں گے' اتنی دیر تک ان کی آئینی حیثیت برقرار رہے گی' لیکن تقسیم بنگال کی منسوخی سے ثابت ہو چکا تھا کہ انگریز حکمرانوں کے وعدوں پر اعتبار کرنا کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا۔ کانگریس کے لیڈروں نے کم و بیش تیس چالیس سال سے برطانیہ کے بااثر حلقوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور ان کو ہندوستان کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ کانگریس والوں کا مقصد ہندوستان کے متعلق انگریزوں کو صحیح خبریں فراہم کرنا نہ تھا' بلکہ اپنے نقطۂ نظر کی اشاعت مقصود تھی۔ ان خبر ناموں میں مسلمانوں کے متعلق غلط خبریں' سفید جھوٹ اور نصف سچ ملا جلا کر پیش کیا جاتا تھا۔ 1922ء کے بعد کانگریسی لیڈروں نے ہر سال موسم گرما میں برطانیہ کے دورے شروع کئے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ مرکزی اسمبلی کے صدر وی جے پٹیل (جن کو اپنے عہدے کے تقاضے سے

سیاسی دھڑے بندیوں سے پرے پرے رہنا چاہئے تھا) 1927ء میں صرف اس لئے انگلستان گئے تھے کہ برطانوی حکومت کو کانگریس کا یہ پیغام دیں کہ اگر آئینی کمیشن میں گاندھی کو مقرر کر دیا جائے تو سب معاملات خود بخود سلجھ جائیں گے۔

دہلی مسلم تجاویز (1927ء)

روز افزوں شکوک وشبہات کو دیکھتے ہوئے دونوں قوموں کے رہنماؤں نے باہمی مفاہمت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ مسلم لیگ جو تحریک خلافت اور سول نافرمانی کے دوران پس منظر میں چلی گئی تھی' ایک بار پھر میدانِ عمل میں آئی اور اس کے لیڈروں نے 1924ء اور 1926ء کے سالانہ اجلاسوں میں فرقہ واریت کی تباہ کاریوں کا جائزہ لینے کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت پر زور دیا۔ اسی دوران ملک میں امن وامان کو فروغ دینے اور دونوں قوموں میں بہتر تعلقات قائم کرنے کی غرض سے کئی کانفرنسیں ہوئیں' لیکن ان سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہ ہو سکا۔ بالآخر چند ممتاز مسلم رہنماؤں نے قدم اٹھایا اور 20 مارچ 1927ء کو دہلی میں ایک اجلاس محمد علی جناح کی صدارت میں منعقد کیا۔ اجلاس میں ملک کی داخلی صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور کافی بحث وتمحیص کے بعد جو فیصلے ہوئے' انہیں ''دہلی مسلم تجاویز'' کا نام دیا گیا۔ ان فیصلوں کے ذریعے مسلمانوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایثار وقربانی کی جو مثال پیش کی' وہ ان کی نیک نیتی اور خلوص کا بہترین ثبوت تھی۔ اجلاس میں طے پایا کہ:

مسلمان جداگانہ طریق انتخاب کے حق سے دستبردار ہوتے ہیں' بشرطیکہ

(1) سندھ کو بمبئی سے جدا کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔

(2) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں اور انہیں بھی ملک کے دوسرے صوبوں کی طرح مکمل صوبائی درجہ دیا جائے۔

(3) اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو جو مراعات اور تحفظات حاصل ہوں گے' وہی مراعات اور تحفظات صوبہ سرحد' بلوچستان اور سندھ میں ہندوؤں کو بھی دیئے جائیں گے۔ ان مراعات اور تحفظات کا تعین خصوصی کمیٹیاں کریں گی جو دونوں قوموں کے باہمی صلاح مشورے سے بنائی جائیں گی۔

(4) صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال میں آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے گی' البتہ انتخابات مخلوط ہوں گے۔

(5) مرکز میں مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد ایک تہائی سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ مرکزی مقننہ کے انتخابات بھی نشستوں کے تحفظ کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مخلوط بنیادوں پر ہوں گے۔

(6) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے گی۔

گفت وشنید کے بعد ان تجاویز کی بنیاد پر کسی قسم کا ہندو مسلم سمجھوتہ ہو سکتا تھا۔ خود کانگریس نے ان تجاویز کو (Compromise) کا نام دیتے ہوئے' دو دفعہ قبول کر لیا' لیکن بعد میں اپنے وعدے سے منحرف ہوگئی۔

سائمن کمیشن (نومبر 1927ء)

نومبر 1927ء میں برطانیہ نے اپنے گزشتہ فیصلے کے مطابق ہندوستان کے دستوری معاملات کی چھان بین کے لئے ایک نیا کمیشن مقرر کیا جو اپنے صدر کے نام کی رعایت سے سائمن کمیشن کہلایا۔ اس کا تقرر کرنے والوں نے کمیشن کے ذمے یہ فرض لگایا تھا کہ 1919ء کے آئین کے عملی پہلوؤں کا جائزہ لے اور ہندوستان کے لئے حکومت خود اختیاری کی اگلی قسط کے لئے سفارشات مرتب کرے۔ حکومت برطانیہ نے اس کمیشن کا انتخاب کرتے وقت یہ فاش غلطی کی کہ کسی ہندو یا مسلمان کو اس میں شامل نہ کیا۔ اس میں صرف انگریز افسروں کو شامل کیا۔ اس پر ایک ہنگامہ ہو گیا اور کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا نعرہ لگایا گیا۔ بہت سی سیاسی پارٹیاں بائیکاٹ کرنے کے موقف سے متفق تھیں۔ خود مسلم لیگ کے اندر دو دھڑے بن گئے۔ ایک تو اس بات کا حامی تھا کہ کمیشن سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس کے سربراہ محمد علی جناح تھے۔ دوسرا گروہ میاں محمد شفیع کی قیادت میں اصرار کرتا تھا کہ کمیشن کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کا کیس مناسب طریقے سے کمیشن کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ اختلافات طے نہ ہو سکے۔ 1927ء کے آخر میں مسلم لیگ کے جناح گروپ کا اجلاس کلکتہ میں اور دوسرے فریق کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی کا

رجوع الی القرآن کورس

☆ یہ کورس بنیادی طور پر گریجوایٹس اور پوسٹ گریجوایٹس کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ پیش نظر یہ ہے کہ وہ حضرات جو کم از کم گریجوایشن کی سطح تک اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور اب بنیادی دینی تعلیم بالخصوص عربی زبان سیکھ کر فہم قرآن کے حصول کے خواہش مند ہوں' انہیں اس کورس کے ذریعے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کر دی جائے —— تاہم بعض استثنائی صورتوں میں ایف اے کی بنیاد پر بھی اس کورس میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

☆ کورس کا دورانیہ نو ماہ ہے۔

کورس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

عربی صرف ونحو ۞ ترجمۂ قرآن (تقریباً پانچ پارے) ۞ آیات قرآنی کی صرفی و نحوی تحلیل (تقریباً دو پارے) ۞ قرآن حکیم کی فکری وعملی رہنمائی (منتخب دروسِ قرآن) ۞ تجوید وحفظ ۞ مطالعۂ حدیث ۞ اصطلاحاتِ حدیث ۞ اضافی محاضرات

ناظم برائے رجوع الی القرآن کورس

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور (فون: 03-5869501)

courses@tanzeem.org

عالم اسلام کے عظیم مفکر و مفسر

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و بانی تنظیم اسلامی پاکستان

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تقاریر و تراجم کی آڈیو ویڈیو کیسٹس اور وی سی ڈیز نیز کتب جو کہ اسلام کے حرکی تصور کو پیش کرتی ہیں اور اسلامی انقلاب کے سنگ ہائے میل کی نشاندہی کرتی ہیں، پاکستان میں مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہیں:

NATIONWIDE OFFICES

LAHORE :Markazi Anjuman Khuddam-ul-Quran,Quran Academy 36-K, Model Town, Lahore.
Ph :(042) 5869501-03 Fax: (042)5834000 E-mail: anjuman@tanzeem.org
☆ Markaz Tanzeem-e-Islami 67-A, Allama Iqbal Road, Garhee Shahoo, Lahore.
Ph: (042) 6366638 - 6316638 Fax: (042) 6305110 E-mail: markazi@tanzeem.org

KARACHI:Tanzeem-e-Islami.Haq Square, First Floor, University Road, Gulshan-e-Iqbal, Karachi.
Phone No: (021) 4993464-5 Fax No: (021) 4985647 E-mail: sind@tanzeem.org
☆ Anjuman Khuddam-ul-Quran Sind Quran Academy, DM-55 Darakhshan, Khiyaban-e-Rahat, Phase 6, Defence, Karachi. Phone No: (021) 5340022 - 23 Fax No: (021) 5840009
E-mail: karachi@quranacademy.com

QUETTA : Tanzeem-e-Islami, 28 Syed Building,Opp. Public Health School,Jinnah Road Quetta,
Phone No: (081) 842969 E-mail: quetta@tanzeem.org

ISLAMABAD: Anjuman Khuddam-ul-Quran Islamabad Civic Center, Melody Market, Block No.3,Shop No.11, Islamabad Phone No: (051) 2877046 E-mail: grghazi@hotmail.com
Tanzeem-e-Islami House No: 20, Street No 1, Faizabad Housing Scheme Near Fly-Over Bridge, I-8/4 Islamabad Phone No: (051) 4434438 Fax: No: (051) 4435430 E-mail: islamabad@ tanzeem.org

PESHAWAR:Tanzeem-e-Islami 18-A, Nasir Mansion, Shuba Bazar,Railway Road No.2, Peshawar
Phone & Fax: No: (091) 214495 E-mail: peshawar@tanzeem.org

NOWSHERA:Tanzeem-e-Islami,Office No 4, Second Floor, Cantonment,Plaza, Near General Bus Stand,Phone No: (0923) 610250 Fax No: (0923) 613532 E-mail: nowshera@tanzeem.org

MULTAN:Anjuman Khuddam-ul-Quran Multan, Quran Academy, 25, Officers Colony, Multan
Phone & Fax No: (061) 520451 E-mail: multan@tanzeem.org

FAISALABAD: Tanzeem-e-Islami,157-P, Sadiq Market, Railway Road, Faisalabad
Phone & Fax: No: (041) 624290 E-mail: faisalabad@tanzeem.org
☆ Anjuman Khuddam-ul-Quran Faisalabad,Quran Academy Road, Saeed Colony No.2,Faisalabad
Phone No: (041) 728222

SUKKUR:Tanzeem-e-Islami,7-A, Professors Housing Society,Shikarpur Road, Sukkur,Phone No: (071) 31074

SARGODHA :Anjuman Khuddam-ul-Quran Sargodha,Masjid Jame-ul-Quran,Main Road, Satellite Town, Sargodha Phone No: (0451) 221561 - 714654 Fax: (0451) 214042

JHANG:Tanzeem-e-Islami,House No B-X11-1088/1,Mohallah Chaman Pura, Jhang Sadar
Phone No: (0471) 620637 Fax: No: (0471) 614220 E-mail: jhang@tanzeem.org

GUJRAT:Tanzeem-e-Islami,Jalalpur Jattan Road, Masjid Taqwa,Near Civil Lines Thana,Gujrat City.
Phone No: (04331) 223604 Fax: No. 235708 E-mail: gujrat@tanzeem.org

SIALKOT:Malik Tanveer-ul-Haq,Modern Book Depot, Sialkot Cantt.Phone No: (0432) 261184 - 272829

AZAD KASHMIR: Tanzeem-e-Islami Bagh, Zulfiqar Hardware Dhali road, Bagh Ph(058720) 42213

آل پارٹیز کانفرنس

یہ کشاکش جاری تھی کہ برطانیہ کے وزیر ہند لارڈ برکن نے دارالامراء میں تند اور تلخ لہجے میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات ازلی اور ابدی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کسی مرحلے پر کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ ہمارے متعلق اتنی بدگمانی رکھتے ہیں تو وہ خود اپنے متفقہ دستور بنا کر ہمارے سامنے لائیں۔ ہم اس کو بلا توقف قبول کر لیں گے۔ کانگریس کے لیڈر اس پر بہت تلملائے اور 1927ء کے اواخر میں انہوں نے مدراس کے سالانہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ وزیر ہند کے چیلنج کا جواب دیا جائے اور اسے ایک متفقہ دستور کا تحفہ پیش کیا جائے۔ اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے ایک طریق کار بھی طے کیا گیا جس میں گاندھی اور موتی لال نہرو نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ ''دہلی مسلم تجاویز'' کو مسترد کر کے نئے آئین کا خاکہ تیار کیا جائے۔ اس نکتے پر اُن کو ہندو مہاسبھا کی سو فی صد حمایت کا یقین تھا۔ لیکن ''آل پارٹیز کانفرنس'' کے لبادے میں ہندو جماعتوں کا محاذ بنا' جس نے دستوری تجاویز مرتب کرنے کے لئے موتی لال نہرو کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔

نہرو رپورٹ (اگست 1928ء)

نہرو کمیٹی کی رپورٹ مسلمانوں کے خلاف یک طرفہ ڈگری تھی۔ اس کی سفارشات کی شکل وصورت کچھ یوں تھی:

جداگانہ انتخاب: نامنظور
پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت: نامنظور
وفاقی حکومت: نامنظور
مرکز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی: نامنظور
سندھ کی بمبئی سے علیحدگی: ہاں نہیں' اگر مگر

مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح دونوں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے وقت ملک سے باہر تھے۔ چنانچہ کانگریسی رہنماؤں نے ان کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 28 اگست 1928ء کو لکھنو میں مختلف جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کانفرنس منعقد کی' جس میں ''نہرو رپورٹ'' کو منظوری کے لئے پیش کر دیا گیا۔ چونکہ اس کانفرنس میں ہندو مندوبین کی اکثریت تھی' لہٰذا بلا ترمیم و تنسیخ نہرو رپورٹ کی منظوری دے دی گئی۔ جناح صاحب کو جب ان واقعات کی تفصیل معلوم ہوئی تو وہ فوراً انگلستان سے روانہ ہوئے اور 26 اکتوبر کو بحری جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچے اور اپنے رفقاء سے تبادلۂ خیال کئے بغیر' اس نازک مسئلے پر کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔ چنانچہ بمبئی میں اخباری نمائندوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے محتاط انداز میں صرف یہ کہا: ''آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر ہونے کے باوجود میں لیگ کے فیصلوں کا قبل از وقت اندازہ نہیں لگا سکتا۔ حسب معمول کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دسمبر میں ہوں گے اور مجھے توقع ہے کہ اس نازک مسئلے کا حل تلاش کر لیں گے''۔

آل پارٹیز کنونشن، کلکتہ

کانگریسی رہنما اور اُن کے ہم خیال دوسرے زعماء نے مسلمانوں کے ردعمل کو نظر انداز کرتے ہوئے 26 دسمبر 1928ء کو کلکتہ میں ''آل پارٹیز کنونشن'' بلانے کا فیصلہ کیا' تاکہ مجوزہ دستوری خاکے کی منظوری حاصل کی جائے۔ کنونشن میں صرف دو مسلم جماعتوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ مولانا محمد علی جوہر اپنی ''خلافت کمیٹی'' اور محمد علی جناح مسلم لیگ کے وفد کی قیادت کرتے تھے۔ دونوں نے باری باری ''نہرو رپورٹ'' میں چند معتدل ترمیمیں پیش کیں' تاکہ اُن کو ''دہلی مسلم تجاویز'' سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔ مجوزہ ترامیم میں سے چند اہم ترامیم یہ تھیں:

(1) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستوں کا تحفظ۔

(2) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے صوبائی اسمبلی میں نمائندگی۔

(3) ماقی اختیارات صوبوں کو منتقل کرنا۔

آل پارٹیز کنونشن کی ایک سب کمیٹی نے مسلمانوں کی پیش کردہ ترامیم کا جائزہ لینے کے بعد انہیں مسترد کرنے کی سفارش کی۔ جناح صاحب پھر بھی مایوس نہ ہوئے' بلکہ کنونشن میں مسلمانوں کے مطالبات دوبارہ پیش کرنے کا فیصلہ کیا اس موقع پر اُن کی تقریر اُن کی زندگی کی بہترین تقریروں میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے نہایت سچے تلے اور جذبات میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں ملک کے مستقبل کا واسطہ دیتے ہوئے' اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت پر زور دیا' لیکن کنونشن کے دوسرے ارکان نے اس پر توجہ نہ دی اور جناح صاحب کی انتہائی مثبت اور مدلل تقریر صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

مسٹر گاندھی اس موقع پر نہایت ہوشیاری سے اپنی سیاسی گٹھ جوڑ کی صلاحیت کو کچھ اس طرح بروئے کار لائے کہ کئی مسلم نمائندے بھی مجوزہ دستوری خاکے کے حق میں رائے دینے پر رضامند ہو گئے۔ مسلم زعما میں مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر ایم اے انصاری' ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور راجہ محمود آباد تو پہلے ہی ''نہرو رپورٹ'' کے حق میں تھے۔ خلافت کمیٹی کے چند ارکان جن میں مولانا ظفر علی خان' مولانا محمد اکرم' شرف الدین چودھری' اور اے کے فضل الحق شامل تھے' اس رپورٹ کی حمایت پر مائل ہو گئے۔ مسٹر گاندھی نے پس پردہ زمین ہموار کرنے کے بعد جب ''نہرو رپورٹ'' منظوری کے لئے پیش کی تو کنونشن کے مندوبین کی بھاری اکثریت نے اس کے حق میں رائے دی۔ البتہ مسلم لیگی ارکان نے مخالفت کی۔

اس موقع پر مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کے خلاف ایک اور چال چلی' اور مسلم مندوبین میں پھوٹ ڈالنے کے بعد سکھوں اور مسلمانوں میں بھی افتراق پیدا کرنے کے لئے اپنی تقریر کے دوران نہایت بھولے پن سے کہا: ''میں تو مسلمانوں کے مطالبات کے حق میں بات کرتا' لیکن سکھوں کے اعتراضات کو دیکھتے ہوئے ایسا نہیں کر سکتا' کیونکہ سکھ پنجاب میں مسلمانوں کی پارلیمانی اکثریت کے حق میں نہیں''۔ اس طرح مسٹر گاندھی نے ایک طرف سکھوں کی ہمدردیاں حاصل کر لیں' جن سے اُس نے آئندہ کئی موقعوں پر بے شمار سیاسی فائدے اٹھائے اور دوسری طرف مسلمانوں اور سکھوں کو ایک سطح پر کھڑا کر کے مسلمانوں کی تحقیر اور سکھوں کو اُن کی عددی حیثیت سے کہیں زیادہ اہمیت دی۔

جناح صاحب کلکتہ کنونشن کے طریق کار' بعض رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشی' ہندو لیڈروں کی تنگ نظری اور ''نہرو رپورٹ'' کی منظوری سے بہت مایوس ہوئے۔ انہیں مسلمانوں سے ہونے والی ناانصافی کا خصوصاً بہت دکھ تھا' اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے انہوں نے جو شبانہ روز کوششیں کی تھیں' ان کی ناکامی سے وہ بہت دل آزردہ تھے۔ چنانچہ اجلاس کے بعد جب وہ کلکتہ سے روانہ ہونے لگے تو اپنے ایک پارسی دوست مسٹر جمشید نوشیروان سے کنونشن کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے' نہایت افسوس کے ساتھ کہا: ''اب ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں''۔

چودہ نکات (1929ء)

نہرو رپورٹ کا ایک خوش آئند پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی منتشر صفوں میں مکمل اتحاد کی ضرورت محسوس کی۔ اس زمانے میں' جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان

1929ء: کانگریس کے الٹی میٹم کی میعاد ختم ہونے پر لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آزادیٔ کامل کی قرارداد منظور کی اور سول نافرمانی کی دھمکی دی۔

ہوا' آل انڈیا مسلم لیگ دو مخالف دھڑوں یعنی جناح لیگ اور شفیع لیگ میں بٹی ہوئی تھی۔ جناح صاحب نے لیگ کو متحد کرنے کی جانب قدم اٹھایا اور مارچ 1929ء میں لیگ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ اس اجلاس میں جناح صاحب نے ''چودہ نکات'' پیش کئے جو بعد میں جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے۔ مسلم لیگ نے ان نکات کو منظور کر کے یہ اعلان جاری کیا:

''مسلم لیگ کافی غور و خوض کے بعد' عزم و خلوص کے ساتھ یہ اعلان کرتی ہے کہ حکومتِ ہند کے آئندہ دستور کے سلسلے میں کوئی ایسا منصوبہ مسلمانانِ ہند کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا' جس میں مندرجۂ ذیل بنیادی اصولوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے' اور اُن کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے انہیں دستور کا جزو نہ بنایا جائے:

(1) آئندہ دستور وفاقی طرز کا ہو' جس میں تمام غیر معینہ امور صوبوں کو سونپے جائیں۔

(2) تمام صوبوں کو مکمل خودمختاری حاصل ہو اور انہیں یکساں اختیارات حاصل ہوں۔

(3) ملک کی تمام اسمبلیوں اور نیابتی اداروں میں اقلیتوں کو موثر نمائندگی دی جائے' اور کسی قوم کی اکثریت کو اقلیت یا برابری میں تبدیل نہ کیا جائے۔

(4) مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو کم از کم ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

(5) جداگانہ انتخاب کا طریق جاری رہے اور اگر کوئی قوم اپنی مرضی سے مخلوط انتخاب کو پسند کرے تو اسے اس کی اجازت دی جائے۔

(6) اگر کسی وقت صوبوں کی حدود کا از سرِ نو تعین کیا جائے تو یہ تبدیلی بنگال' پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی اکثریت پر اثر انداز نہ ہو۔

(7) تمام قوموں کو مکمل مذہبی آزادی' آزادیٔ ضمیر' آزادیٔ عبادت و رسومات' آزادیٔ تعلیم و تبلیغ اور آزادیٔ اجتماع کی ضمانت دی جائے۔

(8) کوئی بل' قرارداد یا تحریک کسی بھی قانون ساز اور انتخابی ادارہ میں پیش نہ کی جائے' اگر اس بل سے متاثرہ قوم کے تین چوتھائی ارکان اس کی مخالفت کریں۔

(9) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے جداگانہ صوبہ کی حیثیت دی جائے۔

(10) دیگر صوبوں کی مانند سرحد اور بلوچستان میں بھی آئینی اصلاحات جاری کی جائیں۔

(11) مسلمانوں کو بشرطِ قابلیت سرکاری اور خودمختار اداروں میں دیگر ہندوستانیوں کے پہلو بہ پہلو ملازمتیں دی جائیں۔

(12) دستور میں ایسے تحفظات رکھے جائیں جن سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہو سکے اور مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی ہو اور ان کی زبان' خانگی قوانین اور اوقاف کا تحفظ ہو سکے۔

(13) مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے اور ان کی شمولیت کے بغیر کوئی بھی کابینہ ترتیب نہ دی جائے۔

(14) دستور میں اس وقت تک کوئی تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے۔ جب تک وفاق میں شامل تمام صوبے اور ریاستیں اس ترمیم یا تبدیلی کی منظوری نہ دے دیں۔

گاندھی نے چودہ نکات کے مرتب کئے جانے سے قبل قائداعظم سے کہا تھا کہ میں آپ کو اپنا دستخطی چیک دیتا ہوں جتنی رقم آپ چاہیں خود بھر لیں۔ اس سے گاندھی کی مراد یہ تھی کہ قائداعظم جو بھی تجاویز پیش کریں گے، وہ اسے کانگریس سے منظور کروالے گا۔ لیکن قائداعظم نے جب گاندھی کو اپنے چودہ نکات پیش کئے کہ ان کو کانگریس سے منظور کروالو تو اس نے کہا کہ میں ذاتی حیثیت سے تو ہر چیز ماننے کو تیار ہوں لیکن کانگریس کی منظوری کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

قائداعظم کے پیش کردہ ''چودہ نکات'' مسلم قوم کے جذبات اور مطالبات کے بہترین عکاس تھے مگر کانگریس نے اس مرتبہ بھی ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کے ان مطالبات کو بھی حسب سابق کوئی اہمیت نہ دی اور ان کی مخالفت پر کمربستہ ہوگئی۔ ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر مونجے نے چودہ نکات کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس نے 7 نومبر 1929ء کو آندھرا میں ہندو مہاسبھا کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے چودہ نکات کو ہندوستانی نیشنلزم کی روح کے منافی قرار دیا۔ اس نے سندھ کے علیحدہ صوبہ بنائے جانے کو عیاشی کا نام دیا اور چودہ نکات کو اس بناء پر مسترد کر دیا کہ ان سے ہندوستان کی وحدت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مونجے نے چودہ نکات کو فرقہ وارانہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''یہ کہنا کافی ہوگا کہ جس نظریہ نے ان نکات کو جنم دیا ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے جس سے ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔ میری رائے میں ہندوؤں کو کسی بھی صورت میں فرقہ واریت کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے اور مسلمانوں کو یہ یقین دلانا چاہئے کہ ہندو کسی بھی صورت اور شکل میں ان پر کسی قسم کا کوئی جبر نہیں کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں کو ملک کے آئین میں فرقہ واریت کے اجراء کی سختی سے مخالفت کرنی چاہئے۔ جو کہ نہرو رپورٹ میں پہلے ہی جنم لے چکی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے چودہ نکات کے بارے میں 27 ستمبر 1931ء کو ایک خط میں گاندھی کو لکھا کہ ''اگر مجھے اپنے دوست مسٹر جناح کی چودہ نکات سے متعلق بکواس ہی کو سننا ہے تو میں کسی جزیرے میں جانا پسند کروں گا جہاں ایسے لوگوں سے ملنے کی امید ہوگی جو یا تو اس قدر سمجھدار ہوں گے یا محض جاہل مطلق کہ وہ ''چودہ نکات'' سے متعلق گفتگو نہیں کریں گے۔ مجھے تمہارے صبر پر تعجب ہے''۔

پنڈت نہرو کے اس خط سے یہ واضح ہے کہ ہندوؤں نے ابتدا ہی سے مسلمانوں کے مطالبات اور خواہشات کے متعلق بے حد غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کئے رکھا۔ جداگانہ انتخاب' دہلی مسلم تجاویز' نہرو رپورٹ اور اب ''چودہ نکات'' کے بارے میں ہندوؤں کا رویہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ہر معاملے میں مسلمانوں پر اپنی مرضی ٹھونسنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے ان لوگوں کے لئے بھی سبق ہے' جو یہ کہتے ہیں کہ ہندو کے ساتھ سمجھوتہ ممکن تھا یا ممکن ہے۔

گول میز کانفرنس کا انعقاد

کلکتہ کنونشن کے فوراً بعد کلکتہ شہر ہی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں حکومت کو الٹی میٹم دیا گیا کہ ایک سال کے اندر اندر ''نہرو رپورٹ'' کو قبول کر لیا جائے' یعنی برطانیہ کے زیرِ سایہ ہندوستان کی حکومت ہندو اکثریت کے سپرد کر دی جائے' ورنہ حکومت سول نافرمانی کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ الٹی میٹم کی میعاد 1929ء کے اواخر میں ختم ہوگئی۔ اس موقع پر کانگریس کے اجلاس نے جو لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ہو رہا تھا ''آزادی کامل'' کی قرارداد منظور کی اور مارچ 1930ء میں گاندھی کی سرکردگی میں ملک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سول نافرمانی کی ابتدا کر دی۔ جلد ہی یہ تحریک تشدد اور خون ریزی میں شریک ہوگئی اور اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چونکہ کانگریس کئی مرتبہ مسلمانوں کے مطالبات سے بے زاری کا اظہار کر چکی

تھی' مسلمان اس تحریک سے بحیثیت مجموعی علیحدہ رہے۔

پہلی گول میز کانفرنس (1930ء)

اس ماحول میں سائمن کمیشن کی رپورٹ جون 1930ء میں شائع ہوئی۔ مختلف وجوہ سے اس کی سفارشات' ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے ناقابل قبول تھیں۔ بعض لوگوں کو سائمن کمیشن کے نام ہی سے وحشت تھی۔ برطانیہ کے وزیراعظم نے اعلان کیا کہ تمام دستوری معاملات پر از سرِ نو غور کرنے کے لئے جلد ہی مختلف قوموں اور برطانوی حکومت کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس لندن میں بلائی جائے گی۔

پہلی گول میز کانگرس لندن میں نومبر 1930ء میں ہوئی۔ اس میں کانگریسی لیڈر سول نافرمانی کے دوران گرفتار ہونے کے باعث شامل نہ ہو سکے۔ البتہ مہاسبھا کے نمائندوں کے علاوہ کئی ممتاز ہندو رہنماؤں نے شرکت کی' جن میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر نمایاں تھے۔ مسلمانوں کے وفد کی قیادت سر آغا خان نے کی۔ اس وفد میں مولانا محمد علی جوہر' محمد علی جناح' سر محمد شفیع' مولوی فضل الحق' سر ظفر اللہ خان' ڈاکٹر شفاعت احمد اور نواب چھتاری شامل تھے۔ مسلمانوں کے وفد نے ہم آہنگی' یک جہتی اور فہم و فراست کا مظاہرہ کیا۔

کانفرنس میں کئی اہم مسائل خوش اسلوبی سے طے پا گئے' جن میں وفاقی طرزِ حکومت کا قیام' وفاق میں ریاستوں کی شمولیت' ہندوستان کے لئے دولتِ مشترکہ میں ڈومینین کا درجہ' اور مرکز میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے معاملات شامل تھے۔ کانفرنس کے شرکاء نے مستقبل کے آئین کے مسئلے پر بھی تفصیلی غور و خوض کیا اور آئندہ دستور کے بنیادی اصول اور اہم نکات کا جائزہ لینے کے لئے آٹھ ذیلی کمیٹیاں مقرر کیں' جن کو حسب ذیل امور پر سفارشات مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

1۔ وفاق کی ہیئت — 2۔ صوبائی حکومت کے دستور
3۔ حق رائے دہی کا نظام — 4۔ سندھ کی علیحدگی
5۔ صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات — 6۔ دفاع
7۔ اقلیتوں کے مسائل — 8۔ فرقہ وارانہ مسائل کا حل

اجلاس کے دوران ہندو مہاسبھا کے نمائندوں نے فرقہ وارانہ مسائل کے حل پر نہایت سخت رویہ اختیار کیا اور افہام و تفہیم کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ چنانچہ اس اہم معاملے میں کسی قسم کا فیصلہ کئے بغیر 19 جنوری 1931ء کو کانفرنس کا پہلا اجلاس ختم ہوگیا۔ برطانوی وزیراعظم مسٹر میکڈانلڈ نے کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مندوبین کو بتایا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا تہیہ کر چکی ہے' جن کے تحت مرکز اور صوبوں میں ذمہ دار حکومتوں کے قیام کی تجویز سر فہرست ہے، البتہ فی الحال دوعملی (Dyarchy) کو یکسر ختم کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ برطانوی وزیراعظم نے کانگریسی نمائندوں کی عدم موجودگی کا ذکر کرتے ہوئے انہیں دستور سازی کے سلسلے میں ان کی قومی ذمہ داریوں کی یاددہانی کرائی اور اشارتاً سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

مولانا محمد علی جوہر کی وفات

پہلی گول میز کانفرنس کے دوران مسلم وفد کے ایک اہم اور ممتاز رکن مولانا محمد علی جوہر شدید علالت کے باعث 4 جنوری 1931ء کو لندن ہی میں وفات پا گئے۔ مولانا محمد علی ہندوستان سے روانگی کے وقت ہی سخت بیمار تھے' لیکن اسلام اور مسلمانوں کی خدمات کے جذبے سے اس درجہ سرشار تھے کہ اپنی بیماری کی پروا کئے بغیر وفد کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئے۔ اُن کی ناسازیٔ طبع کا یہ عالم تھا کہ انہیں جہاز میں سٹریچر پر ڈال کر سوار کیا گیا' مگر پھر بھی وہ ہمت نہ ہارے اور دورانِ سفر کانفرنس کے لئے تیاری کرتے رہے۔

کانفرنس کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے ایک تاریخی جملہ کہا جو اُن کی حریت پسندی کا آئینہ دار تھا۔ انہوں نے فرمایا:

''میں ایک غلام ملک میں زندہ رہنے سے ایک آزاد ملک میں مرجانے کو بہتر سمجھتا ہوں۔ میں یہاں سے ہندوستان کے لئے آزادی لے کر جاؤں گا یا اسی ملک میں اپنی قبر کے لئے جگہ لوں گا''۔

کسے معلوم تھا کہ مولانا کے یہ الفاظ اپنے دامن میں ابدی حقیقت لئے ہوئے تھے۔ وفات کے بعد انہیں ان کی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں دفن کیا گیا اور یوں انہوں نے بارگاہِ ایزدی سے اپنی اسلام دوستی کا قابل رشک صلہ پایا۔

گاندھی اِروِن پیکٹ

برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت ہمیشہ سے کانگریس اور ہندوؤں کی طرف مائل رہی ہے۔ چنانچہ پہلی گول میز کانفرنس کے بعد برطانیہ کے وزیر ہند مسٹر ویج وڈ بین نے وائسرائے ہند ارون کو لکھا کہ کانگریسی زعماء سے مصالحت کے لئے مناسب اقدامات کئے جائیں' تاکہ سیاسی مسائل حل کرنے کے لئے سازگار ماحول پیدا ہو سکے۔ ان ہدایات کی روشنی میں وائسرائے نے مسٹر گاندھی کو بغیر کسی شرط کے رہا کر دیا اور مذاکرات کی دعوت دی۔ 17 فروری 1931ء کو گاندھی ارون ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا' جس کے نتیجے میں 5 مارچ کو ایک سمجھوتے پر دستخط ہوئے' جو گاندھی ارون پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سمجھوتے کے تحت کانگریس نے احتجاجی تحریک فوری طور پر ختم کر دی اور دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ حکومت نے کانگریس کو پُرامن طریقے سے سودیشی تحریک جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ کانگریس اور بعض دوسری جماعتوں کے خلاف جو قوانین و قواعد نافذ کئے گئے تھے' وہ واپس لینے اور سیاسی کارکنوں کو معاف کرنے کا وعدہ کیا۔

دوسری گول میز کانفرنس (1931ء)

ستمبر 1931ء میں گول میز کانفرنس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں گاندھی نے کانگریس کے وفد کی قیادت کی۔ اجلاس کے دوران مسٹر گاندھی نے یہ موقف اختیار کیا کہ ہندوستان کے عوام کی نمائندگی کا حق صرف انہیں اور ان کی جماعت کانگریس کو حاصل ہے اور دوسرے تمام مندوبین غیر نمائندہ اور حکومت کے پسندیدہ افراد ہیں۔ مسٹر گاندھی کا یہ رویہ بے حد قابل اعتراض تھا' جس سے ماحول میں غیر ضروری تلخی کے آثار پیدا ہوئے۔ بہرحال اجلاس کے مندوبین نے گاندھی کے اس بیان سے زیادہ ہندوستان کے مسائل پر توجہ دی اور آئینی اصلاحات کے تحت وفاق کی تشکیل اور فرقہ وارانہ امور سے متعلق دو کمیٹیاں مقرر کیں۔ مسٹر گاندھی دونوں کمیٹیوں میں شامل ہوگئے' تاکہ ہر کمیٹی کی رپورٹوں پر اثر انداز ہو سکیں' لیکن دوسرے ارکان نے ان کے عزائم کو ناکام بنا دیا۔ مسٹر گاندھی نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ کسی طرح فرقہ وارانہ مسئلہ نظر انداز کر دیا جائے' مگر جب دوسرے ارکان اس کا قطعی حل نکالنے پر مصر ہوئے تو گاندھی نے ''نہرو رپورٹ'' کی بنیاد پر ایک خاکہ پیش کر دیا' لیکن ان کی یہ چال بھی کامیاب نہ ہو سکی اور مسلم وفد کے رہنما سر آغا خان نے پوری شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی۔ غیر مسلم ارکان نے بھی ان کا ساتھ دیتے ہوئے مسٹر گاندھی کے پیش کردہ خاکے کو مسترد کر دیا۔ اس دوران مسلم وفد اور دوسرے غیر مسلم وفود نے مل کر فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لئے چند تجاویز بھی پیش کیں' لیکن

1932ء: برطانوی حکومت نے ''کمیونل ایوارڈ'' کا اعلان کیا، جس میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریقِ انتخاب برقرار رکھا گیا۔

کانگریس اور مہاسبھا کے منفی رویے کے باعث بات آگے نہ بڑھ سکی اور اجلاس ہندوستان کے اس اہم ترین موضوع پر کوئی فیصلہ کئے بغیر یکم دسمبر 1931ء کو ختم ہوگیا۔

اجلاس کی اختتامی نشست سے حسب دستور برطانوی وزیراعظم مسٹر میکڈانلڈ نے خطاب کیا اور باہمی صلاح مشورے اور افہام وتفہیم کے ذریعے کوئی متفقہ حل تلاش کرنے کی اہمیت اور اشد ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں یہ بات واضح کردی کہ اگر ہندوستانی عوام اور سیاسی جماعتیں کسی معقول سمجھوتے پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہوجائیں، تو پھر حکومت برطانیہ نے اپنی جانب سے ایک قابل عمل حل نافذ کرنے پر مجبور ہوجائے گا۔

کمیونل ایوارڈ (اگست 1932ء)

فرقہ وارانہ مسئلے پر جب گول میز کانفرنس کے اجلاس بے نتیجہ ثابت ہوئے تو برطانوی وزیراعظم نے اپنے بیان کردہ موقف کے مطابق 4 اگست 1932ء کو کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلے) کا اعلان کیا۔ اس ایوارڈ کے اہم نکات حسب ذیل تھے:

1۔ جداگانہ طرزِ انتخاب برقرار رکھا گیا۔
2۔ اقلیتوں کی نشستوں کو تحفظ دیا گیا۔
3۔ اقلیتی فریقوں (سکھ، عیسائی اور یورپین باشندوں کے لئے نشستیں مخصوص کی گئیں۔
4۔ پیشہ وارانہ بنیادوں پر بعض گروہوں مثلاً زمیندار، تاجر، مزدور وغیرہ کے لئے الگ نشستیں رکھی گئیں۔
5۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی نشستوں کو تحفظ دیا گیا۔

اگرچہ اقلیتی صوبوں میں (یعنی اُن صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے) مسلمانوں کو تحفظ حاصل ہوا لیکن اکثریتی صوبوں میں اُن کی نمائندگی متاثر ہوئی اور نشستوں کی تعداد کے اعتبار سے وہ اقلیت بن کر رہ گئے۔ بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو 55 فیصد نشستیں ملنی چاہئیں تھیں، لیکن انہیں 45 فی صد نشستیں دی گئیں، جبکہ پنجاب میں 57 فیصد کی مسلم آبادی کے لئے 49 فیصد نشستیں رکھی گئیں۔ اس موقع پر بھی مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے ہاتھوں نقصان اٹھانا پڑا۔

کمیونل ایوارڈ کے مطابق ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی مقررہ نشستوں کی تقسیم حسب ذیل تھی:

صوبہ	کل	مسلم
مدراس	210	29
بمبئی	175	30
بنگال	250	119
صوبہ جات متحدہ (یوپی)	228	66
پنجاب	175	66
بہار اور اڑیسہ	175	42
صوبہ متوسط (سی پی)	112	14
آسام	108	34
شمال مغربی سرحدی صوبہ	50	36

اگرچہ یہ فیصلہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے غیر منصفانہ تھا لیکن ملکی حالات اور دوسرے فرقوں کی روش کو دیکھتے ہوئے ان کے لئے اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مسٹر گاندھی بھی اس فیصلے سے ناخوش تھے لیکن ان کی ناخوشی کی وجہ کچھ اور تھی۔ ان کے خیال میں پسماندہ اقوام کو علیحدہ نشستیں دے کر ہندوؤں کو تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی تھی، چنانچہ مسٹر گاندھی نے جو ان دنوں جیل میں تھے اس اقدام کے خلاف مرن برت رکھنے کا فیصلہ کیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے پسماندہ اقوام کے لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کو مسٹر گاندھی سے مفاہمت کرنے پر مجبور کیا اور ستمبر 1932ء میں ''پونا پیکٹ'' کے نام سے کانگریس اور پسماندہ اقوام میں ایک سمجھوتہ طے پایا جس کی رو سے پسماندہ اقوام کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب کر کے انہیں ہندوؤں کی عام نشستوں سے انتخابات میں حصہ لینے کا حق دیا گیا۔ اگرچہ بظاہر ان کے لئے انتخابی نشستوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا لیکن درحقیقت وہ اپنی مخصوص نشستوں سے جن پر ان کے نمائندے کا چننا ذیقینی تھا محروم کردیئے گئے تھے۔

تیسری گول میز کانفرنس (1932ء)

حکومت برطانیہ نے نومبر 1932ء میں گول میز کانفرنس کا تیسرا اجلاس بلایا۔ کانگریس کے نمائندوں نے اس اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ باقی مندوبین نے مختلف کمیٹیوں کی رپورٹوں پر غور کیا اور اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے رائے دی البتہ اجلاس میں کوئی اہم فیصلہ کئے بغیر برخواست ہوگیا۔

حکومت برطانیہ نے تینوں اجلاسوں کی کارروائی سے اخذ شدہ نکات اور فیصلوں کی بنیاد پر مارچ 1933ء میں ایک ''قرطاس ابیض'' شائع کیا اور اپریل 1933ء میں ''قرطاس ابیض'' کے مندرجات کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے لارڈ لنلتھگو (Lord Linlithgow) کی قیادت میں ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی۔ جسے قرطاس ابیض کی روشنی میں ہندوستان کے لئے ایک نیا نظام حکومت تشکیل دینے کے لئے سفارشات مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کمیٹی نے اپریل 1933ء سے نومبر 1934ء تک متعدد اجلاسوں میں قرطاس ابیض کے ہر پہلو پر غور کیا اور اٹھارہ ماہ کی عرق ریزی کے بعد اپنی سفارشات حکومت کو پیش کر دیں۔ حکومت نے کمیٹی کی رپورٹ پر مبنی ''گورنمنٹ آف انڈیا بل'' تیار کیا اور جنوری 1935ء میں ایوان نمائندگان کی منظوری کے لئے بھجوادیا۔ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں منظور ہونے کے بعد شہنشاہ انگلستان کی توثیق سے 4 اگست 1935ء کو ہندوستان کا نیا دستور ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء'' کے نام سے نافذ العمل ہوا۔

مسلمانوں کی تاریخ سے ایک سبق

(علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد سے ایک اقتباس)

''موجودہ بحران سے نمٹنے کے لئے ہماری ملت کو مستقل قریب میں ایک آزادانہ راہِ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور آزادانہ راہِ عمل ایسے نازک وقت میں صرف اہل عزم کے لئے ممکن ہے جن کی قوت ارادی ایک مقصد پر مرکوز ہو..... اُس نصب العین کی روشنی میں، جس کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں، مادیت سے گزر کر روحانیت کی طرف آیئے۔ مادہ کثرت ہے، روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے کہ مشکل وقتوں میں مسلمانوں کو اسلام نے بچایا ہے، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نظریں اسلام پر جمادیں اور اس کے حیات افروز تخیل سے متاثر ہوں تو آپ اپنی منتشر قوتوں کو از سرنو مجتمع کر لیں گے اور اپنی صلاحیت کردار دوبارہ حاصل کرلیں گے''۔ خطبۂ صدارت، مسلم لیگ، 30 دسمبر 1930ء

حصہ چہارم

خطبہ الٰہ آباد سے دوسری جنگ عظیم تک

1930ء — 1939ء

دور مجموعی طور پر علامہ اقبال اور قائداعظم کی فکری ہم آہنگی کا دور ہے۔ اس دور میں کل ہند مسلم سیاست کے میدان میں اقبال کی کارکردگی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ ان کے سیاسی فکر کا ارتقا صحیح معنوں میں اسی دور میں ہوا۔ وہ ابتدا ہی سے مسلم قومیت کے پرستار تھے' اس لئے جداگانہ انتخاب کا اصول ان کے عقیدے کے مطابق، مسلمانوں کے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے اشد ضروری تھا اور وہ کسی صورت میں بھی اس سے دستبردار ہونا نہ چاہتے تھے۔

علامہ اقبال کا خطبہ الٰہ آباد (1930ء)

جن دنوں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس ہو رہی تھی' ہندوستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الٰہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس تاریخی اجلاس کی صدارت کے لئے لیگ کونسل کے اجلاس مورخہ 14 جولائی 1930ء میں محمد علی جناح نے علامہ اقبال کا نام تجویز کیا تھا۔ یہ اجلاس الٰہ آباد میں 29' 30 دسمبر 1930ء کو ہوا۔ مفکر اسلام' شاعر مشرق' علامہ محمد اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانانِ ہند کے مصائب و مسائل کا ذکر کیا اور ان کے حل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک الگ اسلامی ریاست کے قیام کا تصور پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں مختلف اقوام آباد ہیں' جن میں مسلمان نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہر اعتبار سے ایک علیحدہ قوم ہیں اور مسلم آبادی کے مربوط حصوں پر مشتمل الگ ریاست قائم ہونے سے ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اپنے تاریخ ساز خطبے میں آپ نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی کے مطالبات کی تائید کرتے ہوئے فرمایا:

''ہندوستان ایک براعظم ہے' جہاں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے انسانی گروہ آباد ہیں' جو مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں۔ اُن کے طور طریقے کبھی ایک نسلی احساس سے متعین نہیں ہوتے' بلکہ ہندوؤں کی آبادی بھی کسی یکساں نسلی گروہ پر مشتمل نہیں۔ یورپی جمہوریت کے اصول ہندوستان کے فرقہ وارانہ گروہوں کو تسلیم کئے بغیر لاگو نہیں کئے جا سکتے' اس لئے مسلمانوں نے ہندوستان میں ایک مسلم ریاست کے قیام کا جو مطالبہ کیا ہے' وہ قطعی طور پر جائز ہے.....

''ذاتی طور پر میں (آل پارٹیز مسلم کانفرنس) کے مطالبات سے ایک قدم آگے جانا چاہتا ہوں۔ میں پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبے' سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں مدغم کرنے کے حق میں ہوں۔ برطانوی حکومت کے اندر یا اس سے باہر' ایک خودمختار شمال مغربی ہندوستانی ریاست کا قیام ہی میرے خیال میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا مقدر ہے''۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ یہ تجویز ''نہرو کمیٹی'' کے سامنے پیش کی گئی تھی' لیکن اس کمیٹی نے یہ کہتے ہوئے نامنظور کر دیا کہ اس طرح ایک بہت بڑی ریاست وجود میں آجائے گی' حالانکہ آبادی کے لحاظ سے مجوزہ ریاست ہندوستان کے تمام موجودہ صوبوں کے مقابلے میں چھوٹی ہوگی۔ ہندو رہنماؤں کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد پر ایک خودمختار الگ ریاست کا مطالبہ اس لئے کر رہے ہیں اس طرح وہ ہنگامی حالات میں حکومتِ ہند پر دباؤ ڈال سکیں گے' علامہ اقبال نے فرمایا:

''مسلمانوں کے اس مطالبے کے محرک وہ عزائم نہیں' جن کا ذکر ہندو رہنماؤں نے کیا ہے۔ اس مطالبے کا بنیادی محرک مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ آزادانہ طور پر ترقی کر سکیں جو اُس وحدانی طرزِ حکومت کے تحت قطعاً ناممکن ہے جسے قوم پرست ہندو رہنما ہندوستان میں مکمل بالادستی حاصل کرنے کی غرض سے قائم کرنا چاہتے ہیں''۔

علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں برطانیہ کے وزیراعظم کے بیان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''لندن میں فرقہ وارانہ مسئلے پر بحث و تمحیص نے ہندوستان میں دو عظیم اور جدا ثقافتی وحدتوں میں بنیادی تفاوت کو مزید واضح کر دیا ہے۔ اس کے باوجود انگلستان کے وزیراعظم یہ حقیقت تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ مسئلہ بین الاقوامی ہے۔ اطلاعات کے مطابق انہوں نے کہا ہے کہ ان کی حکومت جداگانہ طریق انتخاب کو برقرار رکھنے کے متعلق پارلیمنٹ کی تجاویز کو منظور کرنے میں دشواری محسوس کر رہی ہے' اس لئے کہ مخلوط انتخابات برطانوی جمہوریت سے زیادہ ہم آہنگ ہیں''۔

علامہ صاحب نے اس پر رائے دیتے ہوئے فرمایا:

''ایک متحدہ ہندوستان کے تصور پر مبنی آئین بنانا یا ہندوستان پر برطانوی جمہوریت کے اصول نافذ کرنا ملک کو غیر ارادی طور پر خانہ جنگی کی طرف لے جانا ہے۔ میرے خیال میں ملک میں اُس وقت تک امن برقرار رکھنا ممکن نہیں' جب تک ہندوستان میں آباد مختلف قوموں کو' اپنے ماضی سے بے تعلق ہوئے بغیر' جدید خطوط پر ترقی کے لئے خودمختاری کے مواقع فراہم نہیں کئے جاتے''۔

اپنا بصیرت افروز خطاب ختم کرتے ہوئے علامہ اقبال نے مسلمانوں کو براہِ راست تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اس بات پر زور دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کی تاریخ میں موجودہ صورتِ حال مسلمانوں میں مکمل نظم و ضبط اور وحدتِ فکر و عمل کی متقاضی ہے جو آپ کے انفرادی اور اجتماعی مفاد میں ہے..... طبقاتی مفادات اور ذاتی خواہشات سے بلند ہو کر اپنے نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی عمل کا تعین کریں۔ مادیت کی بجائے روحانیت کو اپنائیں۔ مادیت میں تفاوت اور تفرقہ ہے۔ روحانیت میں روشنی' زندگی اور اتحاد ہے۔ میں نے تاریخ اسلام سے ایک سبق یہ سیکھا ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو مشکل حالات کا سامنا ہوا' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا' نہ کہ اس کے برعکس۔ اگر آج آپ اسلام کو اپنا نصب العین اور مطمحِ نظر بنا لیں اور اسلام کے حیات آمیز نظریے سے رشد و ہدایت حاصل کریں تو اس طرح آپ

1930ء: علامہ اقبال نے فرمایا: ''ہندوستان کی حقیقی صورت حال آپ پر اُس وقت روشن ہوگی جب اِس کا مطالعہ کرنے کے لیے آپ اجتماعی خودی حاصل کرلیں گے''

اپنی منتشر قوتوں کو یکجا اور اپنی کھوئی ہوئی یگانگت کو دوبارہ حاصل کر کے اپنے آپ کو مکمل تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ قرآن حکیم کی ایک آیت کے مطابق پوری عالمِ انسانیت کی تخلیق اور تخلیق نو ایک فردِ واحد کی تخلیق اور تخلیق نو کی مانند ہے۔ اس لئے آپ (مسلمان) جو انسانیت کے اس عظیم تفکر کے اولین عملی شارح ہیں' فردِ واحد کی طرح زندہ اور متحرک کیوں نہیں ہو سکتے؟ میں کسی کو بھی الجھانے کی غرض سے یہ بات نہیں کہہ رہا کہ ہندوستان میں حقیقی صورتِ حال وہ نہیں جو بظاہر دکھائی دے رہی ہے۔ اس کی حقیقت آپ پر اُس وقت روشن ہوگی جب اس کا مطالعہ کرنے کے لئے آپ اجتماعی خودی حاصل کرلیں گے''۔

علامہ اقبال کے بصیرت افروز پاکستان ساز خطبے پر معترضین کی جانب سے دو اعتراض کئے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ اقبال نے اپنے خطبے میں شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کا تصور تو پیش کیا' لیکن مسلم اکثریتی صوبے بنگال کا ذکر تک موجود نہ تھا۔ دوم یہ کہ خطبے میں پیش کردہ الگ اسلامی ریاست قائم کرنے کی تجویز کی تائید میں مسلم لیگ کے اجلاس نے کوئی قرارداد منظور نہیں کی۔ کیوں؟

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی تصنیف ''زندہ رود'' میں دونوں اعتراضات کا معقول جواب دیا ہے۔ پہلے اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ مجوزہ اسلامی ریاست کا تصور ایک نصب العین کے طور پر پیش کیا گیا تھا اور شمال مغربی ہند میں مسلم ریاست کے قیام کے سلسلے میں بھی وہاں کی مسلم اکثریت کے بارے میں ''کم از کم'' کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے' جس سے ظاہر ہے کہ بنگال اقبال کے پیش نظر تھا' مگر اس کا واضح ذکر اس لئے نہ کیا گیا کہ اگر شمال مغربی ہند میں مسلم اکثریت کی بنا پر مسلم ریاست کے قیام کا اصول قابل قبول ہوتا ہے تو منطقی طور پر اسی اصول کا اطلاق مشرقی ہند پر بھی کیا جا سکتا تھا۔ جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے' اُن کا خطبے میں ذکر کرنا اس لئے غیر ضروری تھا کہ وہاں مسلمانوں کو وویٹج یا پاسنگ دینے پر ہندوؤں کو کوئی اعتراض نہ تھا' بلکہ شمال مغرب میں مسلم ریاست کے قیام کے نتیجے میں طاقت کے توازن کے سبب اُن کی پوزیشن زیادہ مضبوط ہوتی تھی''۔ (صفحہ 457)

خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال کی پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قرارداد منظور نہ کئے جانے کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں رقم طراز ہیں:

''ایک سبب تو یہ تھا کہ لیگ کے سرکردہ لیڈر محمد علی جناح سمیت گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے ہوئے تھے' لیکن چند اور اہم وجوہ بھی تھیں۔ اس مرحلے پر ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کے لئے مسلمانوں کی طرف سے محمد علی جناح نے ''چودہ نکات'' پیش کر رکھے تھے اور گول میز کانفرنس میں حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں کے سامنے بھی یہی مطالبات تھے۔ گویا ''چودہ نکات'' ابھی زیر غور تھے اور اُن کے قبول یا کلی طور پر رد کئے جانے کا حتمی فیصلہ ابھی ہونا تھا۔ اس صورت حال میں اقبال کی پیش کردہ تجویز کی تائید میں کوئی قرارداد منظور کرنا نامناسب یا قبل از وقت تھا۔ علاوہ ازیں اس کے باوجود کہ اقبال' لیگ کے ساتھ عرصے سے وابستہ تھے' پنجاب پروونشل مسلم لیگ کے سیکرٹری رہ چکے تھے اور اب مسلم لیگ کے منتخب صدر کے طور پر اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔ انہوں نے خطبے کے ابتدائی حصے میں واضح کیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے رہنما یا کسی سیاسی رہنما کے پیرو کی حیثیت سے مسلم ریاست کے قیام کی تجویز پیش نہیں کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر اقبال کی پیش کردہ تجویز ایک متبادل بلکہ ایک قدم آگے بڑھانے کی تجویز تھی' یعنی اگر ''چودہ نکات'' رد کر دیئے گئے یا ہندوستان کے اندر مسلم انڈیا قائم کرنے کی تجویز منظور نہ ہوئی تو پھر یہ لائحہ عمل اختیار کرنا پڑے گا''۔ (زندہ رود' صفحہ 457)

علامہ اقبال کی احتیاط کے باوجود حکومت برطانیہ کے سرکردہ لیڈروں نے' جو اپنی طرف سے ہندوستان کے آئندہ دستور کا پیچیدہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ان کے خطبے کو پسند نہ کیا۔ وزیراعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ سخت برہم ہوئے۔ اینگلو انڈین اخبارات نے علامہ صاحب کی تجویز کو رجعت پسند اور ناقابل عمل قرار دیا۔ جہاں تک ہندو پریس کا تعلق ہے' وہ خطبے پر تبصرہ کرتے وقت گالی گلوچ اور بہتان تراشی پر اتر آیا۔ اخبار ''ٹریبیون'' لاہور نے لکھا کہ اقبال کو گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے مدعو نہیں کیا گیا' اس لئے وہ انتقام پر اُتر آئے۔ روزنامہ ''پرتاپ'' نے ایک مضمون بہ عنوان ''شمالی ہند کا ایک خوفناک مسلمان' ڈاکٹر اقبال کی گستاخیوں پر چند خیالات'' شائع کیا' جس میں اقبال کو جنونی' شر انگیز' احمق' خوفناک' زہریلا' تنگ خیال' پست نظر' متعصب' قابل نفرت' کمینہ اور نالائق کے القابات سے نوازا گیا۔

مسلم اخبارات اقبال کے ہم نوا تھے۔ سب نے اقبال کی تجویز کا خیر مقدم کیا۔ روزنامہ ''انقلاب'' تو ان کی حمایت میں سرفہرست تھا۔ ''انقلاب کے دو شماروں میں خطبۂ الٰہ آباد کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ ترجمہ غالباً مولانا غلام رسول مہر نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ ''انقلاب'' نے جنوری 1931ء میں خطبے کے حق میں تقریباً بارہ اداریئے تحریر کئے۔ ایک اداریے میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ تقسیم ہند کی تجویز تو دراصل ہندوؤں ہی کی طرف سے پیش کی گئی تھی' جب لالہ لاجپت رائے نے کہا تھا کہ مسلمان شمالی ہند کو اپنا قومی وطن بنا لیں اور ہندو ان علاقوں کو چھوڑ کر وسطی اور جنوبی ہند میں آباد ہو جائیں۔ بعد میں بھائی پرمانند نے بھی اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا اور پھر خطبۂ الٰہ آباد سے چند روز پیشتر پروفیسر جی آر ابھیانکر نے برعظیم کو تین حصوں میں بانٹنے کا تصور پیش کیا' یعنی ریاستی ہند' مسلم ہند اور ہندو ہند۔ پس اگر ہندو تقسیم ہند کے متعلق سوچ سکتے ہیں تو پھر اقبال کو ایسی تجویز پیش کرنے کا حق کیوں نہیں دیا جاتا؟

مسلمانوں کی زبوں حالی

اُن دنوں اگرچہ سیاسی حلقوں میں گول میز کانفرنس اور سائمن کمیشن کی رپورٹ کے چرچے زیادہ تھے' پھر بھی علامہ اقبال نے اپنی تجویز سے جو مشعل روشن کی' اُس نے مسلمانوں کی منزل مراد کی راہیں متعین کر دیں۔ اُن کے

قرآن اکیڈمی لائبریری میں توسیع و اضافہ

قرآن اکیڈمی لائبریری میں شعبہ تحقیق اسلامی کے قیام کے بعد قرآن اکیڈمی لائبریری کے ذخیرۂ کتب میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اگر کوئی صاحب اسلامی موضوعات پر اپنی ذاتی لائبریری کی کتابیں عطیہ دینا چاہیں تو رابطہ فرمائیں:

حافظ عاطف وحید 'انچارج شعبہ تحقیق اسلامی

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501

1935ء: علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا کہ 1935ء کا ایکٹ انگریزوں نے محض ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا ہے۔

خطبۂ الٰہ آباد نے مسلمانانِ ہند کو سیاسی بصیرت اور اُن کے ایمان و ایقان کو فکر تازہ کی بنیاد فراہم کی۔ لیکن اس بیداری اور فکرِ تازہ سے ملی مقاصد کے لئے استفادہ کرنا سیاسی رہنماؤں کا کام تھا۔ بدقسمتی سے مولانا محمد علی جوہر پہلی گول میز کانفرنس کے دوران وفات پا گئے۔ ان کے بعد سر محمد شفیع بھی انتقال کر گئے۔ محمد علی جناح انگلستان میں مقیم ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ زیادہ فعال نہ تھی۔ اگرچہ اس کے اجلاس ہوتے رہتے اور مختلف قومی امور بھی زیر بحث آتے رہتے' لیکن عوام سے اس کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا اور بالعموم یہی کہا جاتا تھا کہ مسلم لیگ ایک خاص مراعات یافتہ طبقے کی جماعت ہے اور عام آدمیوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تاثر مسلم لیگ کے مستقبل کے لئے بہت نقصان دہ تھا اور مخلص لیگی کارکن اس صورت حال سے کافی پریشان تھے۔ مسلمانوں کی نگاہیں ایسے لیڈر کی تلاش میں تھیں جو ان کے مسائل سے پوری طرح آگاہ ہو اور مستقبل کے تقاضوں پر نگاہ رکھتا ہو۔ چنانچہ مختلف ذریعوں سے محمد علی جناح سے درخواست کی گئی کہ وہ انگلستان میں اپنا قیام ترک کر کے ہندوستان آئیں۔ بالآخر یہ کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے قائداعظم 1934ء میں ہندوستان آئے اور مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہوئے۔

1944ء کے عام انتخابات

1919ء کے دستور کے مطابق مرکزی اسمبلی کی 127 نشستوں کے لئے 1934ء کے اواخر میں عام انتخابات کرائے گئے' جن میں مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں اور آزاد امیدواروں نے حصہ لیا۔ انتخابات کے نتائج سے حسب ذیل صورت سامنے آئی:

نیشنل کانگریس	44 نشستیں
کانگریش نیشنلسٹ	11 (اکثر مہاسبھائی)
آزاد امیدوار	22 (صرف تین غیر مسلم)
یورپین	11
سرکاری ارکان	26
غیر سرکاری نامزد ارکان	13

انتخابات کے وقت ابھی جناح صاحب انگلستان میں تھے' لیکن بمبئی کے مسلمانوں نے بذریعہ تار ان کی رضامندی حاصل کر کے ان کے نام سے کاغذات داخل کئے اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔

مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو مجوزہ دستور کے متعلق پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ اسمبلی کی منظوری کے لئے پیش کی گئی۔ قائداعظم نے رپورٹ کے بعض حصوں کو غیر تسلی بخش قرار دیا اور ان میں کچھ بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے مندرجۂ ذیل ترامیم پیش کیں:

1۔ اسمبلی ''کیمونل ایوارڈ'' کو تو اُس وقت تک قبول کرتی ہے' جب تک کہ مختلف فرقوں کی جانب سے کوئی متفقہ متبادل تجویز پیش نہیں کی جاتی۔

2۔ صوبائی حکومتوں کے متعلق مجوزہ اصلاحات کو یہ اسمبلی قطعی غیر تسلی بخش اور مایوس کن قرار دیتی ہے۔ گورنروں کے خصوصی اختیارات قابل اعتراض ہیں' اس لئے ان اصلاحات میں مناسب تبدیلیاں ضروری ہیں' ورنہ یہ کسی کے لئے بھی قابل قبول نہ ہوں گی۔

3۔ مرکزی وفاق کے متعلق تجاویز کو یہ ایوان بنیادی طور پر ناقص اور برطانوی ہند کے عوام کے لئے ناقابل قبول سمجھتا ہے اور حکومت سے سفارش کرتا ہے کہ وہ برطانوی حکومت کو اس طرف متوجہ کرے اور مشورہ دے کہ وہ صرف برطانوی ہند کی حد تک ایک کامل ذمہ دار حکومت کے قیام کا اہتمام کرے اور اس سلسلے میں ضروری اقدامات کی ساری صورتِ حال کا پھر سے جائزہ لے اور ہندوستانی رائے عامہ کی مرضی معلوم کرے۔

کانگریسی ارکان نے قائداعظم کی پیش کردہ ترامیم کی شدید مخالفت کی اور اس سلسلے میں کئی دوسرے ارکان کی حمایت بھی حاصل کر لی' لیکن قائداعظم کی پیش کردہ ترامیم اور سفارشات کی افادیت اور اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایوان کی اکثریت نے اُن کے حق میں رائے دی اور یہ ترامیم کثرتِ رائے سے منظور ہو گئیں۔ اس رائے شماری کے نتیجے میں نہ صرف قائداعظم کی مقبولیت بڑھی' بلکہ کانگریس کے اس دعوے کی قلعی بھی کھل گئی کہ اسے ہندوستان کے عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہے۔

1935ء کا ایکٹ

1935ء کے ایکٹ کو پارلیمانی ڈرافٹنگ کا شاہکار کہا جاتا ہے' لیکن اہم مقامات پر وہ ابہام کا مجموعہ ہے۔ گورنر جنرل اور گورنروں کے غیر محدود اختیارات اور اقلیتوں سے متعلق دفعات کی زبان بے حد لچک دار ہے۔ آئین کی تشریح کرنے والا آزاد ہے کہ ان کے اندر جو معنی چاہے' ڈال دے۔ اگرچہ اس دستور کے مضمون نے واشگاف انداز میں اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ مستقبل میں ہندوستان کو متحد رکھنے کے امکانات بہت محدود ہیں۔ تاہم انہوں نے آئین میں وہ سب کچھ شامل کر لیا' جس سے برطانوی اقتدار کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ہندوستان کی غیر تاریخی اور غیر منطقی وحدت قائم رہے۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے لئے فیڈریشن کا ڈھونگ رچایا گیا اور اس میں والیانِ ریاست کی شمولیت کیلئے گنجائش نکالی گئی۔ والیانِ ریاست کا امیر و کبیر اور افسانوی زندگی گزارنے کا عادی طبقہ برطانوی اقتدار کا اہم ستون تھا۔ مرکزی حکومت میں والیانِ ریاست کے داخلے سے غیر جمہوری عناصر کو تقویت پہنچانے اور برطانوی مفاد کی حفاظت مقصود تھی۔ چونکہ والیانِ ریاست میں مسلمان رؤساء کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی' اس لئے یہ بھی یقینی تھا کہ مرکزی حکومت میں ہندوؤں کا غلبہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔

علامہ اقبال نے یہ نکتہ پہلے تو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے 1932ء کے خطبۂ صدارت میں بیان کیا تھا' اور بعد میں قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا کہ نیا آئین انگریزوں نے محض ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وضع کیا ہے۔ اس آئین میں مسلمانوں کے کسی مسئلے کا حل موجود نہیں۔

1935ء کے ایکٹ میں اقلیتوں کے تحفظ کا بندوبست بھی کیا گیا تھا' لیکن ایکٹ کے ان الفاظ سے کہ ''صوبائی گورنر اور گورنر جنرل اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کی نگہداشت کریں گے'' متضاد معنی اخذ کئے جا سکتے تھے' کیونکہ جائز حقوق اور مفادات کے الفاظ ان حقوق اور مفادات کا تعین نہیں کرتے۔ پورے قانون اور اس کے تحت نافذ ہونے والی دفعات میں بھی ان اقلیتوں کے مذہب اور تہذیب و تمدن کے تحفظ سے گریز کیا گیا تھا۔

علامہ اقبال نے ایکٹ کی اس شق پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقلیتوں کا تحفظ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں جن کی تشریح اور توضیح اقلیتوں کا کام ہے۔ اتنے اہم مسئلے کو ایک فردِ واحد یعنی گورنر یا گورنر جنرل کی صوابدید پر چھوڑ دینے سے اصلاحِ احوال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔ بعد میں علامہ اقبال کے یہ خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔

1935ء کا دستور بننے سے پہلے' دس سال تک متواتر جو بہت سی آئینی مباحث ہوئے' ان میں ہندوؤں کا موقف یہ تھا کہ برعظیم میں ایک بااختیار مرکزی حکومت قائم ہو اور صوبے صرف اس حکومت کی فرماں برداری پر قناعت

کریں۔ یہ موقف قابل فہم نہیں تھا۔ ہندو اپنی عددی اکثریت اور اقتصادی برتری کے بل بوتے پر مسلم اکثریت کے علاقوں پر ایک مضبوط مرکزی حکومت کی وساطت سے اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتے تھے۔ گزشتہ کئی برسوں سے مسلمان وحدانی طرزِ حکومت نہیں' بلکہ وفاقی طرزِ حکومت کا مطالبہ دہراتے چلے آتے تھے۔ مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ وفاق کے اندر صوبوں کو حقیقی اختیارات حاصل ہوں گے اور ان کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں اپنی روحانی' معاشرتی اور ثقافتی قدروں کی حفاظت پر قادر ہوں گے۔ 1935ء کے ایکٹ میں فیڈریشن کے قیام سے مسلمانوں کا مطالبہ بظاہر پورا کر دیا گیا' لیکن اس فیڈریشن کے اندر وحدانی حکومت کی روح موجود تھی۔ فیڈریشن کے مختلف اداروں کی ساخت' اختیارات اور طریق کار کی فہرست اس ڈھنگ پر تیار کی گئی تھی کہ حقیقی اختیارات مرکز کے پاس ہی رہیں اور گورنر جنرل کی آمریت بھی جوں کی توں قائم رہے' البتہ اس کو بروئے کار لانے کے طریقے بدل دیئے جائیں۔ قائداعظم پہلی دو گول میز کانفرنسوں میں شریک تھے۔ وہ متواتر گورنر جنرل کے وسیع اختیارات کی مخالفت کرتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ یہ فیڈریشن اصلی فیڈریشن نہیں ہے' بلکہ محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس کے اندر صوبے مجبور اور محض مرکزی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

اقبال اور قائداعظم دونوں نے اپنی اپنی جگہ' اقبال نے فلسفے کے زاویۂ نظر سے اور قائداعظم نے قانون اور سیاست کے نقطۂ نظر سے 1935ء کے ایکٹ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور دونوں یکساں نتائج پر پہنچے تھے:

یہ کہ فیڈریشن کا عجوبہ مسلمانوں کے لیے پُرفریب ہے' جس میں مرکزی حکومت کے اختیارات کی وسعت اور فراوانی سے صوبائی خودمختاری ساقط ہو جاتی ہے۔

یہ کہ اس عجیب و غریب دستور سے نہ مسلمانوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ دوسری اقلیتوں کے۔

مسجد شہید گنج کا سانحہ

1935ء کے نئے دستور کے تحت متوقع انتخابات میں مسلمانوں کو کامیابی کو متاثر کرنے کے لئے ہندو رہنماؤں نے سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا تاکہ مسلمان پورے اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ انتخابی سرگرمیوں پر توجہ نہ دے سکیں۔ ہندو رہنماؤں کا یہ عمل دودھاری تلوار کی مانند تھا۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کی کوششوں کو منتشر کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف ہندوؤں کے ساتھ سکھوں کی ہمدردیوں کو مزید بڑھانا چاہتے تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں نے سکھوں کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھایا اور مسجد شہید گنج کے مسئلے کو آگ لگائی۔ مسجد شہید گنج کا معاملہ کافی عرصے سے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان سنگین صورت اختیار کر چکا تھا۔ مسجد پر سکھوں کا قبضہ تھا اور انہوں نے اس کا نام بھی تبدیل کر کے شہیدی گوردوارہ رکھ دیا تھا۔ جبکہ مسلمان اپنی دیرینہ عبادت گاہ کو حاصل کرنے کے لئے ایک پُرامن تحریک چلا رہے تھے جو پورے نظم وضبط کے ساتھ جاری تھا لیکن حکومت نے اسے دبانے کے لئے طاقت کا استعمال کیا جس سے حالات بگڑ گئے۔ مسلمان مذہبی جوش و خروش اور ملی حمیت کے جذبات سے سرشار حکومت کے جابرانہ اقدامات کے سامنے پورے عزم و استقلال کے ساتھ ڈٹ گئے اور اللہ کے گھر کی بازیابی کے لئے پروانہ وار جانوں کے نذرانے پیش کئے۔ بیشتر ازاں کہ صورتِ حال قابو سے باہر ہو جاتی اور ملک کے دوسرے حصے بھی اس آگ کی لپیٹ میں آ جاتے حکومت نے مسلمانوں کے اشتعال کو کم کرنے کے لئے لاہور ہائی کورٹ کے احاطے میں واقع مسجد شاہ چراغ کو جو ایک زمانے سے بند پڑی تھی مسلمانوں کے حوالے کر دیا لیکن اس کے باوجود معاملات بہتر ہونے کی بجائے بدتر ہوتے گئے۔

قائداعظم محمد علی جناح مسلمانوں کے خون کی ارزانی سے بہت مضطرب تھے وہ حالات کا جائزہ لینے کے لئے لاہور پہنچے اور مقامی مسلمان زعماء سے گفتگو کی۔ انہوں نے تحریک مسجد شہید گنج کے رہنماؤں کو سمجھایا کہ سول نافرمانی اور تشدد سے مسئلہ مزید پیچیدہ ہو جائے گا اس لئے یہی مناسب ہوگا کہ اپنے جائز حقوق کے لئے قانونی راہ اختیار کی جائے۔ قائداعظم نے سکھ لیڈروں سے بھی مذاکرات کئے اور مسلمان عوام کو بھی اس معاملے کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ کرنے کے لئے شاہی مسجد میں ہزاروں افراد کے اجتماع سے خطاب کیا۔ انہوں نے اس تنازعہ کو حل کرنے کے لئے امکانی حکمت عملی بیان کی اور ساتھ ہی صبر و تحمل کی تلقین بھی کی۔ عوام پر قائداعظم کی باتوں کا اثر ہوا اور انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی۔ حکومت نے بھی جذبہ خیر سگالی کے تحت تحریک کے دوران گرفتار ہونے والے تمام افراد کو رہا کر دیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم کی ان مدبرانہ کوششوں کو اپریل 1936ء میں بمبئی کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے بے حد سراہا جن سے پنجاب کے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

نئے انتخابات کی تیاریاں

نئے دستور کے نفاذ کے بعد سیاسی سرگرمیوں میں تیزی آ گئی۔ اگرچہ مختلف سیاسی جماعتوں نے اس دستور میں کئی خامیوں کی نشاندہی کی تھی اور اس میں فوری ردوبدل کا مطالبہ کیا تھا پھر بھی اس کے تحت مجوزہ انتخابات کی تیاری پر تقریباً تمام جماعتیں پوری توجہ دے رہی تھیں۔

اس زمانے میں آل انڈیا مسلم لیگ سیاسی اعتبار سے کسی قدر پس منظر میں چلی گئی تھی۔ نئے دستور کے نافذ العمل ہونے کے بعد سیاسی حالات میں اہم تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قائداعظم نے مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا جو 11' 12 اپریل 1936ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت اودھ چیف کورٹ کے سابقہ چیف جج سید وزیر حسن نے کی۔ مجلس استقبالیہ کے رئیس کریم بھائی ابراہیم نے اجلاس کے انعقاد کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''نئی دستوری تبدیلیوں کے موقع پر یہ اجلاس بلانے کی ضرورت مسٹر محمد علی جناح جیسے بلند مرتبہ سیاستدان نے محسوس کی جن کی حب الوطنی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے غیر مشروط خدمات آل انڈیا مسلم لیگ کی سرگرمی اور فعالیت کے طویل عرصے میں ہمیشہ تقویت کا سرچشمہ رہی ہیں۔ میں مسٹر جناح کی خوبیوں کے بارے میں کسی طویل بیان کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اس لئے کہ انہیں ملک کے تمام فرقے اور حکومت نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی انتھک محنت کے لئے پورا ہندوستان ان کا احسان مند ہے اور مسلم ہند بالخصوص تہہ دل سے شکرگزار ہے جس کے مفادات کا انہوں نے ہمیشہ بلاخوف و لحاظ تحفظ کیا ہے۔ خواتین و حضرات میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب عصر رواں کے ہندوستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں مسٹر جناح کو ابدی شہرت کا منفرد مقام حاصل ہوگا۔

قائداعظم نے اجلاس میں نئے آئین کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی جس میں نئے دستور کو ہندوستان پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا کہ ''مسلم لیگ ملک کی داخلی صورت حال کو دیکھتے ہوئے سفارش کرتی ہے کہ نئے دستور کے تحت صوبائی نظام کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے باوجود آزمایا جائے۔ البتہ مسلم لیگ کی رائے میں نئے دستور میں وفاقی

1937ء: مُسلم لیگ اور کانگرس کے کارکنوں نے عام انتخابات کے لیے ملک گیر مہم کا آغاز کیا اور اپنے اپنے منشور شائع کر کے عوام تک پیغام کی صورت میں پہنچائے۔

نظام کے متعلق تمام تجاویز قطعی خراب اور ناقابل قبول ہیں۔ اس لئے لیگ کے خیال میں برطانوی پارلیمنٹ کو چاہئے کہ وہ نئے دستور کو نافذ کرنے سے پیشتر تمام صورتِ حال کا از سرِ نو جائزہ لے ورنہ اگر نیا آئین زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو اس کے نتیجے میں پُر امن حالات پیدا ہونے کی بجائے ملک تباہی و بربادی کا شکار ہو جائے گا''۔ قائداعظم نے یہ قرارداد پیش کرتے ہوئے نئے دستور کے ہر پہلو کا مفصل تجزیہ کیا اور کہا کہ گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم مفاہمت کے لئے کوشش کی گئی تھی تاکہ آئینی بحران کا کوئی معقول اور مناسب حل نکل آئے لیکن بدقسمتی سے اکثریتی فرقے کے لئے ہماری شرائط قابل قبول نہ تھیں۔ قائداعظم نے جب حاضرین سے پوچھا کہ کیا نیا آئین قبول ہے تو تمام مندوبین نے یک آواز ہو کر جواب دیا: ''نہیں'' نہیں''۔ قائداعظم نے ہندوستانیوں کو مشورہ دیا کہ جس طرح جرمن قوم نے معاہدہ وارسیلز کو جوان پر تھوپا گیا تھا مسترد کر دیا تھا اسی طرح اہل ہند بھی اس نئے دستور کو رد کر دیں۔ انہوں نے کہا کہ ''حکومت پر دباؤ ڈالنے کے کئی طریقے ہیں۔ مسلح بغاوت کے طریقہ کو اپنانے کا کوئی امکان نہیں جبکہ عدم تعاون کی تحریک پہلے ہی ناکام ہو چکی ہے۔ ان حالات میں صرف آئینی جدوجہد کا راستہ باقی رہتا ہے لہٰذا اسمبلی کے اندر اور باہر آئینی طریق کار پر عمل پیرا ہو کر اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ''اس کام کے لئے تمام فرقوں کو متحد ہو کر کوشش کرنی ہوگی''۔ کانگریس تن تنہا اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتی تاوقتیکہ وہ مسلمانوں کو ساتھ لے نہ کر چلے۔ مسلمانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ منظم ہوں اور شاہراہ آزادی پر قدم بڑھائیں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو کانگریس ان کے مطالبات منظور کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

قائداعظم کی پیش کردہ تجاویز کو اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مسلم لیگ نے قائداعظم کی سربراہی میں پینتیس ارکان پر مشتمل مرکزی انتخابی بورڈ تشکیل دیا جسے مختلف صوبوں میں صوبائی بورڈ قائم کرنے کا اختیار بھی تفویض کیا گیا۔

قائداعظم نے انتخابی بورڈ بناتے وقت پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو ان میں نمائندگی دی جائے تاکہ انتخابات میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی جا سکے لیکن بدقسمتی سے بعض نیشنلسٹ مسلمان اور جمعیت العلمائے ہند کے رہنما جو کانگریس کے زیر اثر تھے مسلمانانِ ہند کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ سے اشتراکِ عمل پر رضامند نہ ہوئے اور اس انتشار سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ مسلمانوں کے نکتہ نظر سے کافی تکلیف دہ تھے۔

مسلم لیگ کا انتخابی منشور

سال کے آخر میں مسلم لیگ اور کانگریس نے اپنا اپنا انتخابی منشور جاری کیا۔ دونوں جماعتوں کے پروگرام بالعموم یکساں مطالب پر مشتمل تھے مسلم لیگ کے منشور کے چند اہم نکات یہ تھے:

1۔ نئے دستور میں بنیادی تبدیلیاں کر کے اسے جمہوری دستور بنایا جائے جس میں مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کی ضمانت دی جائے۔

2۔ منتخب ارکان صوبائی دستور کے تحت دیئے گئے تمام اختیارات اور مراعات کو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام میں لائیں۔

3۔ مسلم لیگ کے نمائندے ان جماعتوں کے ارکان سے تعاون کریں گے جن کا پروگرام مسلم لیگ کے منشور سے مطابقت رکھتا ہو۔

4۔ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مسلم لیگ مذہبی امور پر جمعیت العلمائے ہند اور مجتہدین کی رائے اور سفارشات کو اولیت دے گی۔

5۔ مسلم لیگی ارکان، حکومت کے ان تمام فیصلوں کی مخالفت کریں گے جو عوام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق پر اثر انداز ہوتے ہوں۔

مسلم لیگ کا منشور نہایت جامع اور جمہوری فکر و نظر کا عکاس تھا جس میں مسلمانوں کی امنگوں اور حقوق کا خیال رکھتے ہوئے ملکی مفاد میں دوسری قوموں سے تعاون کی ضرورت کو بھی مدنظر رکھا گیا تھا۔

اگرچہ کانگریس کا منشور بھی کم و بیش انہی خطوط پر قدرے مختلف لہجے میں مرتب کیا گیا تھا لیکن چند نکات ایسے بھی تھے جو مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں سے کاملاً متضاد تھے۔ مثلاً کانگریس نے فرقہ وارانہ فیصلے پر اعتراض تو کیا لیکن اسے کھلے طور پر مسترد بھی نہیں کیا۔ جداگانہ انتخابات کے طریقہ کی سخت مخالفت کی اور اسے منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کا وعدہ کیا گیا جبکہ اس کے برعکس مسلم لیگ نے اردو زبان اور اس کے مروجہ رسم الخط کو مزید ترقی دینے کے پختہ عزم کا اظہار کیا۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے کارکنوں نے انتخابات کے لئے ملک گیر مہم کا آغاز کیا تاکہ عوام تک اپنا پیغام پہنچا سکیں۔ البتہ کانگریس کے پاس مالی وسائل کی بہتات تھی۔ ہندو پریس بھی پوری طرح اس کا ہم نوا تھا اور ملک بھر میں تنظیمی سہولتیں بھی زیادہ موثر اور وسیع تر بنیادوں پر موجود تھیں جبکہ مسلم لیگ کو مالی ذرائع کی کمی، تبلیغی سہولتوں کے فقدان اور تنظیمی کمزوریوں جیسی مشکلات کا سامنا تھا' اس کے باوجود مسلم لیگ نے انتخابات میں بھرپور حصہ لینے کا فیصلہ کیا تاکہ مسلمانوں میں اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھنے کا احساس بیدار رہے۔

انتخابات کے نتائج (1937ء)

1936-37ء کے موسم سرما میں انتخابات منعقد ہوئے جن میں عوام نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ اگرچہ دوسری سیاسی جماعتوں کی نسبت کانگریس زیادہ پرانی' زیادہ مالدار اور منظم پارٹی تھی پھر بھی وہ کل نشستوں میں سے پچاس فیصد نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ملک میں جملہ نشستوں کی تعداد' جن کے لئے انتخابات ہوئے' 1771 تھی۔ اس تعداد میں صوبائی اسمبلیوں کی 1585 نشستیں اور بمبئی' مدراس اور یوپی کے ایوان بالا کی 186 نشستیں شامل تھیں۔ ان تمام نشستوں میں سے کانگریس کو 706 حلقوں میں کامیابی ہوئی جبکہ غیر کانگریسی ہندو 211 نشستوں پر کامیاب ہوئے۔

انتخابات کے ان نتائج سے مسٹر گاندھی کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوا کہ کانگریس ملک کی 95 فیصد آبادی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کانگریس کو زیادہ تر ان حلقوں میں کامیابی ہوئی جو ہندو اکثریت کے مرکز تھے۔ مسلمانوں کے حلقوں میں کانگریس کو صرف 26 نشستیں مل سکیں جبکہ مسلم لیگ کے 109 نمائندے کامیاب ہوئے۔ مختلف صوبوں میں مسلم لیگ جو نشستیں حاصل ہو سکیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

صوبہ	مسلم نشستیں	مسلم لیگ
مدراس	28	11
بمبئی	29	20
بنگال	117	40
یوپی	64	27
پنجاب	84	2
بہار	39	-
سی پی	14	-

1937ء: انتخابات میں مسلم لیگ کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ صوبہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی' بنگال میں کرشک سرامک پارٹی اور صوبہ سرحد میں کانگرس کو کامیابی حاصل ہوئی۔

صوبہ سرحد	36	-
آسام	34	9
اڑیسہ	4	-
سندھ	35	-
کل تعداد	484	109

ان اعداد و شمار کو دیکھ کر اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلم لیگ کی کارکردگی مایوس کن تھی اور وہ مسلم رائے دہندگان کی صحیح رہنمائی کرنے میں ناکام رہی۔ مسلم لیگ کو نہ صرف مجموعی طور پر کم نشستیں ملیں بلکہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی اس کا کردار نہایت غیر موثر ثابت ہوا۔ پنجاب میں یونینسٹ اور بنگال میں کرشک سرامک پارٹی نے نمایاں حیثیت حاصل کی جبکہ صوبہ سرحد میں کانگریس سرفہرست رہی۔

وزارت سازی

ملک کے گیارہ صوبوں میں سے کانگریس نے جن پانچ صوبوں میں واضح اکثریت حاصل کی، وہ تھے مدراس' یوپی' سی پی' بہار اور اڑیسہ۔ جبکہ بمبئی اور سرحد میں وہ واحد اکثریتی جماعت بن کر ابھری۔ کامیابی پر کانگریسی زعماء اس قدر نازاں ہوئے کہ انہوں نے ملک میں کسی دوسری سیاسی جماعت کے وجود کو تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے یہاں تک کہہ دیا کہ ''ہندوستان میں اس وقت صرف دو پارٹیاں ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسری برطانوی حکومت''۔ پنڈت نہرو کے بیان کا اصلی ہدف مسلم لیگ تھی۔ لیکن قائداعظم نے اس بلند بانگ دعوے کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر بھی مفاہمت آمیز رویہ اختیار کیا اور کانگریس سے تعاون پر آمادگی کا اظہار کیا۔ کانگریسی لیڈروں نے جو انتخابی کامیابی کے نشے میں مست و بے خود تھے اس پیشکش کو لائق اعتناء نہ سمجھا اور خود ہی صوبائی وزارتیں بنانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔ مسلم لیگ کو توقع تھی کہ بعض صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے ان کے منتخب ارکان کو بھی صوبائی کابینہ میں شامل کیا جائے گا اس لئے کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ گول میز کانفرنس کے فیصلوں اور صوبائی گورنروں کو حکومت ہند کی جاری کردہ ہدایات میں اس نوعیت کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ جداگانہ انتخابات کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کو ہر سطح پر نمائندگی دی جائے لیکن کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ مشترکہ کابینہ سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ برطانوی پارلیمانی نظام میں اس قسم کی مشترکہ کابینہ سازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس طرح کانگریس نے نہ صرف مفاہمت کے تمام دروازے بند کر دیئے بلکہ اکثریت اور اقلیت کے اشتراک و امتزاج سے ایک وسیع البنیاد معاشرے کی تشکیل کے امکانات کو بھی نقصان پہنچایا۔

کانگریسی قیادت اس حقیقت کو شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ ان کی جماعت کے ارکان میں مسلمانوں کی تعداد کم ہے جو کانگریس کی ملک گیر نمائندہ حیثیت کو بری طرح متاثر کر رہی تھی۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے مسلم لیگ سے جماعتی سطح پر تعاون حاصل کرنے کی بجائے منتخب مسلم نمائندوں کو ساتھ ملانے کے لئے پورے ملک میں تگ و دو شروع کی۔ کانگریس کی اس مہم سے مسلمانوں کے شکوک و شبہات میں اضافہ ہوا اور وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے تحفظ اور ان کی بقا کے لئے ایک منظم جدوجہد کے ذریعے قومی سطح پر کوئی واضح اور مستحکم حکمت عملی اختیار کرنے کی غرض سے مسلم لیگ پر تکیہ کرنے لگے۔

جولائی 1937ء میں کانگریس نے ان پانچ صوبوں میں جہاں اسے واضح اکثریت حاصل تھی، یک جماعتی وزارتیں قائم کیں جبکہ بمبئی اور صوبہ سرحد میں چھوٹے چھوٹے گروہوں کو ملا کر وزارتیں بنائیں۔ اس طرح برطانوی ہند کے گیارہ صوبوں میں سے سات صوبوں میں کانگریسی راج قائم ہوا۔ یہ حالات مسلم زعماء اور عوام کے لئے خوش آئند نہ تھے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگریسی وزارتوں نے جو اقدامات کئے وہ ہندو راج قائم کرنے کا پیش خیمہ تھے۔ چنانچہ مسلم ہندوستان کے سرکردہ رہنماؤں نے ایک بار پھر اسلامیانِ ہند کے اتحاد اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کی طرف توجہ دی اور اکتوبر 1937ء میں لکھنو میں مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا۔

مسلم لیگ کا اجلاس' لکھنو 1937ء

لکھنو میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں شروع ہوئیں تو کانگریسی حلقوں کی طرف سے مسلمانوں کو خائف کرنے کے لئے طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں۔ ہندو پریس نے اس کی خوب مخالفت کی اور اجلاس کے دوران فرقہ وارانہ جھگڑوں اور تخریبی کارروائیوں کے خدشات کے متعلق خبریں شائع کیں۔ ان خبروں میں کہا گیا کہ مسلم لیگ کی جلسہ گاہ کو آگ لگانے' قائداعظم کے جلوس پر حملہ کرنے اور اجلاس کے مندوبین کو نقصان پہنچانے کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا جو صوبے کے امن و امان کو تباہ کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ان خبروں کی اشاعت کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو ہراساں کرنا اور مسلم لیگ کو لکھنو میں اجلاس منعقد کرنے سے باز رکھنا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے یہ ہتھکنڈے کارگر ثابت نہ ہوئے اور مسلمان پورے زور و شور سے اجلاس کی تیاریوں میں مصروف رہے۔ 13 اکتوبر 1937ء کو جب قائداعظم لکھنو پہنچے تو ان کا نہایت پُرتپاک استقبال کیا گیا اور وہ ایک عظیم الشان جلوس کے ہمراہ فلک شگاف نعروں کی گونج میں شہر سے گزرے۔

15 اکتوبر کو اجلاس کا آغاز ہوا جس میں ملک کے مختلف حصوں سے تقریباً پانچ ہزار مندوبین نے شرکت کی۔

مسلم رہنما حالیہ انتخابات کے نتائج سے سخت مایوس تھے اور ملک کے سیاسی افق پر جو سیاہ بادل منڈلا رہے تھے ان کے اثرات سے بچنے کے لئے مناسب تدابیر پر غور اور انہیں عملی جامہ پہنانے کی پالیسی پر سوچ بچار اس اجلاس کی بحث و تمحیص کا محور تھا' قائداعظم نے اپنے ولولہ انگیز اور بصیرت افروز صدارتی خطبے میں مسلمانوں کی توجہ ان عوامل کی طرف مبذول کروائی جو انتخابات میں مسلم لیگ کی ناکامی کا باعث تھے۔ آپ نے اتحاد و اتفاق' نظم و ضبط اور ایثار و قربانی کی ضرورت پر زور دیا اور مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھے ہو کر قومی احیائے نو کی جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اپنے خطاب میں قائداعظم نے کانگریس کے قول و فعل میں تضاد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:

''ان پڑھ اور بے علم عوام کے سامنے بلند بانگ دعوے اور نعرے دہرائے جاتے ہیں۔ پورنا سوراج' خود مختار حکومت' مکمل آزادی' ذمہ دار حکومت اور ڈومینن جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں بعض حضرات مکمل آزادی کی بات کرتے ہیں لیکن ایک طرف زبان پر مکمل آزادی کے الفاظ اور دوسری طرف ہاتھ میں انڈین ایکٹ 1935ء کا ہونا بے معنی بات ہے۔ وہ لوگ جو مکمل آزادی کی بات کرتے ہیں ان کا مقصد اس لفظ کے معانی سے ہم آہنگ نہیں۔ کیا گاندھی ارون پیکٹ مکمل آزادی سے ہم آہنگ تھا؟ کیا وہ یقین دہانیاں جو عہدوں پر فائز ہونے اور صوبائی آئین پر عمل درآمد سے پہلے حاصل کی گئیں پورنا سوراج سے مطابقت رکھتی ہیں؟ اور کیا کانگریس کی وہ قرارداد جو یقین دہانیاں دینے سے انکار کے بعد عہدے قبول کرنے اور برطانوی پارلیمنٹ کے نافذ کردہ ہندوستانیوں پر مسلط کئے جانے والے

1937ء: پنجاب کے وزیراعظم سردار سکندر حیات، بنگال کے وزیراعظم مولوی فضل الحق اور آسام کے وزیراعظم محمد سعد اللہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔

صوبائی آئین پر عمل کرنے کے سلسلے میں منظور کی گئی کانگریس کے پروگرام' اس کی پالیسی اور اعلانات کے مطابق تھی؟ یہ کاغذی بیانات نعرے اور کھوکھلے الفاظ حصول مقصد کے لئے قطعاً ناکافی ہیں۔

مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا:

''کانگریس کی موجودہ قیادت خصوصاً گزشتہ دس سال کے دوران اس کے قائدین کلی طور پر ہندو نواز حکمت عملی اختیار کر کے ہندوستان کے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ دور کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے ایسے چھ صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت تھی حکومتیں بنا کر اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان ان سے کسی قسم کے انصاف اور رواداری کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ وہ جہاں بھی اکثریت میں تھے اور انہوں نے مناسب خیال کیا تو مسلم لیگ سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ مسلم لیگ ان کے پیش کردہ معاہدہ کو غیر مشروط پر منظور کرے۔

قائداعظم نے مسلمانوں کو موجودہ حالات کی سنگینی سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

''پیشتر ازاں کہ پانی سر سے گزر جائے، میں یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے جب انہیں دوسری باتوں کو پس پشت ڈال کر اپنے آپ کو پوری طرح منظم کرنے اور اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لانے پر توجہ دینی چاہئے..... میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ وہ اپنا مقدر اپنے ہاتھوں میں لیں۔ اس وقت ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو عزم و ایمان کے پیکر ہوں اور جو تن تنہا اپنے عقائد کی خاطر پوری دنیا سے مقابلہ کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔

اکثریتی فرقے کے رویئے کے بارے میں آپ نے فرمایا:

''اکثریت کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ ممکن نہیں، اس لئے کہ کسی ہندو رہنما نے اس مسئلے میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ ایک باعزت سمجھوتہ دو ہم پلہ فریقوں کے درمیان طے پا سکتا ہے اور جب تک فریقین کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے عزت اور خوف نہ ہو، کسی مضبوط سمجھوتے کے لئے کوئی معقول بنیاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ کمزور فریق کی طرف سے امن و آشتی کی پیشکش ہمیشہ کمزوری کا اعتراف سمجھا جاتا ہے اور جارحیت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کے لئے کسی سیاسی شعور کی ضرورت نہیں کہ تمام تحفظات اور سمجھوتوں کی حیثیت ایک کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہوتی اگر ان کی پشت پر طاقت نہ ہو۔

کانگریسی مسلمانوں سے مخاطب ہو کر آپ نے کہا:

کانگریسی مسلمان مکمل شکست تسلیم کر کے بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا شکست خوردہ ذہنیت کی انتہا اور مسلم قوم سے غداری ہے۔

''پورے ملک کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا ہوگا کہ کانگریس کو ملک گیر قیادت حاصل نہیں اور برطانوی حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ موجودہ حالات میں مجلس قانون ساز کا اجلاس طلب کرے گی حقیقت حال کا مذاق اڑانے سے کم نہیں۔ کانگریس کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ ملک کے تمام فرقے اس کی قیادت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے پیشتر غیر ملکی حکمرانوں سے ایسے ادارے کا اجلاس طلب کرنے کا مطالبہ کرنا خصوصاً جبکہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے اور تمام اہم فرقوں نے کانگریس کی قیادت کو تسلیم نہیں کیا گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھنے کے مترادف ہے۔

قائداعظم نے مسلمانانِ ہند کو مخاطب کرتے ہوئے باہمی اتحاد و اتفاق اور ملی مفاد کے لئے سرگرم عمل ہونے کا مشورہ دیا اور فرمایا:

''میں ہندوستان کے ہر شہر' ہر تحصیل' ہر ضلع اور ہر صوبے میں مسلمانوں کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت آپ کا اولین اور اہم ترین فرض ہے کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ایک مثبت اور ترقی پذیر پروگرام وضع کریں اور مسلمانوں کی معاشی' معاشرتی اور سیاسی پیش رفت کے لئے تدابیر مرتب کریں..... سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں جو ق در جوق آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہوں۔ اپنے آپ کو منظم کریں۔ اتفاق و اتحاد کو مستحکم بنائیں اور پوری طرح متحد ہو جائیں۔ تربیت یافتہ سپاہی کی مانند نظم و ضبط کی پابندی کریں۔ اپنے اندر رفاقت اور یگانگت کا جذبہ پیدا کریں۔ اپنی قوم اور ملک کے لئے وفاداری اور ایمانداری سے کام کریں۔ کوئی فرد محنت اور قربانی و ایثار کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ کو ہراساں کرنے اور تکلیف پہنچانے والی قوتیں موجود ہیں۔ اور ممکن ہے آپ کو گوناگوں دشواریوں کا سامنا بھی کرنا پڑے۔ لیکن یاد رکھئے ظلم و ستم کی آگ جو آپ کے لئے جلائی جائے، جبر و تشدد جو آپ پر روا رکھا جائے، دھمکیاں اور تخویف جن کا آپ کو سامنا ہو، ان سب کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے ان پر قابو پاتے ہوئے نامساعد حالات' مشکلات اور مصائب سے ٹکراتے ہوئے اپنی وفاداری و ایقان کو برقرار رکھ کر ہی آپ ایک ایسی قوم بن کر اٹھیں گے جو اپنی عظمت رفتہ کی اہل ہوگی اور جو نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں اپنے مستقبل کو ماضی سے زیادہ شاندار اور تابناک بنائے گی۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو کسی سے خائف نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا مقصد خود ان کے ہاتھوں میں ہے۔ ایک متحد' مضبوط' منظم اور مستحکم قوت کی حیثیت سے وہ کسی بھی خطرے کا سامنا کر سکتے ہیں اور اپنے مقاصد اور متحدہ محاذ کی مخالف کسی قوت سے بھی نبرد آزما ہو سکتے ہیں۔ آپ کے ہاتھوں میں طلسماتی طاقت ہے۔ اپنے فیصلے خود کیجئے، وہ کتنے ہی سخت' اہم اور دور رس نتائج کے حامل کیوں نہ ہوں۔ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سو بار سوچئے لیکن جب ایک بار فیصلہ کر لیا جائے تو پھر آپ سب فرد واحد کی طرح اس پر قائم رہئے۔ سچ اور اخلاص کا دامن نہ چھوڑیئے۔ مجھے یقین ہے کہ کامیابی و کامرانی آپ کے قدم چومے گی۔

قائداعظم کی اس پُر جوش تقریر کا فوری اثر یہ ہوا کہ پنجاب کے وزیراعظم سر دار سکندر حیات، بنگال کے وزیراعظم مولوی فضل الحق اور آسام کے وزیراعظم محمد سعد اللہ مسلم لیگ میں شامل ہوگئے جس سے مسلم لیگ کی حیثیت نمایاں طور پر مستحکم ہوگئی۔ ملک بھر میں اس کی مقبولیت میں پورے زور و شور سے اضافہ ہونے لگا اور لکھنو اجلاس کے بعد چند ماہ کے اندر ہی صرف یوپی میں 170 نئی شاخیں قائم ہوئیں اور ایک لاکھ سے زائد افراد نے مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی۔ یہی صورت حال دوسرے علاقوں کی بھی تھی جہاں مسلم لیگ کا حلقہ اثر تیزی سے بڑھنے لگے اور اس کی جڑیں عوام میں مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگیں۔ قائداعظم کی مخلصانہ قیادت نے اسے عزم و عمل کی صلاحیتوں سے جاندار بنایا اور مسلم لیگ ایک فعال اور متحرک تنظیم کی حیثیت سے عروج و ارتقاء کی منازل طے کرنے لگی۔

لکھنو کا اجلاس کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل تھا۔ اسی اجلاس میں پہلی بار مسلم لیگ کا پرچم لہرایا گیا اور اسی اجلاس میں قائداعظم نے پہلی بار وہ ٹوپی پہنی جو جناح کیپ کے نام سے مشہور ہوئی اور اس روز لکھنو میں اس قسم کی جتنی ٹوپیاں تھیں، سب فروخت ہو گئیں۔

اسی اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ تمام صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹیاں بنائی جائیں اور وہ اپنی جماعت کی پالیسی کے مطابق طرزِ عمل اختیار کریں۔ چنانچہ جلد ہی سات صوبوں میں مسلم لیگ کی پارلیمانی

پارٹیاں وجود میں آئیں۔

مرکزی اسمبلی میں قائداعظم آزاد گروپ کے سربراہ تھے۔ انہوں نے اس گروپ کو ختم کر کے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی قائم کی۔ اگرچہ اس نئی پارٹی کے ممبران کی تعداد قدرے کم تھی لیکن قائداعظم کی قیادت میں مسلمان اراکین میں سیاسی یک جہتی اور فکری ہم آہنگی میں نمایاں اضافہ ہوا اور مسلمانوں کی حیثیت زیادہ موثر بن گئی۔

پانچ صوبوں میں کانگریس راج

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے صوبائی انتخابات کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ کے منشور میں بالعموم کافی یکسانیت تھی۔ مسلم لیگ نے انتخابات میں بنیادی طور پر اس غرض سے حصہ لیا تھا کہ اسمبلیوں میں بیٹھ کر نئے آئین میں حصولِ آزادی اور عوام کے احساسات کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب ترامیم کے لئے جدوجہد کی جائے۔ کانگریس نے بھی اپنے منشور میں نئے آئین کے متعلق ایسے ہی عزائم کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ مقاصد و عزائم کی بالعموم یکسانیت کے باعث سیاسی حلقوں کا عموماً یہی خیال تھا کہ دونوں جماعتیں آئینی معاملات اور صوبائی وزارت سازی میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گی لیکن کانگریسی زعماء کی سوچ بالکل مختلف تھی۔ انہوں نے مسلم لیگ کو نہ صرف نظر انداز کیا بلکہ اپنے بیانات میں اس کے وجود سے ہی انکار کر دیا اور کانگریس کی اعلیٰ ترین سطح پر یہ دعویٰ کیا گیا کہ ملک میں صرف دو فریق ہیں، کانگریس اور برطانیہ۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا فریق نہیں۔ کانگریس کے اس رویے سے مسلمانوں کو بے حد مایوسی ہوئی اور وہ اپنے لئے بحیثیت قوم جداگانہ لائحہ عمل تیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

انتخابی نتائج سے پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرنے کے لئے مارچ 1937ء میں آل انڈیا مسلم کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں کمیٹی نے اتفاق رائے سے ایک قرارداد کی منظوری دی جس میں نئے آئین پر شدید تنقید کی گئی البتہ کانگریسی قیادت کو ان صوبوں میں جہاں کانگریس نے اکثریت حاصل کی ایک جماعتی وزارتیں بنانے کا اختیار دیا گیا۔ لیکن اس شرط پر کہ وزارت بنانے سے پہلے صوبائی گورنر اس بات کی یقین دہانی کرائیں کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو استعمال نہیں کریں گے۔ کانگریس کا یہ مطالبہ اقلیتوں کو ان تحفظات سے محروم کرنے کے مترادف تھا جو انہیں نئے آئین میں صوبائی گورنروں کے خصوصی اختیارات کے حاصل تھے۔ اس مطالبے کا اصل ہدف مسلمان تھے جن پر اب کانگریس کے حقیقی عزائم ظاہر ہوتے جا رہے تھے۔

اپریل 1937ء میں بمبئی، مدراس، یوپی، اڑیسہ اور بہار کے صوبائی گورنروں نے اکثریتی جماعت کی حیثیت سے کانگریس کو صوبائی حکومت بنانے کے لئے مدعو کیا تو مقامی لیڈروں نے پارٹی کے فیصلے کی پابندی کرتے ہوئے گورنروں سے اس امر کی یقین دہانی مانگی کہ وہ صوبائی کابینہ کے کام میں دخل اندازی نہیں کریں گے اور کسی معاملہ میں بھی اپنے خصوصی اختیارات کو بروئے کار نہیں لائیں گے۔ کانگریس کا یہ مطالبہ حکومت کے لئے قابل قبول نہ تھا چنانچہ صوبائی گورنروں نے اسے رد کر دیا۔ لیکن برطانوی حکومت نئے دستور پر عمل درآمد میں کسی قسم کے تعطل یا تاخیر کے حق میں نہ تھی لہٰذا وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے 21 جون 1937ء کو ایک بیان کے ذریعے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کی اور کہا کہ گورنروں کے خصوصی اختیارات صوبائی حکومتوں کے معاملات میں کسی طرح رکاوٹ ثابت نہیں ہوں گے۔

وائسرائے نے اقلیتوں کو بھی مطمئن کرنے کے لئے حکومت کے اس عزم کا اعادہ کیا کہ اقلیتی فرقوں کے حقوق کی نگہداشت انتظامیہ کی ذمہ داری ہوگی اور وہ اس ذمہ داری کو پورا کرے گی۔

وائسرائے نے امید ظاہر کی کہ کانگریس ان توضیحات کے بعد حکومت سے تعاون کرے گی تاکہ ملک میں نئے دستور کے تحت پارلیمانی نظام حکومت قائم کرنے کی کوششیں بارآور ثابت ہوں۔

صوبائی حکومتیں بنانے کے لئے کانگریس کی عائد کردہ شرط کے رد ہو جانے کے بعد اصولاً کانگریس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ صوبوں میں حکومت بنانے سے انکار کر دے لیکن خلاف توقع کانگریس پارٹی کی مجلس عاملہ نے اپنے مطالبے کو پس پشت ڈال کر غیر مشروط پر صوبائی حکومتیں بنانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ کانگریسی قیادت کی یہ قلابازی بے جواز نہ تھی۔ سیاسی حلقوں میں یہ بات پورے وثوق سے بار بار کہی جا رہی تھی کہ وائسرائے نے در پردہ کانگریس کو یقین دہانی کرائی ہے کہ گورنر صوبائی وزارتوں کے کام میں قطعاً مداخلت نہیں کریں گے اور کانگریسی حکومتیں اپنی پالیسی پر آزادانہ طور پر عمل پیرا ہو سکیں گی۔ چنانچہ جولائی 1937ء میں چھ صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی کانگریس راج کا آغاز ہوا جو درحقیقت ہندو راج تھا۔

ہندو اکثریتی صوبوں میں وزارت سازی کے دوران کانگریس نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا وہ کانگریسی قیادت کی ذہنیت کا عکاس تھا۔ یوپی میں مسلمان اقلیت ہونے کے باوجود معاشرے میں موثر مقام رکھتے تھے اور صوبے کی تہذیب و تمدن پر ان کی ثقافتی روایات کے گہرے نقوش ثبت تھے۔ صوبائی اسمبلی کی 228 نشستوں میں سے مسلمانوں کے لئے 64 نشستیں مخصوص تھیں۔ نئے آئین کے تحت ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کو 27 حلقوں میں کامیابی حاصل ہوئی جبکہ کانگریس کا صرف ایک مسلم امیدوار کامیاب ہو سکا باقی 36 نشستیں آزاد مسلم امیدواروں اور نیشنل ایگریکلچرل پارٹی کے نمائندوں کے حصے میں آئیں۔ انتخابات کے دوران مسلم لیگ اور کانگریس نے یوپی کے بیشتر حلقوں میں پورے تعاون سے کام لیا تھا اس لئے توقع کی جاتی تھی کہ مسلم لیگ کے منتخب نمائندوں کو بھی صوبائی کابینہ میں مناسب نمائندگی دی جائے گی۔ لیکن کانگریسی زعماء نے اس موقع پر جو وطیرہ اختیار کیا وہ مسلم لیگ کے خلاف ان کے مخصوص انداز فکر کو ظاہر کرتا تھا۔ کانگریس نے مسلم لیگ کے ارکان کو کابینہ میں شامل کرنے کے لیے چند شرائط عائد کیں جو کسی باحمیت اور غیرت مند قوم یا جماعت کے لئے قطعاً قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کانگریس کی طرف سے صوبوں میں وزارت سازی کے کام کی نگرانی پر مامور تھے، مسلم لیگی اراکین کی شمولیت کے بارے میں کہا:

''مسلم لیگی نمائندوں کو وزارت میں اس وقت شامل کیا جائے گا جب یوپی کی اسمبلی میں مسلم لیگی ارکان ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت اختیار نہ کریں۔ اسمبلی کے مسلم لیگی ممبر کانگریس پارٹی میں ضم ہو جائیں۔ اور وہ تمام فرائض ادا کریں جو کانگریسی ممبران ادا کرتے ہیں۔ وہ کانگریس کے عائد کردہ قواعد و ضوابط کی پابندی کریں۔ مسلم لیگ کا صوبائی پارلیمانی بورڈ ختم کر دیں اور آئندہ کسی ضمنی انتخاب کے لئے اپنا امیدوار نامزد نہ کریں بلکہ کانگریسی امیدوار کی حمایت کا عہد کریں۔ اگر کسی وقت کانگریس اسمبلی یا وزارت سے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کرے تو یہ ممبران بھی اس فیصلے کی پابندی کریں''۔

ان شرائط کی تشریح اور توضیح کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک اخباری بیان میں مزید فرمایا:

''اگر یہ شرائط تسلیم کر لی گئیں اور صوبائی اسمبلی کے مسلم لیگی اراکین کانگریس پارٹی میں شامل ہو گئے تو اس صورت میں ان کی علیحدہ حیثیت ختم ہو جائے گی اور ایسی حالت میں انہیں صوبائی کابینہ میں نمائندگی دینا مناسب ہوگا''۔

کانگریس کے اس غیر منطقی رویئے کے نتیجے میں مسلم لیگ کے ارکان کسی صوبائی وزارت میں شامل نہ ہو سکے۔ کانگریسی وزارتوں میں جو چند مسلمان وزراء لئے گئے وہ کانگریس پارٹی کی ہدایات کے پابند تھے اور مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کے لئے کسی آزادانہ اقدام کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

کانگریس راج کی ستم کاریاں

جن چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں وہاں مسلمانوں کے حقوق کی پامالی اور ان کے عقائد کی بے حرمتی کا سلسلہ روز اول ہی سے شروع ہو گیا اور کانگریسی مسلمان جو فکری انتشار یا ذاتی وجوہ کے باعث اس جماعت کے ہم نوا بنے تھے، انتہائی بے حسی سے ان زیادتیوں کا تماشہ دیکھتے رہے۔ سی پی کی کانگریسی حکومت کے ایک ہندو وزیر مسٹر دوارکا پرشاد مصرا کے متعلق ایک نہایت شرمناک واقعہ کانگریسی قیادت کی ''انصاف پرستی'' اور ''انسان دوستی'' کی ''روشن مثال'' ہے۔

مسٹر دوارکا پرشاد مصرا پر وزارت سنبھالنے سے چند ہی روز پہلے ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کرنے اور اس کی آبرو ریزی کرنے کا الزام عائد ہوا تھا۔ پولیس کی تفتیش میں مسٹر مصرا صد فیصد مجرم ثابت ہو چکے تھے مگر وزارت سنبھالتے ہی نہ صرف ان کے خلاف کارروائی حکماً بند کر دی گئی بلکہ ان پولیس افسروں کو بھی سخت پریشان کیا گیا جنہوں نے تفتیش کی تھی۔

اس دوران کانگریس اقتدار والے صوبوں میں اس سے بھی بدتر واقعات رونما ہوئے لیکن ان کی تفصیلات بیان کرنا یہاں مناسب نظر نہیں آتا' البتہ ان اقدامات کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جو مسلمانوں کے عقائد اور جذبات کے منافی تھے اور جن کے خلاف مسلمانوں نے شدید احتجاج بھی کیا تھا لیکن اقتدار کے نشے میں مست کانگریسی زعماء نے کوئی پرواہ نہ کی۔

ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے انہوں نے کانگریسی حلقہ اثر کو وسیع کرنے کے لئے اپنی جماعت کے سرکردہ رہنماؤں کو ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے روانہ کیا اور خود مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے بارے میں یوں ''گوہر افشانی'' کی۔

''میں نے اسلامی تہذیب و تمدن کا مفہوم سمجھنے کی بڑی کوشش کی لیکن میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی جستجو میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے خیال میں اسلامی تمدن کی بظاہر نشانی ایک خاص قسم کا پاجامہ ہے جو نہ زیادہ لمبا ہو اور نہ زیادہ اونچا۔ ایک خاص انداز سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی رکھنا اور ایک ٹونٹی دار لوٹا''۔

جس جماعت کا سربراہ مسلمانوں کے بارے میں یہ خیالات رکھتا ہو اس جماعت کے کارکن اپنے ہم وطنوں کے متعلق بھلا کب اچھے محسوسات رکھتے ہوں گے۔ چنانچہ مسلمانوں کے جذبات و احساسات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کانگریس کی صوبائی حکومتوں نے اپنے اپنے علاقے میں ایسے ایسے اقدامات کئے جن سے نہ صرف تعلیم' زبان اور ثقافت پر منفی اثرات پڑے بلکہ وہ مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے منافی بھی تھے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ان آمرانہ فیصلوں اور جابرانہ طرز عمل کے خلاف احتجاج کئے اور مسلم لیگ کے مرکزی اور مقامی دفاتر میں شکایات بھجوانا شروع کیں۔

پیر پور رپورٹ (1938ء)

ان روز افزوں شکایات کے پیش نظر مسلم لیگ کونسل نے 20 مارچ 1938ء کو پیر پور کے راجہ محمد مہدی کی نگرانی میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس نے تمام متعلقہ صوبوں کا تفصیلی دورہ کیا اور عوام کے مختلف طبقوں کے افراد سے معلومات حاصل کرنے کے بعد آٹھ ماہ کے عرصے میں ایک مفصل رپورٹ مرتب کی جو ''پیر پور رپورٹ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس رپورٹ سے کانگریسی حکومت کی چیرہ دستیاں بے نقاب ہوئیں اور کانگریس کی عوام دوستی کا پردہ چاک ہوا۔ اس رپورٹ میں درج بے شمار دل خراش واقعات میں سے چند ایک کا ذکر محض ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر کیا جاتا ہے۔

1۔ تمام تعلیمی اداروں میں ہر روز صبح ''بندے ماترم'' کا نغمہ گانے کا حکم دیا گیا طلباء میں مسلمان بچے بھی یہ نغمہ گانے پر مجبور تھے اگرچہ اس کے بعض حصے اسلامی تعلیمات اور عقیدۂ توحید کے خلاف تھے۔

2۔ سی پی میں تمام تعلیمی اداروں میں مسٹر گاندھی کی تصویر لگائی گئی اور ایک سرکاری مکتوب کے ذریعے یہ ہدایات دی گئیں کہ گاندھی کی تصویر کی پوجا کی جایا کرے۔

3۔ سرکاری طور پر کہا گیا کہ درسی کتابوں میں ہندو مت کی تعلیم اور ہندو سورماؤں کے حالات شامل کئے جائیں۔

4۔ ''ودیا مندر'' نامی سکیم کو رائج کرنے کا اہتمام کیا گیا جس کے تحت تعلیم بالغاں کے بہانے مسلمان نوجوانوں سے ایسے کام کروائے جاتے جو ان کے عقائد سے متضاد تھے مثلاً سرسوتی دیوی کی مورتی کو جھک کر سلام کرنا وغیرہ۔

5۔ ہندی کی سرپرستی کے پردے میں اردو کو ختم کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا گیا۔

6۔ گاؤکشی کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دیا گیا اور خلاف ورزی کرنے والوں پر فوجداری مقامات قائم کئے گئے۔

7۔ ہندو اکثریتی صوبوں کے دور افتادہ مقامات پر ہندوؤں نے بے بنیاد الزامات کی آڑ میں فرقہ وارانہ فسادات کئے اور مسلمانوں کو طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا۔

8۔ برار میں ایک گاؤں چاند پور بسوا ہے جس کی اس وقت کل آبادی تین ہزار تھی۔ اس میں سے ایک تہائی مسلمان تھے۔ کانگریس راج کے آتے ہی اس گاؤں کا بدنام زمانہ غنڈہ جگدیو پنچیل مقامی کانگریس کا صدر بن گیا۔ مسلم دشمنی اس کے خمیر میں تھی۔ مسلمان آبادی کو پریشان کرنے کے لئے اس نے ایک گروہ بنایا جس نے مارچ 1939ء میں ایک روز جگدیو پنچیل کی قیادت میں مقامی جامع مسجد پر عین اس وقت حملہ کیا جب نمازی مصروف عبادت تھے۔ مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا جس میں جگدیو زخمی ہو گیا اور بعد میں مر گیا۔ کانگریسی حکومت نے جگدیو کے قتل کو ایک سنگین واقعہ قرار دیا اور صوبے کے وزیر اعلیٰ نے اسمبلی میں اس سانحہ کی تحقیقات کرانے کا وعدہ کیا۔ پولیس نے قتل کے الزامات میں 150 مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں کو حراست میں لے لیا۔ دوران تفتیش ان سے نہایت اذیت ناک سلوک کیا گیا۔ سارا سارا دن چلچلاتی دھوپ میں بھوکا پیاسا کھڑا رکھا جاتا اور رات کو ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ٹھونس دیا جاتا۔ یہ سفاکانہ عمل تقریباً ایک ماہ تک جاری رہا۔ اسی دوران دو آدمی دم گھٹنے سے اللہ کو پیارے ہوئے۔ 42 آدمیوں پر قتل کا مقدمہ قائم کیا گیا اور باقی افراد رہا کر دیئے گئے۔ سیشن جج کی عدالت سے 6 ملزموں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور 24 عمر قید کے مستحق قرار پائے۔ مسلمانوں نے اس فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل دائر کی جس کا فیصلہ سناتے ہوئے انگریز جج نے جو انکشافات کئے وہ ہندوؤں کی مسلم دشمنی پر شرمناک تبصرہ تھا۔ جج نے کہا:

''درحقیقت یہ مقدمہ نہایت اندوہناک ہے۔ جس میں 43 آدمی قتل کے الزام میں ماخوذ ہیں اور گواہ پر گواہ جھوٹی اور سکھائی ہوئی شہادتیں دینے کے لئے پے در پے آ رہے ہیں۔ ان میں سے سات گواہ تو نابالغ بچے ہیں جنہیں جھوٹی گواہی دینے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ ایسے مقدموں میں گواہی دینے یا کسی اور سے دلوانے کا یہ مطلب ہوا کہ گواہ اور اس کے ساتھی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح

معصوم انسانوں کو پھانسی دلوائی جائے۔ انسانی پستی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ محض اپنے مخالفین کی جانیں لینے کے لئے کمسن اور معصوم بچوں سے جھوٹی گواہیاں دلوائی جائیں''۔

کانگریسی راج کے دوران مسلمانوں پر کئے جانے والے مظالم کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد رپورٹ کے آخر میں کمیٹی کے ارکان کا تبصرہ حقیقت حال کی جامع عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے کہا:

''کانگریس کے نزدیک قوم پرستی کے اصول جو بھی ہوں اور اس عرصے میں ہونے والے حادثات و واقعات کا جو بھی جواز پیش کیا جائے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عام ہندو، ہندو راج اور کانگریس حکومت کو ہندو حکومت کا ہم معنی سمجھتا ہے۔''

''پیر پور رپورٹ'' کے ساتھ ہی ''شریف رپورٹ'' کے نام سے ایک اور دستاویز شائع کی گئی جس میں ان صبر آزما حالات کا مفصل احاطہ کیا گیا جن سے مسلمانوں کو کانگریسی عہد حکومت میں واسطہ پڑا۔ اسی طرح 1939ء میں کلکتہ سے ''مسلم سفرنگز انڈر کانگریس رول'' کے عنوان سے بھی ایک کتاب منظر عام پر آئی جس کے مصنف مسٹر فضل الحق نے کانگریس راج میں مسلمانوں کی مشکلات و مصائب اور مظلومی و محرومی کی جو روداد بیان کی ہے اس سے جمہوریت اور عدم تشدد کی دعویدار جماعت کانگریس کا حقیقی چہرہ پوری طرح بے نقاب ہوتا ہے۔

دریں اثناء ''پیر پور رپورٹ'' کے شائع ہوتے ہی ملک بھر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف سے ہندوؤں کے متعصبانہ اور ظالمانہ اقدامات پر شدید احتجاج کیا گیا۔ اور ان کے فوری سدباب کا مطالبہ کیا گیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے رپورٹ میں بیان کئے گئے واقعات کی تردید کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی لیکن حقائق پر پردہ ڈالنے کی ہر کوشش سعی لاحاصل ثابت ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کے ردعمل کو فرو کرنے کی غرض سے مسلم کش فسادات اور دوسرے اقدامات کے بارے میں خبروں کو من گھڑت اور بے بنیاد ٹھہرایا اور مخالفین کو کانگریسی صوبوں کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ پنڈت نہرو کی اس ''دیدہ دلیری'' پر کانگریس کے مرکزی رہنماؤں میں سے ایک دل برداشتہ ہندو وزیر نے انتہائی بے باکی سے کہا کہ ''حقیقت حال جاننے کے لئے پنڈت نہرو جب چاہیں خود ہی سی پی کا دورہ کرلیں۔ ان پر سب کچھ روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا''۔

ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگریس راج قائم کرنے کے بعد کانگریسی لیڈر مسلم اکثریتی صوبوں میں منتخب ارکان پر مشتمل وزارتوں کے خلاف نت نئی سازشوں میں مصروف ہو گئے۔

صوبہ سرحد میں انتخابات کے بعد نواب صاحب زادہ عبدالقیوم کی پروگریسو پارٹی کو 16 مسلمان نشستوں پر کامیابی ہوئی جبکہ کانگریس کے 15 مسلمان نمائندے منتخب ہوئے۔ دونوں پارٹیوں نے حکومت سازی کے لئے پورے زور و شور سے تگ و دو شروع کی اور دوسرے چھوٹے گروپوں کو جن میں سکھ، ہندو، نیشنلسٹ' ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی اور آزاد ارکان شامل تھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ صاحب زادہ عبدالقیوم جو صوبہ سرحد میں قومی خدمات کے باعث تمام طبقوں میں یکساں طور پر واجب الاحترام تھے، ہندو، سکھ، نیشنلسٹ اور ہزارہ ڈیموکریٹک گروپ کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور مارچ 1937ء کے آخر میں انہوں نے صوبہ سرحد میں مخلوط وزارت قائم کی جو صوبے میں پہلی نمائندہ حکومت تھی۔ تاہم روز اول سے ہی انہیں کانگریس کی مخالفت کا سامنا رہا۔ کانگریس بھلا یہ بات کب گوارا کر سکتی تھی کہ صاحب زادہ عبدالقیوم جیسی شخصیت حکومت کی قیادت کرے جس نے سرحد کو صوبے کا درجہ دلانے میں شبانہ روز محنت کی اور مسلمانانِ سرحد کی تعلیمی ترقی سے والہانہ وابستگی کے باعث ''سرسید سرحد'' کہلانے کا فخر حاصل کیا۔

کانگریس ہائی کمان نے صاحب زادہ عبدالقیوم کی وزارت کو ختم کروانے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندرا پرشاد کو صوبہ سرحد بھیجا۔ مولانا آزاد نے ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے ارکان کو مخلوط حکومت سے علیحدہ ہونے پر رضامند کرالیا اور ڈاکٹر راجندرا پرشاد کی کوششوں سے ہندو سکھ نیشنلسٹ پارٹی کے دو ارکان حکومت کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ 22 ستمبر کو ایبٹ آباد کے ٹاؤن ہال میں پچاس رکنی صوبائی اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں ڈاکٹر خان صاحب نے صاحب زادہ عبدالقیوم کی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی۔ تحریک کے حق میں 27 اور اس کے خلاف 22 ووٹ ڈالے گئے۔ اس طرح کانگریس نے صوبے کی پہلی منتخب حکومت کو سیاسی جوڑ توڑ اور سازباز کے ذریعے ہٹا کر اقتدار حاصل کر لیا اور ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں صوبے کی پہلی کانگریس حکومت وجود میں آئی۔

مسلم اکثریت والے دوسرے صوبوں کی غیر کانگریسی حکومتیں بھی کانگریس کی دست درازیوں اور سازشوں سے محفوظ نہ تھیں۔ پنجاب میں صوبائی حکومت کو زک پہنچانے کے لئے سکھوں کے تعاون سے کئی بار فسادات کروانے کی کوشش کی گئی لیکن چنداں کامیابی

النصر لیب

مستند اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ادارہ

ایک ہی چھت کے نیچے تمام اقسام کے معیاری لیبارٹری ٹیسٹ'

ایکسرے' ای سی جی اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولیات

محترمہ ڈاکٹر اسرار احمد کی نگاہ میں قابل اعتماد ادارہ

خصوصی پیکج خصوصی میڈیکل چیک اپ ☆ الٹرا ساؤنڈ ☆ ای سی جی ☆ ہارٹ ☆ ایکسرے چیسٹ ☆ لیور ☆ کڈنی ☆ جوڑوں سے متعلقہ متعدد ٹیسٹ/ ہیپاٹائٹس بی اور سی ☆ بلڈ گروپ ☆ بلڈ شوگر ☆ مکمل بلڈ اور مکمل پیشاب ٹیسٹ صرف 1500 روپے میں کروائیں۔

تنظیم اسلامی کے رفقاء اور ندائے خلافت کے قارئین اپنا ڈسکاؤنٹ کارڈ لیبارٹری سے حاصل کریں۔

ISO 9001:2000
QMS CERTIFIED CLINICAL LAB
BY MOODY INTERNATIONAL

النصر لیب :950۔بی' مولانا شوکت علی روڈ' فیصل ٹاؤن (نزد راوی ریسٹورنٹ) لاہور

فون:5162185-5163924 موبائل:0300-8400944

E-mail: alnasar@brain.net.pk Website: www.alnasar.com.pk

حاصل نہ ہوئی۔ ادھر بنگال میں مولوی فضل الحق کی حکومت کو متزلزل کرنے کے لئے ریشہ دوانیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اسی طرح سندھ میں بھی کانگریس کی مسلسل مداخلت اور سیاسی سودابازی کے ہاتھوں مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔

کانگریس کے طرزِ عمل پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک انگریز مبصر نے کہا:

”کانگریس کے طریقہ کار میں جمہوریت کا شائبہ تک نہیں۔ کانگریس دراصل چند مخصوصین کی حکومت کا نام ہے جو گاندھی جی کے زیر فرمان ہے۔ ان کے حکم و ایماء پر وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ عوام کے نمائندوں کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں“۔

”...... اپنے کارناموں سے انہوں (کانگریسی زعماء) نے ہندوستانیوں پر واضح کر دیا ہے کہ کانگریس کے نزدیک سوراج کا مطلب کیا ہے۔ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ آئین نے انہیں جو تحفظات دیئے ہیں وہ کس قدر بے جان اور بے حقیقت ہیں۔ ان کا مقدر تو اب ایک غیر ذمہ دار پارٹی کے رحم و کرم پر ہے، جس کا مرکز واردھا ہے“۔

غرضیکہ کانگریس راج کے دوران جس انداز سے مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوئی اور جمہوریت کے نام پر جو غیر جمہوری اقدامات کئے گئے، انہیں دیکھ کر کسی بھی ذی ہوش اور باحمیت مسلمان کیلئے یہ سوچنا بھی بعید از قیاس تھا کہ وہ کانگریسی ترنگے کے سائے میں بندے ماترم کی گونج میں اس منزل کو حاصل کر سکے گا جہاں وہ حقیقی معنوں میں آزاد و خود مختار ہوگا اور اپنے عقائد و روایات کے مطابق بلا روک ٹوک زندگی بسر کر سکے گا۔ چنانچہ ان حالات میں مسلمانوں کی نظریں مسلم لیگ پر مرکوز ہوئیں اور اس جماعت کا سبز ہلالی پرچم ان کی امنگوں اور آرزوؤں کی علامت بن گیا۔

دوسری جنگ عظیم کا آغاز (1939ء)

ستمبر 1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ جرمنی کی ہیبت ناک جنگی تیاریوں سے پورا یورپ لرزہ براندام تھا۔ قرائن سے نظر آتا تھا کہ اپنی شدت میں یہ لڑائی پہلی جنگ عظیم کو بھی مات کر دے گی۔ وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے فوری طور پر تمام سیاسی جماعتوں کی اپیل شائع کی اور انہیں الگ الگ خطوط بھی لکھے۔ اس نے اپنی اپیل میں کہا کہ وہ اپنی اپنی رنجشوں، شکایتوں اور رقابتوں کو بھول کر برطانیہ کو جنگ جیتنے میں مدد دیں۔ اس اپیل کا متوقع اثر نہ ہوا۔

وائسرائے اور گاندھی کی طویل ملاقات ہوئی۔ گاندھی نے برطانیہ کے ساتھ اس شدومد سے ہمدردی کا اظہار کیا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ لیکن کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ حکومت برطانیہ اس جنگ میں اپنے اغراض و مقاصد واضح کرے اور کہہ دیا کہ اگر یہ جنگ صرف جمہوریت کی بقا کے لئے لڑی جا رہی ہے تو تعاون کی پہلی شرط یہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو آزاد کر دے۔

ہندوستان کی آزادی سے کانگریس کی مراد ہمیشہ یہی تھی کہ غیر مشروط طور پر حکومت کو اکثریت کے حوالے کر دیا جائے، کیونکہ جمہوریت کا یہی تقاضا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اکثریت، یعنی تین چوتھائی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔

اس مطالبے کو دوسرے پیرایے میں بیان کرتے ہوئے کانگریس کے لیڈر نہایت دل آویز اور اخلاقی انداز میں قومی حکومت کے قیام پر زور دیتے تھے۔ مسلم لیگ کا موقف مختلف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ 1935ء کا ایکٹ اقلیتوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں نے کانگریسی حکومتوں کے مظالم اور زیادتیوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور انہوں نے کانگریسی حکومتوں کو مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حقوق پامال کرنے کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ فلسطین کے معاملے میں بھی حکومت برطانیہ کی روش انتہائی ناتسلی بخش اور تکلیف دہ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ حکومت 1935ء کے ایکٹ کو اور اس کے تحت قائم ہونے والی فیڈریشن کو کالعدم قرار دے دے۔

یوم نجات (12 دسمبر 1939ء)

غرضیکہ مسلم لیگ اور کانگریس میں سے کوئی بھی جماعت حکومت کے ساتھ غیر مشروط تعاون کے لئے تیار نہ تھی۔ وائسرائے نے اس نئی مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا اور باون رہنماؤں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ان میں آئندہ دستور کے خدوخال کے متعلق شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس لئے فی الحال کسی دستوری تبدیلی یا ترمیم کے موضوع پر کوئی گفت و شنید نہیں کی جا سکتی۔ جنگ کے خاتمے پر ہی دستوری صورت حال کا جائزہ لیا جائے گا۔ کانگریس نے وائسرائے کے بیان کو غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے اپنی پارٹی کی صوبائی وزارتوں کو مستعفی ہونے کی ہدایات جاری کر دیں اور ارکان کو اسمبلیوں کا بائیکاٹ کرنے کا حکم دے دیا۔ کانگریس ہائی کمان کا خیال تھا کہ اس اقدام سے حکومت کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور ان کو خوشامد کر کے دوبارہ واپس بلا لیا جائے گا، لیکن وائسرائے کانگریس کو ممنون کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ کانگریس کے رہنما مختلف طریقوں سے وائسرائے پر دباؤ ڈالتے رہے، لیکن وائسرائے کو اس معاملے میں کوئی جلدی نہ تھی۔

12 دسمبر 1939ء کو قائداعظم کی ہدایت کے مطابق تمام ہندوستان میں چھوٹے دیہات سے لے کر بڑے شہروں تک مسلم لیگ نے کانگریس راج کے خاتمے پر ”یوم نجات“ منایا، جس میں دوسری اقلیتوں نے بھی شرکت کی۔

حصہ پنجم

قرارداد لاہور سے قیام پاکستان تک

1940ء — 1947ء

دوقومی نظریہ کا وہ طویل سلسلہ جو عرصۂ دراز سے اپنی حقانیت منوانے کے لئے اور بالخصوص ہندوستان میں مسلم اقتدار کے زوال کے بعد سے چلا آ رہا تھا اب تک زیادہ تر تصورات و دلائل کی کشمکش سے گزرتا آیا تھا۔ اس نظریے کو باقاعدہ عملی حکمت عملی 1940ء کے آغاز میں لاہور کے ایک بڑے جلسۂ عام میں ''قرارداد لاہور'' کی صورت میں ملی۔

ہندوستان کے پانچ صوبوں میں 1937ء کے انتخابات کے بعد کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں پر ثابت کر دیا تھا کہ کانگریس خالصتاً ہندوؤں کی جماعت ہے۔ بندے ماترم کا قومی نغمہ' ودیا مندر اور وار دھا کی تعلیمی سکیم' گاؤکشی پر سزائیں' ترنگا جھنڈا ہر سکول اور سرکاری دفتر میں' شدھی اور سنگھٹن کی مستقل تلواریں' ہر سرکاری ادارے میں مسلمانوں کی اچھوتوں جیسی مستقل اقلیت ان سب باتوں نے مسلمانانِ ہند کی آنکھیں کھول دیں۔ کانگریسی وزارتوں کی برطرفی پر ''یومِ نجات'' منانے کے بعد 3 فروری 1940ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ ماہ مارچ میں 22 تاریخ کو لاہور میں ایک بڑے جلسۂ عام کا انتظام کیا جائے۔ جس میں مسلمانوں کے لئے ایک الگ خودمختار ریاست کا مطالبہ کیا جائے' جو دوقومی نظریے کی اساس پر صرف مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے پیش نظر تشکیل دی جائے۔

تقسیم ہند کے تصور کی تاریخ

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز 23 مارچ 1940ء کی ''قرارداد لاہور'' سے ہوتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''تلاشِ ہند'' Discovery of India میں لکھا ہے کہ دوقومی نظریہ اور تقسیم ہند کا تصور محمد علی جناح کے ذہن کی اختراع تھی اور اس سے پہلے اس تصور کا کوئی وجود نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز 1937ء سے ہوا' جب یوپی کانگریس نے مسلم لیگ کے دو لیڈروں کو صوبائی وزارت میں لینے سے انکار کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں حقیقت سے بعید ہیں۔ تحریک پاکستان کی جڑیں بہت گہری اور لمبی ہیں اور اس کا پس منظر بہت وسیع ہے۔ ایک مرتبہ قائداعظم سے کسی نے اسی نکتے پر استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ پاکستان کی تحریک اُسی دن سے شروع ہوئی جب ہندوستان میں پہلا ہندو مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ یہ طرزِ فکر حقیقت کے بہت قریب ہے۔ جدید دور کے ٹائن بی جیسے مورخوں کی رائے میں پاکستان ایک طویل تاریخی اور مسلسل عمل کا نتیجہ ہے اور وہ ہے انڈیا کے ہندو معاشرے پر اسلام کا عمل اور ردِعمل' لیکن انڈیا کے مصنف' فلسفی اور مورخ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا' ہندوستان کی تقسیم اور ایک الگ اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ نہ تو کسی فوری واقعے کا نتیجہ تھا اور نہ کسی فردِ واحد کا پیش کردہ تصور۔ مسلمانوں کی جداگانہ قومیت اور اس کی بنیاد پر الگ اسلامی مملکت کے قیام کا تصور زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا۔ یہ تصور اتنا حقیقت پسندانہ تھا کہ کئی غیر مسلم اور انصاف پسند مفکرین نے بھی اس کی تائید کی۔ دوقومی نظریے کی تائید میں جو حقائق و بیانات زمانۂ قدیم سے چلے آ رہے تھے' اُن کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

630ء کے لگ بھگ: بقول قائداعظم پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔

711ء: محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں کا اجتماعی ورود۔

1600 تا 1857ء: (مجدد الف ثانیؒ' شاہ ولی اللہؒ' ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے تحریکیں' جو مسلمانوں کو ہندو تہذیب سے نکالنے اور اسلام کی طرف رجوع کرنے کے لئے تھیں)

1857ء: انگریز کے خلاف کھلا انقلاب۔ ہندوؤں نے انگریزی اقتدار جمانے میں مدد کی' اور مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تحریکیں چلائیں۔

1858ء: جان برائٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بل پر بحث کرتے ہوئے کہا: ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں' جہاں مختلف قومیں اور زبانیں ہیں' ایک متحدہ اور مستحکم سلطنت کبھی قائم نہیں ہو سکتی''۔

1867ء: بنارس کے کمشنر کے سامنے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے کہا: ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے ان سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں' بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا' وہ دیکھے گا''۔

1879ء: سید جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لئے ایک ایسی اسلامی جمہوریہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی' جس میں وسط ایشیا کے اسلامی ممالک' افغانستان اور برعظیم کے مسلم اکثریت کے علاقے شامل ہوں۔

1884ء: سر جان سٹریچی نے کہا: ہندوستان نہ ایک ہے' نہ کبھی ایک تھا۔ برطانوی راج سے جو اتحاد پیدا ہو گیا ہے' وہ محض مصنوعی ہے اور اس سے کبھی ایک متحدہ قومیت جنم نہیں لے سکے گی''۔

1887ء: سرسید کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور و مقبول نظم ''شکوۂ ہند'' کہی جس کے پہلے شعر میں دوقومی نظریے کی طرف اشارہ ہے۔

1940ء: فروری۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں علیحدہ مسلم ریاست کے حصول پر غور کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کی باقاعدہ قرارداد مارچ میں ہونے والے اجلاس لاہور میں پیش کی جائے۔

رخصت اے ہندوستان اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن، ہم بدیسی مہماں

اس نظم کے دوسرے بند میں مولانا حالی نے مزید وضاحت سے ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا:

تھی ہماری قوم و ملت، رسم و عادت سب جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی، اردو زباں تیری الگ
تجھ سے تھے ہم اجنبی، اور ہم سے تُو آشنا

1886ء: اردو کے پہلے ناول نویس اور سرسید تحریک کے ایک اور رکن ڈپٹی نذیر احمد نے 15 اکتوبر 1888ء کو ٹاؤن ہال دہلی میں انڈین نیشنل کانگریس کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک طفلِ مکتب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے، لفظ انڈین کے ساتھ لفظ ''نیشنل'' سن کر کان کھڑے گا کہ کجا ہندوستان اور کجا نیشنلٹی۔ تمام روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس میں اس کثرت سے مختلف العقائد، مختلف الرسم، مختلف العادات اور مختلف الاغراض قومیں رہتی ہوں جیسے ہندوستان میں۔ پس ایسے اجزائے متضاد کو یکجا کر کے ایک معجون مرکب کو ''قوم واحد'' قرار دینا صریح مغالطہ دہی ہے مگر کس کو؟ ان ناسمجھ انگریزوں کو جو انڈیا کا اتنا ہی حال جانتے ہیں کہ ایک بڑی زرخیز کالونی ہے اور بس۔ بھلا شکلی تفریقوں کا لحاظ نہ بھی کرو اور ہندو ہندو ایک اور مسلمان مسلمان ایک قوم سمجھو تو خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں، مگر ہندو اور مسلمان کیونکر ایک قوم میں شامل ہو کر ''انڈین نیشن'' کہلا سکتے ہیں۔ گنگا اور سندھ کا سنگم ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا تو ہندو اور مسلمان کا''۔

1890ء: مولانا عبدالحلیم شرر: ''بہتر ہوگا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر کے تبادلۂ آبادی کر لیا جائے''۔

1899ء: تھیوڈور موریسن: برِاعظم کی پوری مسلم آبادی کو آگرہ سے لے کر پشاور تک کے علاقے میں مجتمع کیا جائے''۔

1917ء: اشتراکیت کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ اسٹاک ہام میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر عبدالستار خیری نے ایک تحریری بیان میں برِعظیم کو مسلم اور ہندو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1920ء: بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تحریک خلافت کی سخت مخالفت کی۔ ان میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی بھی شامل تھے۔ انہوں نے 1920ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا، جس میں ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا کہ ہندوستان کو مذہبی بنیاد پر ''ہندو انڈیا'' اور ''مسلم انڈیا'' میں تقسیم کیا جائے۔

1922ء: انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار محمد گل خان نے ایک کمیشن کے روبرو اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا: ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ 23 کروڑ ہندوؤں کو جنوب میں اور 8 کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا سارا علاقہ مسلمانوں کو دے دینا چاہئے''۔

1923: بھائی پرمانند، مشہور ہندو رہنما: ''ہندوستان کو اس طریقے سے تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک خطے میں اسلام کو برتری حاصل ہو اور دوسرے خطے میں ہندو مت کو''۔

1924: مولانا حسرت موہانی نے مسلمان اکثریتی صوبوں کو مسلمان ریاستوں میں اور ہندو اکثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدلنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1924ء: لالہ لاجپت رائے، مشہور ہندو رہنما نے چون و چرا کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا ایسا منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق انہوں نے قبول کر لیا کہ مسلمانوں کو شمال مغربی سرحدی صوبہ، مغربی پنجاب، سندھ اور مشرقی بنگال دے دیا جائے۔

1925ء: مولانا محمد علی جوہر نے برِعظیم کے شمالی خطوں کے لوگوں کے لئے اقتصادی، عسکری، مذہبی اور معاشرتی اسباب و وجوہ کی بناء پر علیحدگی اور حق خود ارادیت کی حمایت کا اعلان کیا۔

1925ء: ولیم آرچی بالڈ، پرنسپل ایم اے او کالج، علی گڑھ نے شمال مغربی علاقے اور افغانستان کے مضبوط مسلم اتحاد کی پیش بینی کی۔

1927ء: مولانا عبیداللہ سندھی نے ہندوستان کو تین منطقوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ منطقے شمال مغربی، مشرقی اور جنوبی علاقوں پر مشتمل تھے۔ شمال مغربی منطقے میں پنجاب، صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان کو شامل کیا گیا اور مشرقی منطقے میں بنگال۔

1928ء: سر آغا خان: ''جب ہندوستان غیر ملکی تسلط سے آزاد ہو جائے گا تو اس کی وحدانی، غیر وفاقی حکومت نہیں ہو سکتی...... شمال مغرب اور مشرق کے مسلمان اپنی مرضی کی آزاد ریاستیں بنائیں گے''۔

1929ء: نواب سر ذوالفقار علی خان صدر مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس: ''مسلمانوں کو بجائے حقوق کے ایک جداگانہ ملک اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہئے''۔

1930ء: علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت، آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد: ''بہتر ہوگا کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مملکت بنا دیا جائے جو سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر، حکومت خود اختیاری رکھتی ہو''۔

1933ء: چودھری رحمت علی، کیمبرج کے ایک طالب علم نے ایک انگریزی پمفلٹ "Now or Never" (اب یا کبھی نہیں) شائع کیا، جس میں لفظ ''پاکستان'' پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا۔

1938ء: قائداعظم کے زیرِ صدارت منظور شدہ قرارداد سندھ صوبائی مسلم لیگ: ''ہندوستان کو دو وفاقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق''۔

1939ء: چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی لندن گئے تو وہاں وزیر ہند سے اپنی ملاقات کے دوران تقسیم ہند کی تجویز پیش کی۔

1938,1939ء: ان دو برسوں کے دوران میں مختلف حضرات نے مسلم خطوں اور جداگانہ آزاد ریاستوں کے قیام کی تجویزیں پیش کیں، جن میں ڈاکٹر عبداللطیف (حیدر آباد)، سر سکندر حیات خان (پنجاب) میاں کفایت علی، ڈاکٹر سید ظفر الاحسن اور ڈاکٹر افضل قادری (علی گڑھ) کی پیش کردہ تجاویز کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

1939ء: قائداعظم نے 8 اپریل کو مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس وقت کئی منصوبے اور تجاویز ہمارے سامنے ہیں، جن میں ملک کو تقسیم کرنے کا منصوبہ بھی شامل ہے۔ یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ پورے مسئلے کا جائزہ لیا جائے گا اور ایسی سکیم پیش کی جائے گی جو ورکنگ کمیٹی کے نزدیک مسلمانانِ ہند کے بہترین مفاد میں ہوگی''۔

1940ء: فروری کے پہلے ہفتے میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اجلاس دہلی میں منعقد ہوئے، جن میں مسلمانانِ ہند کے لئے علیحدہ وطن پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کی باقاعدہ تجویز مارچ میں ہونے والے سالانہ اجلاس لاہور میں پیش کی جائے۔

1940ء: 6 فروری کو قائداعظم نے وائسرائے ہند لارڈ

لنلتھگو سے ملاقات کی اور بتا دیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اپنے لاہور والے کھلے اجلاس میں ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والی ہے۔

لاہور کا تاریخ ساز اجلاس

22 مارچ 1940ء' آج 1906ء میں قائم ہونے والی آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس کا پہلا دن ہے جو تین روز تک رہے گا۔ یہ لاہور ہے' مسلمانانِ ہند کا علمی و ثقافتی مرکز' شاہی مسجد کے شمال میں منٹو پارک کے وسیع میدان میں' جہاں کشتی کا اکھاڑہ ہے' زبردست شامیانے کھڑے کئے گئے ہیں۔ شامیانوں کے چاروں اطراف میں دور دور تک سینکڑوں سفید سفید خیمے نظر آ رہے ہیں۔ یہاں ہندوستان کے طول و عرض سے آئے ہوئے مندوبین ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پنڈال میں ساٹھ ہزار سے زیادہ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش رکھی گئی ہے' لیکن مقررہ وقت یعنی ڈھائی بجے سے پہلے ہی پنڈال کھچا کھچ بھر چکا ہے اور مسلمان ہیں کہ جلوس در جلوس اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔

اس اجلاس کو سبوتاژ کرنے کے لئے 19 مارچ کو لاہور میں کشت و خون کا بازار گرم کیا گیا۔ حکومت پنجاب اور خاکساروں کے تصادم سے' جن میں تیس خاکسار شہید ہو گئے تھے' ایسی سنگین صورتِ حال پیدا کی گئی کہ حکومت پنجاب اور مسلم لیگ کے بعض مقامی رہنما اجلاس ملتوی کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات خان اجلاس ملتوی کرنے کے حق میں تھے۔ حکومت نے مسلم لیگ کی مجلس انتظامیہ کو صاف بتا دیا کہ گڑبڑ کا زبردست امکان ہے' اس لئے اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ لیکن مجلس انتظامیہ نے کہا' اجلاس بہرصورت مقررہ پروگرام کے مطابق ہوگا۔ قائداعظم نے 21 مارچ کو لاہور پہنچتے ہی بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال لیا۔ اخبار نویسوں سے ملاقات کی۔ زخمی خاکساروں کی عیادت کے لئے ہسپتال پہنچے۔ خاکساروں کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کیا۔ تسلی دی کہ انہیں انصاف دلوانے میں ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

22 مارچ کو ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا۔ چند نظمیں پڑھی گئیں' جن میں میاں بشیر احمد کی نظم ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' بے حد پسند کی گئی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر نواب سر شاہ نواز خان ممدوٹ نے خطبۂ استقبالیہ میں مندوبین کا خیر مقدم کیا: ''آج آل انڈیا مسلم لیگ ایسے خطوط پر کام کر رہی ہے' جن سے مسلمانانِ ہند کی قومی زندگی اور اُن کی آزادی ہی محفوظ نہ ہوگی' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسری قوموں اور فرقوں کی زندگی اور آزادی بھی محفوظ ہوگی''۔

قائداعظم نے فی البدیہہ صدارتی تقریر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ آپ کیا کہنے والے ہیں۔ آپ نے تقریباً دو گھنٹے کی طویل اور پُراثر تقریر میں مسلم لیگ کے پچھلے اجلاس (منعقدہ دسمبر 1938ء' پٹنہ) سے لے کر اب تک کے سیاسی حالات' کامیابیوں اور مشکلات کا ذکر کیا۔ مسلمان خواتین کو اُن کی ذمہ داریاں بتائیں۔ مسلمانانِ ہند کو منظم ہونے کی اہمیت جتائی۔ گاندھی جی کے ارشادات کا انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں تجزیہ کیا۔ حکومتِ برطانیہ اور مسلمانانِ ہند کے باہمی تعلقات' مستقبل کے دستور اور مسئلہ فلسطین پر روشنی ڈالی۔ لالہ لاجپت رائے کے ایک خط کے حوالے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو دھرم کی جداگانہ نوعیت کو سمجھنے سے قاصر کیوں رہتے ہیں۔ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں بلکہ درحقیقت مختلف اور جداگانہ معاشرتی نظام ہیں۔ یہ محض ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ متحدہ ہندوستانی قوم کا غلط تصور حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے اور یہی ہماری بہت سی مشکلات اور مسائل کی اصل جڑ ہے۔ اگر ہم نے بروقت اپنے تصورات میں اصلاح نہ کی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ ہندو اور مسلمان مختلف مذہبوں' فلسفوں' معاشرتی نظاموں اور ادبیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے' نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بالکل مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں جن کی بنیاد ایسے افکار و تصورات پر ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں' بلکہ اکثر متصادم رہتے ہیں۔ ان کا نظریۂ حیات مختلف طرزِ حیات مختلف۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی تمنائیں اور آرزوئیں تاریخ کے مختلف سرچشموں سے اخذ کرتے ہیں۔ ان کی رزمیہ مثنویاں مختلف' ان کے ہیرو مختلف' ان کے قصے کہانیاں مختلف۔ اکثر اوقات ایک قوم کا ہیرو دوسری قوم کا دشمن ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی دو جداگانہ قوموں کو ایک ہی ریاست کے تحت زبردستی متحد کرنے سے' جبکہ عددی اکثریت اور اقلیت کا بھی خاصا فرق ہے' لازماً بے اطمینانی ہوگی اور ہر مردہ آئینی ڈھانچہ بالآخر تباہ ہو کر رہ جائے گا جو ایسی ریاست کی حکومت کے لئے بنایا جائے گا''۔

خطبے کے آخری حصے میں آپ نے پُرزور اور واضح الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ منفرد قومیت اور ان کے علیحدہ وطن کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی:

''لفظ قوم کی ہر تعریف کی رو سے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور اس لحاظ سے ان کا اپنا علیحدہ وطن' اپنا علاقہ اور اپنی مملکت ہونی چاہئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنی روحانی' ثقافتی' اقتصادی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کو اس طریق پر زیادہ سے زیادہ ترقی دیں جو ہمارے نزدیک بہترین ہو اور جو ہمارے نصب العین سے ہم آہنگ اور ہماری قوم کے مزاج کے مطابق ہو''۔

آج کا اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا۔ رات کو مجلس موضوعات کی میٹنگ میں اُس تاریخ ساز قرارداد کے متن پر غور و خوض کیا گیا جو کل 23 مارچ کو کھلے اجلاس میں فیصلے کے لئے پیش کی جائے گی۔

23 مارچ 1940ء' آج ہفتہ ہے۔ صبح ہی صبح مجلس موضوعات کی میٹنگ پھر ہوئی۔ مجلس کی دوسری میٹنگ ساڑھے دس بجے شروع ہوئی جو دو بجے بعد دوپہر تک جاری رہی۔ مسلم لیگ کا کھلا اجلاس تین بجے قائداعظم کی زیرصدارت شروع ہوا۔ پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈائس پر مختلف صوبوں سے آئے ہوئے مسلمان اکابر تشریف فرما تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کی سالانہ روداد پڑھی۔ جب بنگال کے وزیراعلیٰ فضل حق ڈائس پر تشریف لائے تو فضا تالیوں اور شیر بنگال زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ وہ تاریخی قرارداد پیش کرنے کا سہرا شیر بنگال ہی کے سر بندھا۔ آپ نے قرارداد انگریزی میں تھی' پڑھ کر سنائی۔

1940ء: قرارداد رات گیارہ بجے زور شور اور نعروں کے ساتھ منظور ہوئی۔ دن بھر کی تقاریر میں کسی ایک شخص نے مطالبہ تقسیم کو پاکستان کے نام سے یاد نہیں کیا۔

قرارداد لاہور' 23 مارچ 1940ء

''1۔ آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اُس اقدام کی تائید و توثیق کرتے ہوئے جو ان کی 27 اگست' 18,17 ستمبر' 22 اکتوبر 1939ء اور 3 فروری 1940ء کی قراردادوں سے واضح ہوتا ہے' آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پُرزور اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ' جس کا اظہار گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں کیا گیا ہے' قطعاً غیر موزوں ہے' اس ملک کے خاص حالات کے پیش نظر ناقابل عمل اور مسلم ہندوستان کے لئے یکسر ناقابل قبول ہے''۔

2۔ اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ 18 اکتوبر 1939ء کو جو اعلان وائسرائے نے حکومت ملک معظم کی جانب سے کیا تھا' وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس مسلک اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 مبنی ہے' اس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں' مفادات اور فرقوں کے مشورے سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے' لیکن مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا' جب تک کہ پورے آئینی منصوبے پر از سرنو غور نہ کیا جائے۔ اور کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا' تاوقتیکہ اُن کی رضامندی اور منظوری سے مرتب نہ کیا جائے۔

3۔ قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اس ملک قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا' تاوقتیکہ وہ مندرجۂ ذیل اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو' یعنی جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردوبدل کے ساتھ) کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے' ان کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں۔

نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی' معاشی' انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب' موثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔ مزید برآں یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ اُن بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ مرتب کریں' جس کی رُو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کلی اختیارات حاصل ہو جائیں' مثلاً دفاع' امور خارجہ' مواصلات' محصولات اور دیگر ایسے امور جو ضروری سمجھے جائیں۔

مولوی اے کے فضل الحق نے قرارداد کی تائید میں' اپنی تقریر میں کہا: ''مسلمانانِ ہند کسی ایسے منصوبے سے اتفاق نہ کریں گے جو ان کی تائید و منظوری کے بغیر بنایا گیا ہو۔ ہمارے لئے فقط وہی آئین قابلِ قبول ہوگا جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بنایا گیا ہو''۔

اس کے بعد چودھری خلیق الزماں (یوپی)' مولانا ظفر علی خان (پنجاب) حاجی سر عبداللہ ہارون (سندھ)' خان اورنگ زیب خان (صوبہ سرحد)' نواب اسماعیل خان (یوپی) قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)' عبدالحمید (مدراس)' ابراہیم اسماعیل چندریگر (بمبئی)' سید عبدالرؤف شاہ (سی پی)' ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب)' بیگم مولانا محمد علی جوہر (یوپی)' مولانا عبدالحامد بدیوانی (یوپی)' سید ذاکر علی اور بہت سے اکابرین ملت نے قرارداد کے حق میں مدلل اور پُرجوش تقریریں کیں۔ ان تائیدی بیانات کے بعد صدر اجلاس قائداعظم نے ''قرارداد'' پر عوام کی رائے طلب کی جو زبردست تالیوں کی گونج میں متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

لفظ ''پاکستان'' کہاں سے آیا؟

''قرارداد لاہور'' میں لفظ ''پاکستان'' کا برائے نام بھی ذکر موجود نہ تھا۔ پھر یہ لفظ کہاں سے آیا؟ اس سوال کا مفصل جواب چودھری خلیق الزماں نے اپنی تصنیف ''شاہراہ پاکستان'' میں یوں دیا ہے:

> ''23 مارچ کا مسلم لیگ کا ریزولیشن رات گیارہ بجے زور و شور اور نعروں کے ساتھ منظور ہوا۔ دن بھر کی تقاریر میں کسی ایک شخص نے بھی تقسیم کے مطالبے کو پاکستان کے نام سے یاد نہیں کیا''۔

سید حسن ریاض اپنی انعام یافتہ تصنیف ''پاکستان ناگزیر تھا'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اس رزولیشن کو محض تقسیم ہند کا رزولیشن کہا گیا' البتہ بیگم محمد علی نے اپنی تائیدی تقریر میں اس کو پاکستان کا رزولیشن کہا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ چودھری رحمت علی کی کوشش اور سعی سے یہ لفظ مشہور ہو چکا تھا۔ وہ اس سے واقف تھیں اور اُن کو یہ آسان معلوم ہوا کہ تقسیم برصغیر ہند کی قرارداد کی جگہ اس کو پاکستان رزولیشن کہیں''۔

مگر ہندو پریس نے دوسرے دن بڑے روشن الفاظ میں اس تجویز کا نام (طنزاً) پاکستان رکھ دیا۔ علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد (1930ء) میں تقسیم ہند کا جو نظریہ پیش کیا گیا تھا' اس کو کسی نام سے تعبیر نہیں کیا گیا۔ البتہ 1921ء میں لندن سے جو خبریں آتی تھیں' ان میں پاکستان کی ایک سکیم کا ذکر تھا' جسے چودھری رحمت علی نے گول میز کانفرنس میں شریک مسلمان ممبروں کو اپنی حمایت کے لئے پیش کیا تھا' گو اس وقت اس کو کسی مسلم ممبر نے قبول نہیں کیا تھا' بلکہ دو برس بعد جب 1933ء میں چودھری رحمت علی کا دوسرا پرچہ ''اب یا کبھی نہیں'' نکلا' جس میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ایک کمیٹی میٹنگ میں سر ریجنل کروڈک نے مسلمان ممبران سے دریافت کیا کہ کوئی سکیم پاکستان کے نام سے مسلمانوں میں پیش ہے تو سر عبداللہ یوسف علی نے کہا کہ یہ محض ایک طلبا کی سکیم ہے۔ وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور کہا ممکن ہے ایسا ہو' مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ آگے چل کر یہ عوام کو اس طرف راغب کر لیں گے۔ سر ظفر اللہ خان نے کہا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ صرف طالب علموں کی سکیم ہے' اس سے زائد اور کچھ نہیں۔ آگے چل کر ایک صاحب نے کہا ''وہ محض نام و نمود کی محفل ہے''۔

اب جب کانگریس پریس نے اسے پاکستان کی تجویز کہا تو مسلمانوں پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ وہ اس کو اپنے لئے کوئی آزاد ملک جیسے افغانستان ترکستان یا خود ہندوستان کی قسم کا ایک ملک سمجھنے لگے اور اس تحریک کے لئے یہ نام سن کر وہ بپھر کھڑے ہوئے اور جس تجویز کی تعریف اور حیثیت کو ہمیں کم از کم دو برس مسلم عوام کو سمجھانے میں صَرف ہوتے' اسے ہندو پریس نے دو چار دن میں سارے ہندوستان میں مشتہر کرا دیا۔ ہماری برسوں کی محنت انہوں نے دنوں میں پوری کر دی۔ پھر تو چند ماہ کے بعد خود قائداعظم بھی اپنی تقاریر' خطبات اور بیانات میں اس قسم کے پُرعزم جملے استعمال کرنے لگے: 'اب دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام میں مخل نہیں ہو سکتی''۔

''قرارداد'' پر ردِعمل اور تبصرے

مسلم لیگ کی جانب سے ''قرارداد لاہور'' کے منظور ہوتے ہی عوام کے مختلف فرقوں نے فوراً اپنا اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ ہندوؤں کا ردعمل ہیجانی تھا اور انہوں نے اسے مادرِ وطن کے دو ٹکڑے کر دینے سے تعبیر کیا اور ایک مقدس گائے کو ذبح کر دینے سے تشبیہ دی۔ اس کے خلاف ہر ہندو لیڈر بول رہا تھا اور ہر ہندو اخبار لکھ رہا تھا۔ لیکن ان کی تمام بکواس میں پاکستان کے خلاف تین اعتراض ایسے تھے جن کو یہ بہت وزنی اور لاجواب سمجھتے تھے:

(1) ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے' اس لئے وہ تقسیم نہیں ہو سکتا۔

(2) ہندوستانی مسلمانوں میں کثرت سے وہ ہیں جن کے اجداد ہندو تھے تبدیلیٔ مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی۔ لہٰذا تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں اور مسلمان ان میں شامل ہیں۔

(3) پاکستان کے معاشی وسائل اتنے نہیں ہوں گے کہ وہ اپنی کفالت کر سکے۔

سید حسن ریاض نے اپنی تصنیف "پاکستان ناگزیر تھا" میں ایک ایک کر کے انتہائی تفصیل سے ان اعتراضات کے شافی اور مدلل جواب دیئے ہیں۔

انگریز بھی قدرتی طور پر "قرارداد لاہور" کے مخالف تھے۔ وہ برعظیم کے سیاسی اتحاد کو اپنا کارنامہ سمجھنے لگے تھے اس لئے وہ اس کو تقسیم کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ نیز انگریزوں کو یہ امید تھی کہ ایک متحد ہندوستان اس تمام علاقے میں استحکام کا ضامن ہوگا۔

خود مسلمانوں پر اس کا جو ردعمل ہوا اس کی حکایت انتہائی دلچسپ اور تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ پاکستانیت سے دلچسپی رکھنے والے ملکی اور غیر ملکی مصنفین نے اپنی کتابوں میں تحریک کے مزے لے لے کر ذکر کیا ہے جو "قرارداد لاہور" کے منظور ہوتے ہی پورے برصغیر کی پوری مسلمان آبادی نے حصولِ پاکستان کے لئے چلائی۔ قرارداد پر چند مشہور مصنفین کے تبصرے ملاحظہ ہوں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی:

اس کے بعد پاکستان مسلم عوام کے عقیدے میں داخل ہو گیا۔ ہندوؤں نے جتنی زیادہ قوت سے اس کی مذمت کی، مسلمانوں کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی یقین ہوتا گیا"۔ (دی سٹرگل فار پاکستان)

اے عزیز:

مطالبۂ پاکستان نے ہندوستانی قومیت کے تانے بانے کو تار تار کر دیا اور اس کے بعد ہندوستان کی تقسیم ہندوستانی سیاست کا بنیادی مسئلہ بن گئی"۔ (ڈسکوری آف پاکستان)

مطلوب حسین سید:

قرارداد لاہور بلاشبہ ہندوستان اور مسلمانوں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے پہلے مسلمانانِ ہند کے سامنے کوئی واضح منزل مقصود نہ تھی۔ مسلمانوں کی سیاست چند افراد کے ہاتھوں میں تھی جن کے مفادات مختلف، رجحانات مختلف تھے..... علامہ اقبال اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کے سامنے ان کا صحیح اور جائزہ مقصد رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ اسے موثر طور پر نہ رکھ سکے۔ اس کے لئے ایک جناح کی ضرورت تھی جو قوم کی امنگوں کو پورا کرے اور وہ بھی انتہائی موزوں نفسیاتی لمحے پر..... یہ دراصل اقبال کی روح تھی جس نے اپنا اظہار محمد علی جناح کے ذریعے کیا۔ شاعر اسلام نے کہا تھا، جناح واحد رہنما ہیں جو مسلمانانِ ہند کی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کر کے ان میں متحدہ قوتِ عمل کا نفسوں پھونکنے کا کٹھن کام انجام دے سکتے ہیں۔ جناح اس حقیقت سے خوب واقف تھے اور مناسب موقع کا انتظار کر رہے تھے کہ لاہور میں انہوں نے ٹھیک نشانے پر تیر مارا۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا: "افسوس، اب اقبال ہم میں نہیں۔ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ہم نے بالآخر وہی فیصلہ کیا جس کی انہیں آرزو تھی"۔ (محمد علی جناح کے کے عزیز:

یہ قرارداد منظور کر کے گویا مسلمان قوم نے اپنے وجود کو پا لیا۔ مسلمانوں کو بالآخر یہ فیصلہ کرنے میں کہ وہ چاہتے کیا ہیں، پورا پون صدی کا عرصہ لگا۔ انہوں نے ہر امر اور ہر کوشش کو آزما کر دیکھ لیا تھا۔ ایک انقلاب برپا کیا 1857ء میں انگریزوں سے دوستی پیدا کی۔ کانگریس کی مخالفت کی، انتہا پسندانہ انداز میں ہنگامہ آرائی کی۔ کانگریس سے تعاون کیا۔ جنگ میں غیر جانبداری برتی، مذاکرات کئے، معاہدے کئے، اپیلیں کیں، دھمکیاں دیں، کیا کچھ نہ کیا۔ پہلے تو تخت سے اتارے ہوئے حکمرانوں کی طرح انگریزوں کی فرماں روائی سے خفا ہوئے پھر کمزور اقلیت کی طرح برسر اقتدار طاقت سے دوستی استوار کرنے کی کوشش کی۔ پھر کچھ عرصہ ہندوؤں کو ساتھ ملا کر دیکھا۔ اپنی منزل کو ان کی منزل جان کر تحریک خلافت چلائی۔ چند تلخ یادیں باقی رہ گئیں تو ایک مرتبہ پھر اُن کی علیحدگی پسندی بالائی سطح پر آ گئی اور وہ پھر فرقہ وارانہ تحفظات کے لئے لڑنے لگے۔

جب یہ تحفظات مطلوبہ یا متوقع تحفظ دینے سے قاصر رہیں تو چھپی ہوئی قومیت اُبھر کر پھر سامنے آ گئی۔ تاریخ کے سفر نے ایک قوم میں بدل دیا۔ اب وہ مجبوری اور بے بسی سے دل میں نہیں کڑھتی تھی کہ انگریزوں کی کرم فرمائی کا سہارا مانگتی رہے یا ہندوؤں کی خیر سگالی پر اعتماد کرتی رہی۔ کانگریس کے اس دعوے کے جواب میں ہندوستان ایک قومی ریاست ہے اور یہاں دو قومیں آباد ہیں، نہ دو سے زیادہ، مسلمانوں نے جداگانہ قومیت کا ایک بالکل تازہ تصور پیش کر دیا۔ اکثریت اور اقلیت کے مابین جنگ کرانا بہت دشوار تھا۔ جمہوریت کے اصول کے تحت جیت لازمی طور پر اکثریت کو ہوتی ہے۔ لیکن مسئلے کو قومیت کی سطح پر لے جا کر تو حل کرنا ممکن تھا۔ قائداعظم نے صاف کہہ دیا، ہندوستان کا مسئلہ ہرگز قومی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اسے ایسا ہی جان کر حل کرنا چاہئے"۔

(میکنگ آف پاکستان)

چودھری محمد علی

تصورِ پاکستان نے جس تیزی اور جس شدت سے مسلم عوام کے ذہنوں پر اپنا تسلط جمایا اور مسلم لیگ نے مقبولیت اور طاقت حاصل کرنے میں جو غیر معمولی ترقی کی، اس سے اکثر مبصرین حیران و ششدر رہ گئے۔ تحریک پاکستان کا تن من دھن سے ساتھ دے کر مسلم قوم محض ہندوؤں کے تسلط سے آزاد نہیں ہونا چاہتی تھی بلکہ عوام کے دلوں میں جس چیز نے قوتِ عمل کی آگ بھر دی، وہ تھی ایک صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی خواہش جس میں انصاف، جمہوری مساوات، ضرورتوں سے کلی نجات اور قرونِ اولیٰ کا سا معاشرتی بہبود کا مخلصانہ جذبہ دوبارہ عود کر آیا۔ تصورِ پاکستان کی یہ تھی وہ خاص کشش جس نے مسلم لیگ کو جو آج تک مسلمانوں کے اوپر کے طبقے کی ترجمان رہی تھی، ایک عوامی تنظیم میں بدل کر رکھ دیا۔ اسی اور صرف اسی بنیاد پر تحریک پاکستان میں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کی فراخ دلانہ اور عملی شرکت کا جواز ڈھونڈا جا سکتا تھا۔

قرارداد پاکستان کون سی ہے؟

اب تک جس قرارداد کا ذکر کیا گیا وہ تاریخ میں اصطلاحاً "قرارداد لاہور" کے نام سے محفوظ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض مصنفین ڈھیلے لفظوں میں اسے "قرارداد پاکستان" کا نام دیتے ہیں۔ پھر آخر "قرارداد پاکستان" کون سی ہے؟

قرارداد لاہور اخبارات میں شائع ہوئی تو مختلف سیاسی اور صحافی حلقوں سے اس کی مختلف تعبیریں پیش کی گئیں۔ اس پر تنقیدیں ہوئیں، مذاکرے ہوئے، مباحثے ہوئے، سب سے زیادہ اعتراضات یا تشریحیں لفظ "ریاستیں" (صیغہ جمع) کے استعمال پر کی گئیں۔ قرارداد کی رو سے ایک مسلم ریاست یا زیادہ مسلم ریاستیں قائم کرنا مقصود ہے؟ اس سلسلے میں مثال کے طور پر ڈاکٹر امبیدکر اچھوتوں کے مشہور رہنما نے لکھا "اس قرارداد میں جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کرنے کا مطالبہ ہے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں"۔ مشمولہ وحدتوں کی ترکیب سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک وفاق قائم کرنا مقصود ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ان وحدتوں کی صفت کے طور پر لفظ "مقتدر" کا استعمال بے محل ہے۔

1941ء: قرارداد لاہور منظور کر کے مسلمان قوم نے اپنے وجود کو پالیا۔ مسلمانوں کو بالآخر یہ فیصلہ کرنے میں کہ وہ چاہتے کیا ہیں' پورا پون صدی کا عرصہ لگا۔

وحدتوں کے وفاق اور وحدتوں کے اقتدار اعلیٰ میں باہم تضاد ہے''۔

ڈاکٹر وحید الزماں نے اس اعتراض کے جواب میں لکھا ہے: ''قرارداد میں محض بنیادی اصول قرار پایا تھا۔ اس بنیادی اصول کے مطابق تفصیلات مرتب کرنے کا کام مجلس عاملہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ قرارداد کے الفاظ میں ''مجلس عاملہ کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ مرتب کرے جس کی رو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر کلی اختیارات حاصل ہو جائیں۔ مثلاً دفاع' امور خارجہ' مواصلات' محصولات اور دیگر ایسے امور جو ضروری سمجھے جائیں۔ بلاشبہ ان دیگر امور میں یہ امر بھی شامل تھا کہ مشمولہ وحدتوں کے لئے اختیارات یا اقتدار اعلیٰ کی زیادہ صراحت سے تعین کی جائے''۔

بہر حال مسلم لیگ اور اس کے اکابر قرارداد لاہور پر ہونے والے اعتراضات کا وقتاً فوقتاً جواب دیتے رہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل 1941ء میں قرارداد لاہور کو مسلم لیگ کے آئین کا جزو بنا لیا گیا اور بقول چودھری خلیق الزماں ''جب یہ آئین کا حصہ بن گئی تو ایک معمولی شوشے یا نقطے کی تبدیلی کے لئے بھی مسلم لیگ کا کھلا اجلاس طلب کیا جا سکتا تھا''۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مدراس کے سالانہ اجلاس میں قرارداد کی شق نمبر ۳ کے آخری حصے میں خط کشیدہ الفاظ کا اضافہ کر کے اُسے ان الفاظ میں بدل دیا گیا:

> ''ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصوں کی باہمی تشکیل مسلم آزاد قومی اوطان کی حیثیت سے' ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں''۔

قرارداد دہلی (9 اپریل 1946ء)

ہر قسم کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لئے قرارداد کی مزید تشریح مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ارکان کے اس مسلم لیگ کنونشن میں ہوئی جو قائداعظم کی صدارت میں 9 اپریل 1946ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ ایک اور قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی' جس میں منجملہ دیگر امور متعلقہ کے یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ پاکستان ایک واحد مقتدر ریاست ہوگی۔ یہ تاریخ میں قرارداد دہلی کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ کی سرکاری تجاویز یا قراردادوں میں پہلی مرتبہ لفظ ''پاکستان'' استعمال کیا گیا۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

> ''ہندوستان کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان یعنی پاکستان کے علاقے جہاں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے' وہاں واحد مقتدر آزاد مملکت کی تشکیل کی جائے اور اس امر کا واضح اعلان کیا جائے کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا''۔

قرارداد دہلی کی منظوری اور اشاعت سے ایک طرف تو مخالفین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات ختم کر دیئے گئے اور دوسری طرف قرارداد لاہور کی تکمیل کر دی گئی۔ قرارداد لاہور اور قرارداد دہلی ایک دوسری کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دونوں مل کر ''قرارداد پاکستان'' کہلاتی ہیں۔ حساب کے فارمولے سے ایسے یوں بیان کر سکتے ہیں:

قرارداد لاہور 1940ء + قرارداد دہلی 1946ء = قرارداد پاکستان

قرارداد پاکستان یعنی قرارداد کے دونوں حصوں کا مکمل متن اردو' بنگلہ اور انگریزی زبانوں میں مینار پاکستان کی ان انیس تختیوں میں سے تین پر درج ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے صفات' قائداعظم کے فرمودات' علامہ اقبال کی مشہور نظم ''مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ'' اور ترانۂ پاکستان بھی شامل ہے۔ قرارداد پاکستان کی اثر انگیزی اور اہمیت نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں بلکہ بین الاقوامی سیاست و معیشت میں ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ منٹو پارک اقبال پارک بن چکا اور جہاں کشتی کے اکھاڑے میں شامیانے اور خیمے تانے گئے تھے' آج وہاں ایک عظیم الشان مینار سربلند ہے..... اس امر کا عینی شاہد کہ بقول قائداعظم پاکستان ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے''۔

مسلم اکثریتی صوبوں کی سیاست

قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں میں' جن کو نئی اسلامی ریاست ''پاکستان'' میں شامل ہونا تھا' ایک تلاطم آنا ضروری تھا۔

(الف) صوبہ پنجاب۔ یہاں کی یونینسٹ وزارت نے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے 1937ء کے لکھنو اجلاس میں لیگ سے تعلق دوبارہ استوار کر لیا تھا۔ سردار سکندر حیات خان صوبے کے وزیراعلیٰ تھے۔ وہ طبعاً معتدل مزاج اور شائستہ انسان تھے۔ انہوں نے ایک حد تک لیگ کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کو نبھانے کی کوشش کی اور 1941ء میں قائداعظم کے حکم پر نیشنل ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دے دیا' لیکن دسمبر 1942ء میں ان کے انتقال کے بعد حالات بدل گئے۔ ان کے جانشین خضر حیات خان' لارڈ ویول کے قول کے مطابق' برطانوی تسلط کے دلی خیرخواہوں میں سے تھے۔ ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ تھی' وہ صوبائی گورنر اور وائسرائے کے اشاروں پر چلتے تھے۔ انہوں نے پے در پے لیگ کے احکام کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ اسمبلی کے حکام کچھ دیر تک ان کی حمایت کرتے رہے' لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ نے لیگ کو عوامی جماعت بنا دیا' اس سلسلے میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ فیڈریشن نے لیگ کے لئے ہراول دستے کا کام دیا۔ 1944ء میں خضر حیات خان کو لیگ سے نکال دیا گیا۔ ابتدا میں ان کے تقریباً بیس پیروکاروں نے پارٹی سے قطع تعلق کر کے اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کا علیحدہ بلاک بنایا۔ لیکن ایوان سے باہر مسلم لیگ کو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی' یہی وجہ ہے کہ 1946ء کے انتخاب میں مسلم لیگ نے ہر مخالف پارٹی کو فیصلہ کن شکست دی۔

(ب) صوبہ سرحد: جنگ کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد کی کانگریسی وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور گورنر راج قائم ہوا۔ 1943ء کے آغاز میں یہاں سردار اورنگ زیب خان کی سرکردگی میں مسلم لیگ کی وزارت بنی جو دو سال تک چلی' سرحد کی رائے عامہ مسلم لیگ کے ساتھ تھی۔ لیکن کچھ تو انتخابی حلقوں کی تشکیل ایسے ہوئی تھی اور کچھ اقلیتوں کو اپنی تعداد کے مقابلے میں اتنی وافر نمائندگی ملی ہوئی تھی کہ کانگریس نے اس مسلم صوبے کو لیگ کے اقتدار سے بچانے کیلئے کامیابی کے ساتھ بہت سے ناواجب ذرائع استعمال کئے۔ اس لئے لیگ کو 1946ء کے انتخابات میں متوقع کامیابی حاصل نہ ہوئی' اس کے باوجود مسلمانوں کی رائے عامہ پاکستان کے حق میں سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔

جب پنڈت نہرو نے 1946ء کے آخر میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو ان کو عوامی غیظ و غضب کا ایسا سامنا کرنا پڑا کہ وہ مرتے دم تک نہ بھول سکے ہوں گے۔ اسی طرح جب ماؤنٹ بیٹن نے اپنے آنے کے بعد صوبے کا دورہ کیا تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ لوگ حصول پاکستان کے لئے کتنے مضطرب ہیں۔ ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' میں اس نظارے کا خاکہ نہایت بچے تلے انداز میں مصورانہ چابکدستی سے کھینچا گیا ہے' ماؤنٹ بیٹن کو خدشہ تھا کہ اس نے پاکستان کے خلاف ایک کلمہ بھی منہ سے نکالا تو وہ اپنی جان بھی سلامت لے کر نہیں جا سکے گا۔ 1947ء میں جب

استصواب ہوا نو سرحد کے ووٹروں نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔

(ج) سندھ: سندھ میں مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی ضرب المثل تھی' ہندوؤں نے اپنی اقتصادی برتری کی بدولت صوبائی سیاست میں بہت عمل دخل حاصل کر لیا تھا' کانگریس نے یہاں بھی حصولِ اقتدار کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی' تعجب کی بات یہ ہے کہ جہاں کانگریس کو کسی صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی تو کانگریسی راہنما وزارت بناتے وقت کسی دوسری پارٹی کا تعاون ضروری نہ سمجھتے بلکہ جہاں کانگریس اقلیت میں ہوتی' وہاں اسے وزارت میں شامل ہونے کی کھلی اجازت تھی۔ وزارت میں شامل ہونے یا اس کی تائید کرنے کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ ہر محاذ پر لیگ کو زک پہنچائی جائے۔ چنانچہ سندھ میں تین چار سال تک یہی ہوتا رہا۔ کیبنٹ مشن پلان کی روح سے اسمبلی میں مختلف قوموں کی نشستوں کا تعین اس طرح پر کیا گیا تھا کہ دس ہندو ارکان کے گروپ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس چھوٹے سے گروپ نے اپنے ذمے یہ فرض لگا رکھا تھا کہ اسمبلی کے اندر مسلمان ممبروں کے اتحاد کے تمام امکانات کو ختم کر دے۔

کچھ عرصہ تک تو یہ کھیل نہایت کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا' لیکن ایوان سے باہر رائے عامہ کی کیفیت مختلف تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے تو 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ لیکن سندھ کی صوبائی لیگ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ اس نے 1938ء میں ہی اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کر دیا تھا۔ اسمبلی کے اندر جوڑ توڑ ہوتے رہتے تھے' ان میں سب سے نمایاں کردار خان بہادر اللہ بخش نے ادا کیا جو کانگریس کے حکم پر اپنے قول سے پھر جانے پر تیار ہوتے تھے۔ انہی کی وجہ سے سندھ کی سیاست مدوجزر کا شکار ہوتی رہی۔ ان کے قتل کے بعد حالات بدلے اور کچھ عرصے کے بعد مسلم لیگ پارٹی کی قیادت غلام حسین ہدایت اللہ کے ہاتھ میں آئی۔ انہوں نے دو عمومی انتخابات میں مخالفوں کو شکست دے کر اس صوبے کے لئے پاکستان میں شمولیت کا راستہ صاف کیا' حاجی عبداللہ ہارون اس علاقے میں قائداعظم کے دست راست تھے۔

(د) بنگال: مسلمانوں کی اکثریت تو بنگال کے مشرقی علاقوں میں تھی' لیکن کلکتہ کا شہر' ہندو سیاست' ہندو اخباروں اور ہندو تحریکوں کا گڑھ اور تحریک پاکستان کی مخالفت کا مرکز تھا۔ ہندو اہل سیاست بے اصولی جائز سمجھتے تھے اور اپنے ڈھب کے ہر مسلمانوں کو گلے لگانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ 1941ء میں قائداعظم اور مولوی اے کے فضل حق کے درمیان ڈیفنس کونسل کی رکنیت کے سوال پر اختلاف پیدا ہوا۔ قائداعظم نے مولوی صاحب کو مستعفی ہونے کا حکم دیا۔ فضل الحق نے یہ بات تو مان لی لیکن ساتھ ہی لیگ کے ساتھ بھی اپنا تعلق قطع کر لیا۔ بنگال اسمبلی کے مسلمان ممبروں پر اس کا ردعمل بہت شدید ہوا اور ان کی اکثریت مولوی صاحب کی حمایت سے دست کش ہو گئی' اپنی ڈوبتی ہوئی وزارت کو بچانے کے لئے فضل الحق نے ہندو مہاسبھا کے ساتھ مفاہمت کر لی' لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ ان کی دست برداری کے بعد خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگی وزارت بنائی۔ اس وزارت کو ہر قدم پر ہندو پریس اور ہندو تاجروں کی طرف سے بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بدقسمتی سے جنگی ضروریات اور رسد کی دقتوں کی وجہ سے بنگال میں قحط کی صورت پیدا ہو گئی۔ ہندو منافع خوروں کی ہوس زر نے اس قحط کو اور بھی بھیانک بنا دیا اور یہ قحط خدائی عذاب بن گیا۔ اس قحط کی تمام ذمے داری وزارت پر ڈال دی گئی۔ 1945ء میں خواجہ ناظم الدین مستعفی ہو گئے۔ 1946ء میں مسلم لیگ کنونشن میں حسین شہید سہروردی نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈائریکٹ ایکشن ڈے اور نواکھلی کے فسادات نے آئندہ تبدیلیوں کا راستہ ہموار کیا۔ بے لوث سیاسی کارکنوں اور طالب علموں کی کوششوں سے مسلم لیگ کو 1946ء کے انتخابات میں عدیم النظیر کامیابی حاصل ہوئی۔

کرپس مشن (مارچ 1942ء)

1942ء کے شروع میں دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ انگریز جاپان اور جرمنی کے ہاتھوں مختلف محاذوں پر پے در پے شکست کھا رہا تھا۔ برطانیہ کا وزیراعظم چرچل ہندوستان کے حالات پر فکرمند تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کی طرف سے سکون نصیب ہو۔ اس نے وائسرائے ہند کو متعدد خطوط لکھے' جن میں ہندوستان کی دونوں بڑی جماعتوں کو کسی ایک فارمولے پر متفق کرنے پر زور دیا گیا۔ آخر کار مسٹر ایٹلی کی قیادت میں ایک ''انڈیا کمیٹی'' تشکیل دی گئی۔ مسٹر ایٹلی کانگریس نواز اور ہندو دوست تھے۔

''انڈیا کمیٹی'' نے سفارش کی کہ ایک مشن ہندوستان بھیجا جائے جو حالات کا جائزہ لے کر ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں کو کسی ایک حل پر متفق کر سکیں۔ چنانچہ وزیراعظم چرچل نے لیبر پارٹی کے اہم اور وکالت پیشہ رکن سر سٹیفورڈ کرپس کی قیادت میں ایک وفد کی منظوری دی۔ مسٹر کرپس نے 22 مارچ کو آتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ وائسرائے اور ایگزیکٹو کونسل کے ارکان سے دو تین روز تفصیل سے بات چیت کی۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس کے نمائندوں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ کی جانب سے قائداعظم سے ملاقات کی۔ ان کے علاوہ پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات خان' بنگال کے وزیراعلیٰ مولوی فضل الحق' اچھوتوں کے نمائندے ڈاکٹر امبیدکر اور ایم ایس راجا' ہندو مہاسبھا کے ساورکر' لبرل پارٹی کے سر تیج بہادر سپرو اور جیکو وغیرہم سے بھی ہندوستانی امور و مسائل پر گفتگو کی۔

سات روزہ سلسلۂ ملاقات و گفت و شنید کے بعد مسٹر کرپس نے 29 مارچ 1942ء کو ایک نئی انڈین ڈومینین کے قیام کے لئے اپنی تجاویز کا اعلان کیا جو بظاہر بہت خوشنما تھیں:

(i) جنگ کے بعد کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ جیسی خودمختاری کا وعدہ تھا۔ اس بات کی تشریح کر دی گئی تھی کہ اگر ملک چاہے تو دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں خودمختار حکومت قائم ہونے سے پہلے انگریز ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ملک کا آئین تیار کروائیں گے اور یہ آئین نافذ کر کے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ اسمبلی ترجیحاً متحدہ ہندوستان کے لئے نئے آئین وضع کرے گی' لیکن جس صوبے یا جن صوبوں کو یہ آئین قبول نہ ہو' وہ وفاق سے علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں' بلکہ چاہیں تو اپنا علیحدہ فیڈریشن بھی بنا سکتے ہیں۔

(ii) جنگ کے اہم دور میں نیا دستور بننے تک ملک معظم کی حکومت ہی ہندوستان کے دفاع کی ذمہ دار ہو گی۔ وہ ہندوستان کی فوجی' اخلاقی اور مادی تنظیم کے کام میں ہندوستانیوں کے تعاون سے کام کرے گی۔ ملک معظم کی خواہش ہے کہ ہندوستانی عوام کے اہم طبقوں اور جماعتوں کے رہنما اپنے ملک کی کونسلوں' دولت مشترکہ اور اتحادی اقوام کے کاموں میں پورا پورا حصہ لیں' کیونکہ اس کام کی تکمیل جلد اور آسانی سے ہو سکتی ہے' جس پر ہندوستان کے روشن مستقبل کا انحصار ہے۔

(iii) ان تمام امور پر یا تو پوری طرح عمل ہو گا یا ان کو پوری طرح مسترد کر دیا جائے گا۔ اس کی جزوی قبولیت بے معنی ہو گی۔

(iv) صوبائی انتخابات کے بعد (جو جنگ کے بعد ہوں گے) ایوان ہائے زیریں کے تمام ارکان فی الفور متناسب نمائندگی کے اصول کے تحت ایک انتخابی ادارہ قائم کریں گے۔ یہ نئی مجلس تعداد ارکان کے لحاظ سے انتخابی ادارے کا دسواں حصہ ہو گی۔

1942ء: کرپس مشن کی تجاویز کا مقصد ہندو جماعتوں کو خوش کرنا تھا۔ ہندوستان کی ''وحدت'' کو برقرار رکھنے کا منصوبہ ہندو سیاست کا بنیادی جز' تھا۔

ان ساری تجاویز سے ہندو جماعتوں کو خوش کرنا مقصود تھا۔ دولت مشترکہ سے علیحدگی کے اختیار پر گاندھی بے حد زور دیا کرتے تھے' ہندوستان کی ''وحدت'' کو برقرار رکھنے کا منصوبہ بھی ہندو فلسفۂ سیاست کا جزو اعظم تھا۔ متناسب نمائندگی کا مطلب یہ تھا کہ دستور ساز ادارے میں مسلمان ایک چوتھائی اقلیت میں ہوں گے اور رائے شماری کے وقت ان کا ہر مطالبہ رد کیا جا سکے گا۔ ان تجاویز میں تقسیم ملک کی طرف ایک خفیف سا یہ اشارہ بھی موجود تھا کہ کسی صوبے کو اس کی منشا کے خلاف فیڈریشن میں شریک نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس امر کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس کے متعلق اور بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح ''تجاویز'' میں کوئی صراحت نہ تھی۔

کرپس مشن کی تجاویز کا مقصد محض سیاسی تھا' اس لئے ابتدائی مرحلے کے بعد کرپس نے مکمل طور پر کانگریس والوں پر انحصار کرنا شروع کیا اور دوسری جماعتوں کو کم و بیش نظر انداز کر دیا۔ امریکا کے صدر کا ذاتی نمائندہ کرنل جانسن اس موقع پر دہلی میں موجود تھا۔ وہ ساری کارروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ پنڈت نہرو اور کرپس کے درمیان نامہ و پیام کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ لیکن تمام گفت و شنید کے بیل چڑھنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ جنگ کا رخ کس طرف ہے اور اس میں برطانیہ کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں۔

گاندھی کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ انگریز جنگ میں ہار جائیں گے۔ اس لئے جنگ کے دوران انگریز سے کسی قسم کا عہد و پیمان دینے یا لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کرپس مشن کی تجاویز کے بارے میں اُن کے اپنے الفاظ یہ تھے:

> ''آزادی کا یہ پروانہ ایک ایسے چیک کی مانند ہے جو اُس بنک سے کاٹا گیا ہے جس کا دیوالیہ نکل رہا ہے اور چیک کی ادائیگی کی تاریخ غیر معینہ عرصے کے لئے معرضِ التوا میں ہے''۔

اگرچہ کانگریس کے اندر چند اہل سیاست بھی تھے جو کرپس تجاویز قبول کرنے کے حق میں تھے' لیکن گاندھی کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جلتا تھا۔ کانگریس نے کرپس پر وعدہ شکنی کا الزام دیتے ہوئے اس کی تجاویز کو مسترد کر دیا۔

قائداعظم کا رویہ شروع ہی سے ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر تھا۔ ان کا سب سے پہلا اعتراض تو آئین ساز ادارے کی غالب ہندو اکثریت پر تھا' لیکن اس سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ کرپس کی تجاویز کے مطابق نیا آئین ترجیحی طور پر ہندوستان کے لئے بنایا جائے گا۔ تقسیم ملک کا وعدہ مشروط اور مبہم تھا۔ اس کا پورا کرنا اکثریت کے ہاتھ میں تھا۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلم لیگ نے بھی کرپس کی تجاویز منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔

ہندو مہاسبھا کا خیال تھا کہ ان تجاویز میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ انڈین یونین سے الگ رہنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور اس سے تو ہندوستان کی وحدت کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔ گویا یہ تجاویز ہر سیاسی جماعت کے لئے کسی نہ کسی وجہ سے ناقابل قبول تھیں' اس لئے ان تجاویز کو مسترد کر دیا گیا۔

البتہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صرف ایک ہی پہلو قابل اطمینان ہو سکتا تھا' اور وہ یہ کہ حکومت برطانیہ نے مبہم طور پر ہی سہی' تقسیم ملک کے اصول کو مسترد کرنے کے بجائے اس کا امکان ظاہر کر دیا' وہ اس تجویز کے مطابق کہ کوئی صوبہ اپنی مرضی سے فیڈریشن سے الگ ہو سکتا ہے اور چند صوبے مل کر اپنی جداگانہ فیڈریشن بنا سکتے ہیں۔ یہ تجویز دو قومی نظریے کی تائید کرتی تھی۔

''ہندوستان چھوڑ دو'' (اگست 1942ء)

''کرپس مشن'' کے رخصت ہونے کے بعد گاندھی کے خیالات میں ایک اور تبدیلی آئی۔ جنگ عظیم کے اوائل میں جب تک برطانوی سامراج اور اس کے اتحادیوں کو کوئی گزند نہ پہنچا تھا' وہ برطانیہ کے ساتھ بھرپور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ جوں جوں برطانیہ کی جنگی پوزیشن کمزور ہوتی گئی وہ مخالفت بلکہ دشمنی کا رویہ اختیار کرتے گئے۔ شروع میں تو اُن کے شر دھیمے تھے' لیکن بات 1941ء کی انفرادی سول نافرمانی سے شروع ہو کر 1942ء کے اعلانِ جنگ تک پہنچی۔ جاپان نے دسمبر 1941ء میں پرل ہاربر پر بمباری سے امریکی بحریہ کو تباہ کر دیا تھا۔ پھر چند ماہ کے اندر اندر شنگھائی' سیام اور برطانوی ملایا کو زیر تسلط لاتے ہوئے 15 فروری 1942ء کو سنگاپور بھی فتح کر لیا۔ جاپانی فوجیں 15 فروری 1942ء کو رنگون میں داخل ہو گئیں۔ رنگون برما کا دارالحکومت تھا۔ یہاں سے جزائر انڈیمان کا رخ کیا اور اس پر قبضہ کر کے ہندوستان کے شہر کلکتہ پر بمباری شروع کر دی۔

جونہی کلکتہ پر بمباری شروع ہوئی' اُسی وقت کانگریسی لیڈروں نے یہ تصور دینا شروع کر دیا کہ اب انگریز کے پاؤں اکھڑ گئے ہیں' اس لئے اس کو ہندوستان سے فی الفور نکل جانا چاہئے' کیونکہ اگر جاپان ہندوستان میں داخل ہو گیا تو ہندو عوام انگریز کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ کانگریس نے اپنی مجلس عاملہ کا اجلاس بلایا' جس میں کانگریس کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ چونکہ انگریز مشرق میں شکست کھا چکا ہے اور اس کا وقار خاک میں مل گیا ہے' اس لئے ہندوستان اُس کے جائز ورثا یعنی ہندوؤں کے حوالے کر کے چلا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو کانگریس حکومت کے خلاف سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہوگی۔

سوبھاش چندر بوس جو کبھی کانگریس کے صدر بھی رہ چکے تھے' اس امر کا جائزہ لے رہے تھے کہ انگریز کو مشرقی محاذ پر کس قدر مار پڑتی ہے۔ جب انہوں نے جاپان کا پلہ بھاری دیکھا تو وہ ہندوستان سے بھاگ کر جاپانی فوج کے ساتھ اس خیال سے شامل ہو گئے کہ وہ جاپانیوں سے مل کر ہندوستان کو انگریز کے چنگل سے آزاد کرائیں گے' لیکن جلد ہی جنگ کا پانسہ بدل گیا اور جاپانی فوجوں کی پیش قدمی پسپائی میں تبدیل ہونے لگی۔

14 جولائی 1942ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے واردھا کے مقام پر ایک قرارداد منظور کی' جس میں کہا گیا کہ کانگریس نے پوری تن دہی سے اس امر کی کوشش کر کے دیکھ لیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد ہو جائے' لیکن ہم بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جب تک بیرونی طاقت یعنی انگریز اس خطہ زمین پر موجود ہیں' ان دونوں فرقوں میں مصالحت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب چونکہ جاپان ہندوستان کے لئے خطرے کا باعث بن گیا ہے' اس لئے بہتر یہی ہے کہ انگریز جس قدر جلدی ہو' ہندوستان سے نکل جائے اور اسے اس کے اصل مالکوں کے حوالے کر جائے۔

مگر گاندھی کا خیال تھا کہ چونکہ انگریز اب چاروں طرف سے مصائب میں گھرا ہوا ہے' اس لئے وہ خوف زدہ ہو کر ہندوستان چھوڑ جائے گا جس کے بعد پورے ہندوستان میں رام راج قائم کر کے اسے اکھنڈ بھارت کی شکل دے دی جائے گی۔ لیکن انگریزوں نے کانگریس کی دھمکیوں کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اُن کی سرد مہری کو دیکھ کر کانگریس نے 7 اگست 1942ء کو فیصلہ کیا کہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' (Quit India) کی تحریک فوراً شروع کر دی جائے۔

چنانچہ 7 اگست کو گاندھی کے حکم پر اور اُن کی سرکردگی میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع ہو گئی۔ گاندھی کا طرزِ استدلال یہ تھا کہ جاپانی ہندوستان پر صرف اس لئے حملہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ برطانیہ سے برسرپیکار ہیں۔ اگر انگریز یہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں تو جاپانی اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گے۔ یہ طرزِ فکر حقیقت پسندی کے خلاف تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہماری جنگ آزادی کا یہ مرحلہ کھلم کھلا بغاوت کا مرحلہ ہے۔ ہمیں بدامنی

اور لاقانونیت منظور ہے' لیکن موجودہ حکومت قبول نہیں۔

حکومت نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے معقول انتظامات کر رکھے تھے۔ کانگریس کا اعلان آتے ہی حکومت نے گاندھی اور تمام کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا' جن میں مولانا ابوالکلام آزاد' پنڈت جواہر لال نہرو' مسز سروجنی نائیڈو وغیرہم شامل تھے۔ اُن کی گرفتاری کے فوراً بعد پورے ہندوستان میں وسیع پیمانے پر غیر قانونی بلکہ تخریبی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ سرکاری عمارت کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ تار گھروں کی تاریں منقطع کر دی گئیں۔ سرکاری خزانے لوٹے گئے۔ متوازی حکومت دفاتر کھولے گئے۔ ٹیکسوں کی ادائیگی روک دی گئی۔ غرضیکہ کانگریسی صوبوں میں' خاص طور پر' زندگی کے معمولات معطل ہو کر رہ گئے۔ ان تشدد آمیز کارروائیوں میں 940 افراد ہلاک اور ایک کروڑ 35 لاکھ روپے کی املاک کا نقصان ہوا۔

کانگریس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کے دوران کئی ہندو لیڈروں اور اخباروں نے جو گرفتار نہیں ہوئے تھے' مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ بھی اس انقلابی تحریک میں شامل ہو جائے۔ انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لیکن قائداعظم نے کہا کہ انگریز اس وقت ہندو مسلم مسئلے کا فیصلہ ہوئے بغیر ہندوستان چھوڑ گئے' تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ہندو ''قرارداد لاہور'' کے مطابق ہمارا مطالبہ تسلیم کر کے اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ ان مخدوش حالات میں ہم نہ تو تحریک کا ساتھ دیں گے اور نہ ہی اس کی مخالفت کے لئے قدم اٹھائیں گے۔ ہمارا نعرہ ''ہندوستان چھوڑو نہیں'' بلکہ ہمارا نعرہ ہے ''ہندوستان تقسیم کرو اور جاؤ''۔

مسلم لیگ نے 16 تا 20 اگست 1942ء کو بمبئی کے اجلاس میں ہندوستان کے تازہ سیاسی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ایک مفصل قرارداد منظور کی' جس کے چیدہ چیدہ نکات حسب ذیل ہیں:

1۔ مسلم لیگ کی رائے میں یہ تحریک اس لئے شروع کی گئی کہ اس طرح نہ صرف حکومت برطانیہ کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ اقتدار کانگریس کے حوالے کر دے بلکہ دس کروڑ مسلمانوں کو بھی جبراً کانگریس کی شرائط پر اُن کے احکامات تسلیم کرنے پر آمادہ کیا جائے۔

2۔ کانگریس ہندوستان کے عوام کے لئے حق خودارادی کا مطالبہ کرتے ہوئے دس کروڑ مسلمانوں کو یہ حق دینے سے کیوں گریزاں ہے۔

3۔ کانگریس چاہتی ہے کہ برطانوی حکومت پہلے اقتدار اُن کے حوالے کر دے اور اس کے بعد ہندو مسلم مسئلہ حل کیا جائے' جبکہ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہندو مسلم مسئلہ پہلے حل کیا جائے اور اس کے مطابق انتقال اقتدار کا مرحلہ طے ہو۔

4۔ ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ محض پُر فریب الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کے پس پردہ ہندوؤں کا پورے ہندوستان پر اقتدار حاصل کرنے کا جذبہ کارفرما ہے جو بالآخر ملک پر ہندو رواج کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

5۔ مسلم لیگ حکومت برطانیہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ بلا تاخیر اور غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے مطالبۂ ''پاکستان'' کو تسلیم کرنے کا فوری اعلان کرے۔

6۔ مسلم لیگ کو یقین ہے کہ قیام پاکستان ہی ہندوستان کے موجودہ مسائل کا منصفانہ اور عادلانہ حل ہے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کی آزادی کا بھی ضامن ہے۔

راج گوپال اچاریہ کا فارمولا (1943ء)

مسٹر راج گوپال اچاریہ کانگریس کے ایک سرکردہ لیڈر تھے۔ مدراس کے وزیراعلیٰ بھی رہ چکے تھے اور آزادی کے بعد بھارت کے گورنر جنرل بھی بنے۔ وہ کانگریس مسلم لیگ مفاہمت کے لئے جیل میں مسٹر گاندھی سے کئی بار ملے اور تبادلۂ خیال کیا۔ ان ملاقاتوں اور مذاکرات کے بعد گاندھی کی منظوری سے مسٹر اچاریہ نے ایک منصوبہ بنایا اور قائداعظم کو پیش کیا۔ منصوبے کے اہم نکات یہ تھے:

1۔ مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح کانگریس اور مسلم لیگ میں متفقہ بنیادوں پر مفاہمت کرانے کی کوشش کریں گے۔

2۔ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کے لئے کانگریس کے مطالبے کی تائید اور عبوری حکومت کے قیام میں مندرجۂ ذیل شرائط پر عمل کرے گی:

(الف) جنگ کے خاتمے پر ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی حصوں میں مسلم اکثریتی اضلاع کی حد بندی کرے گا۔ اس کے بعد یہ کمیشن استصواب رائے یا کسی اور قابلِ اعتماد طریقے سے معلوم کرے گا کہ کیا یہ حصے ہندوستان سے علیحدگی چاہتے ہیں۔ اگر اکثریت نے ہندوستان سے الگ ہونے کے حق میں رائے دی تو ان کے فیصلے کا احترام کیا جائے گا' البتہ سرحدی اضلاع کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ تقسیم شدہ حصوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں' شامل ہو جائیں۔

(ب) رائے دہی سے پہلے سیاسی جماعتوں کو عوام تک اپنا نقطۂ نظر پہنچانے کی آزادی ہوگی۔

(ج) اگر آبادی کا تبادلہ ضروری سمجھا گیا تو یہ رضا کارانہ بنیادوں پر ہوگا۔

3۔ ان تجاویز پر برطانیہ سے انتقال اقتدار کے بعد درآمد کیا جائے گا۔

قائداعظم نے مسٹر اچاریہ کی تجاویز کے مضمرات سے مسلم عوام کو آگاہ کرنے کے لئے ایک مفصل بیان اخبارات کو جاری کیا' جس میں منصوبے کی بعض بنیادی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

(الف) منصوبے میں دستور کا ذکر کیا گیا لیکن کہیں بھی یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ اشارہ کس دستور کی طرف ہے۔

(ب) منصوبے میں مسلم لیگ سے کانگریس کے مطالبہ آزادی ہند کی تائید کا تقاضا کیا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ شرط مسلم لیگ پر کانگریس کے روایتی الزام کا اعادہ ہے اور یہ ثابت کرنا مطلوب ہے کہ مسلم لیگ آزادیٔ ہند کی خواہاں نہیں۔ لہٰذا کانگریس کے مطالبۂ آزادی کی تائید ضروری ہے۔

(ج) منصوبے میں مسلم لیگ سے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے جبکہ یہ مطالبہ مسلم لیگ کے اصولی موقف کے منافی ہے' اس لئے کہ اس طرح مسلم لیگ کانگریس کے غلبے کو تسلیم کرنے کی مرتکب ہوگی اور مسلمانوں کو حکومت میں ماتحت اور ذیلی حیثیت حاصل ہوگی۔

(د) منصوبے میں عبوری حکومت کی ہیئت ترکیبی اور اُس کے اختیارات کی تفصیلات کا ذکر نہیں۔

(ہ) منصوبے میں شمال مشرقی اور شمال مغربی حصوں میں استصواب رائے کے لئے مجوزہ کمیشن کے بارے میں یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ کمیشن کون مقرر کرے گا' اس کے ارکان کون ہوں گے اور ان کا انتخاب کیسے عمل میں آئے گا۔

اگر بغور دیکھا جائے تو سی آر فارمولا میں کرپس مشن اور صوبائی خودمختاری کے پلان کو ایک نئے لبادے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی' جس میں بعض اہم امور کی تصفیہ کرنے کا حق ہندو اکثریت کے زیر اثر مرکز کو حاصل تھا جبکہ قائداعظم مشرقی اور مغربی حصوں میں ایک ایسی آزاد اور خودمختار مملکت کا مطالبہ کر رہے تھے جسے داخلی اور خارجی امور میں مکمل آزادی حاصل ہو۔ ہندو اخبارات نے اچاریہ فارمولا کی خوب تشہیر کی اور عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ اور اس کی قیادت کسی قسم کی مفاہمت کے لئے تیار نہیں' لیکن قائداعظم کے بروقت اور مدلل بیان

نے ہندو پروپیگنڈے کے گمراہ کن اثرات کو زائل کر دیا۔

وائسرائے گاندھی خط و کتابت (1944ء)

وائسرائے لارڈ لنلتھگو کی مدت ملازمت اکتوبر 1943ء میں ختم ہو رہی تھی۔ ان کی جگہ لارڈ ویول کا تقرر ہوا' جو اس سے پیشتر ہندوستان میں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے کام کر چکے تھے اور برعظیم کے حالات سے بخوبی آگاہ تھے۔ لارڈ ویول نے ہندوستان پہنچ کر برطانوی مقاصد کی تکمیل کے لئے پوری احتیاط کے ساتھ مناسب اقدامات کا آغاز کیا۔ جنگی کارروائیوں کے لئے افرادی اور مادی رسد کو بلا روک ٹوک جاری رکھنا اُن کی اولین ترجیح تھی۔ تاہم آئینی مسائل اور سیاسی بحران کو نظر انداز کرنا بھی قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے برطانیہ کے مفادات کے فوری تقاضوں کے پیش نظر اپنی حکمت عملی وضع کی' خصوصاً اس لئے کہ جنگ عظیم میں حالات تیزی سے پلٹا کھانے لگے۔ یورپ میں جنگی نقشہ اتحادیوں کے حق میں بدل رہا تھا۔ جرمن نازیوں کی جنگی صلاحیتیں جواب دے رہی تھیں اور ناکامی کے آثار واضح ہو رہے تھے۔ البتہ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانی افواج کی پیش قدمی اتحادیوں کے باعث تشویش تھی۔

مئی 1944ء میں خرابی صحت کی وجہ سے مسٹر گاندھی کو رہا کیا گیا۔ جیل سے باہر آتے ہی انہوں نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کی ناکامی کے اثرات زائل کرنے کے لئے وائسرائے سے سیاسی مسائل پر خط و کتابت شروع کی' لیکن ان کا لب و لہجہ پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ جنگ عظیم کے ابتدائی دور میں جب برطانوی فوجیں پے در پے شکست کھا رہی تھیں تو مسٹر گاندھی نے اہنسا (عدم تشدد) کے عقیدے کا سہارا لے کر جنگی کارروائیوں میں ہندوستان کی شمولیت کو یکسر مسترد کر دیا تھا' لیکن اب جب کہ اتحادیوں کی فتح یقینی ہو چکی تھی' اہنسا کو آسانی سے فراموش کر کے انہوں نے وائسرائے لارڈ ویول کو ''جنگی کارروائیوں میں مکمل تعاون'' کی پیشکش کی' تاکہ ہندوستان میں رام راج کا نصب العین حاصل کیا جا سکے۔ انہوں نے 27 جولائی 1944ء کو وائسرائے کے نام ایک خط میں لکھا:

''میں کانگریس کی مجلس عاملہ کو یہ مشورہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ وہ ایک بیان کے ذریعے اعلان کرے کہ تبدیل شدہ حالات میں اگست 1942ء (ہندوستان چھوڑ دو) والی قرارداد کے مطابق سول نافرمانی کی جو تحریک شروع کی گئی تھی' اُسے جاری نہیں رکھا جا سکتا اور اب کانگریس حکومت کی جنگی کارروائیوں میں پوری طرح تعاون کرے گی' بشرطیکہ فوری طور پر مکمل آزادی دے دی جائے اور مرکزی اسمبلی کو جوابدہ ایک قومی حکومت بنائی جائے' اس شرط کے تحت کہ دورانِ جنگ فوجی کارروائیاں موجودہ انداز ہی میں جاری رکھی جائیں گی' لیکن ہندوستان پر ان کا کوئی مالی بوجھ نہیں پڑے گا۔ اگر برطانوی حکومت مفاہمت کی خواہشمند ہے تو خط و کتابت کی بجائے فوری طور پر مذاکرات کی ابتدا کی جائے۔ میں آپ کے قبضے میں ہوں۔ میں اُس وقت تک دستک دیتا رہوں گا جب تک ایک باعزت سمجھوتے کی بعید ترین امید بھی باقی ہے''۔

لارڈ ویول نے مسٹر گاندھی کو جواب دیتے ہوئے لکھا:

''برطانوی حکومت ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے لئے بڑی بے تابی سے کوشاں ہے۔ لیکن آپ نے جو تجاویز پیش کی ہیں' وہ حکومت کے لئے ناقابل قبول ہیں' اس لئے کہ اس سے پیشتر بھی' جب مولانا ابوالکلام آزاد نے اپریل 1942ء میں ایسی ہی تجاویز سر سٹیفورڈ کرپس کے سامنے رکھی تھیں تو حکومت برطانیہ نے مفصل وجوہ دیتے ہوئے مسترد کر دیا تھا۔ ان تفصیلات میں جائے بغیر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ (1) غیر مشروط آزادی کی پیشکش اس بنیاد پر کی گئی تھی کہ ہندوستان کا آئین یہاں کی قومی زندگی کے تمام اہم عناصر کے اتفاق رائے سے تیار ہوگا اور (2) جنگ کے دوران موجودہ آئین میں کوئی ایسی تبدیلی لانا ممکن نہیں' جس کے تحت آپ کی تجویز کردہ مرکزی اسمبلی کو جوابدہ قومی حکومت کا قیام عمل میں آ سکتا ہو۔ حکومت کی طرف سے ان شرائط کا مقصد ان ذمے داریوں کو پورا کرنا تھا جو اس پر نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے تحفظ کے لئے عائد ہوتی ہیں..... اگر ہندو اور مسلم رہنما اور اہم اقلیتیں ایک ایسی عبوری حکومت کے قیام کے لئے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں جو موجودہ میں رہتے ہوئے کام کرے گی تو مجھے امید ہے کہ مسائل کے حل کے لئے امید افزا پیش رفت ہو سکتی ہے۔ بہرحال عبوری حکومت کی تشکیل سے پہلے تمام متعلقہ عناصر میں آئین سازی کے معاملے پر سمجھوتہ ہونا ضروری ہے' اور یہ سمجھوتہ کرنا ہندوستانی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے''۔

جناح گاندھی مذاکرات (1944)

وائسرائے سے خط و کتابت بے نتیجہ ثابت ہوئی تو مسٹر گاندھی نے قائداعظم کی طرف رُخ کیا اور اپنے مراسلے میں لکھا: ''میں نے جیل سے رہائی کے بعد اب تک آپ سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔ آج میں ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ آیئے ہم دونوں جب بھی آپ چاہیں' ملاقات کریں۔ مجھے اسلام یا ہندوستانی مسلمانوں کا دشمن خیال نہ کریں۔ میں ہمیشہ آپ کا اور پوری انسانیت کا دوست رہا ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے''۔

قائداعظم نے گاندھی کی مزاج پرسی کرتے ہوئے لکھا: ''وسط اگست میں جب بھی آپ کو سہولت ہو' میرے گھر تشریف لے آیئے۔ مجھے آپ کی آمد سے خوشی ہوگی''۔

چنانچہ جناح گاندھی مذاکرات 9 ستمبر کو شروع ہوئے اور 27 ستمبر 1944ء تک جاری رہے۔ گاندھی کی کوشش تھی کہ جناح مطالبۂ پاکستان کے موقف سے دست بردار ہو جائیں' تاکہ ہندوستان دو الگ مملکتوں میں تقسیم نہ ہو' جبکہ قائداعظم کسی بھی صورت میں مسلمانانِ ہند کے اس اہم ترین اور منصفانہ مطالبے کو ترک کرنے پر تیار نہ تھے۔ بالآخر جب مذاکرات ناقابل حل پیچیدگیوں کا شکار ہوئے تو مسٹر گاندھی نے تجویز کیا کہ کسی تیسرے فریق کو ان مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے دعوت دی جائے۔ قائداعظم نے جواباً کہا: کیا میں آپ کو یاد دلا سکتا ہوں کہ آپ نے بار بار مجھ پر واضح کیا ہے کہ آپ یہ گفت و شنید اپنی ذاتی حیثیت میں کر رہے ہیں۔ پھر کسی تیسرے فریق یا فریقین کو ہمارے مابین تصفیہ کرنے کے لئے کیونکر مدعو کیا جا سکتا ہے''۔

مذاکرات کے دوران دونوں رہنماؤں میں مراسلات کا تبادلہ بھی ہوا' جن میں انہوں نے مختلف امور پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ 15 ستمبر کو مسٹر گاندھی نے اپنے مکتوب میں لکھا:

''تاریخ میں مجھے ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک میں مذہب تبدیل کرنے والے افراد اور ان کی اولاد نے اپنے اسلاف سے الگ حیثیت کا تقاضا کیا ہو۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اس کے لاتعداد سپوتوں کی تبدیلیٔ مذہب کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی

رہنا چاہئے''۔

قائداعظم نے گاندھی کے اس خط کے جواب میں لکھا:

''ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اور ہندو کسی بھی اعتبار اور معیار سے دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ہم دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہماری تہذیب و ثقافت جدا ہیں۔ زبان اور ادب' فن اور اسلوب' تعمیرات' نام اور پہچان' اقدار اور اطوار' قوانین اور اخلاقی ضوابط' رسم و رواج' مہ و سال (کیلنڈر)' تاریخ اور روایات' رجحانات و خواہشات سبھی کچھ مختلف ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی پر اور زندگی کے بارے میں ہمارے اپنے مخصوص نظریات ہیں اور تمام بین الاقوامی قوانین کی رو سے ہم ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

مسٹر گاندھی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود قائداعظم کو مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہونے یا اس میں ردوبدل کرنے کے لئے آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور جناح گاندھی مذاکرات ناکام ہو گئے۔

جناح گاندھی مذاکرات اور خط و کتابت میں ناکامی سے مسلم لیگ اور کانگریس میں فاصلے بڑھ گئے اور ہندو مسلم روابط میں جو خلیج حائل تھی' وہ وسیع تر ہو گئی۔ جو حلقے مفاہمت کی امید لگائے بیٹھے تھے' انہیں بے حد مایوسی ہوئی اور برعظیم کا سیاسی ماحول ایک بار پھر شدید کشیدگی کا شکار ہو گیا۔ مسٹر گاندھی نے پے در پے اخباری بیانات دیئے' جن کا بنیادی مقصد قائداعظم کے سیاسی تشخص کو مسخ کرنا اور عوام میں مسلم لیگ اور اس کی قیادت کے قومی کردار کے متعلق بدگمانیاں پیدا کرنا تھا۔ قائداعظم نے مسٹر گاندھی کے بے جواز الزامات کا بڑے مدلل اور پُرزور انداز میں جواب دیتے ہوئے ان کے بیانات اور تبصروں میں متعدد تضادات کی نشان دہی اور اُن کی تجاویز کا حوالہ دیتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ کانگریس کی حکمت عملی کا اصل نصب العین ہندوستان میں رام راج قائم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

شملہ کانفرنس (جون 1945ء)

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد لارڈ ویول کو 1942ء میں ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا جو اُس وقت ہندوستان کا کمانڈر انچیف تھا۔ اُسے وائسرائے بنانے کا مقصد فوج اور انتظامیہ کو قریب لانا اور ہندو مسلم سیاسی تناؤ کو ختم کر کے جنگی نقطۂ نظر سے ملکی وحدت کو برقرار رکھنا تھا۔ مارچ 1945ء میں لارڈ ویول ایک پلان بنا کر مشورے اور منظوری کے لیے انگلستان گیا۔ مئی 1945ء میں جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے تو یورپ میں جنگ ختم ہوئی۔ اب ہندوستان کے مسئلے کا سیاسی حل تلاش کرنا اور بھی ضروری ہو گیا' کیونکہ اب جنگ اور ہنگامی حالت کا بہانہ کام نہیں دے سکتا تھا۔ اب حکومت برطانیہ کے لیے لازم ہو گیا کہ وہ جنگ کے دوران میں کئے ہوئے اپنے وعدے جلد از جلد پورا کرے۔

14 جون 1945ء کو وزیر ہند ایمرے نے دارالعوام میں ایک اعلان میں نئی تجاویز پیش کیں، جن کو ''ویول پلان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس پلان کے بنیادی نکات یہ تھے:

(1) وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی از سرِ نو تشکیل کی جائے گی۔ اس میں اہم سیاسی جماعتوں کو نمائندگی حاصل ہو گی۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔

(2) کمانڈر انچیف کے سوا ایگزیکٹو کونسل کے تمام ارکان ہندوستانی ہوں گے۔ جب تک دفاع حکومت کی ذمہ داری ہے' یہ نظام رائج رہے گا۔

(3) امور خارجہ کا محکمہ کسی ہندوستانی کے سپرد ہو گا۔

(4) ایگزیکٹو کونسل کے ارکان کا انتخاب وائسرائے سیاسی رہنماؤں کے مشورے سے کرے گا۔ تاہم تقرری کی منظوری اور توثیق حکومت برطانیہ سے لی جائے گی۔

(5) گورنر کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اپنی کونسل کو فیصلہ مسترد کر دے مگر وہ بلاوجہ اس اختیار کو استعمال نہیں کرے گا۔

لارڈ ویول نے ہندوستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں (کانگرس اور مسلم لیگ) کے سربراہوں، موجودہ اور سابق وزراء اعلیٰ' مرکزی اسمبلی میں کانگرس اور لیگ کے ڈپٹی لیڈر اور کونسل آف سٹیٹ میں دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ شرکاء میں قائداعظم' نواب زادہ لیاقت علی خان' مولانا ابوالکلام آزاد' ڈاکٹر پی این بینرجی' بھولا بھائی ڈیسائی' ڈاکٹر خان صاحب' خضر حیات ٹوانہ' خواجہ ناظم الدین' راج گوپال چاریہ' ایس آر شکلا' ماسٹر تارا سنگھ' محمد سعد اللہ اور شری کرشنا سہنا سمیت کل 21 حضرات شامل تھے۔

کانگرس کے آمر مطلق موہن داس کرم چند گاندھی نے شملے میں موجود ہونے کے باوجود کانفرنس میں شرکت نہ کی' کیونکہ اُن کے بقول وہ تو کانگرس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں تھے، اور نہ ہی وہ کانگرس کی نمائندگی کرتے تھے۔

25 جون 1945ء کو وائسرے گل راج شملہ میں کانفرنس کا آغاز ہوا۔ لارڈ ویول نے اپنی تقریر میں سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ قائداعظم اور ابوالکلام آزاد نے اپنی اپنی جماعتوں کے موقف پر اظہار خیال کیا۔ جس کے بعد عام بحث کا آغاز ہوا۔ شملہ کانفرنس میں دونوں جماعتوں کے درمیان یہ تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا کہ آیا مجوزہ کونسل میں کانگرس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے کوٹے میں سے کسی مسلمان کو نامزد کرے اور کیا لیگ ہی صرف مسلم ارکان کی نامزدگی کا اختیار رکھتی ہے۔

اس مسئلے کے حل کی خاطر لارڈ ویول نے تمام جماعتوں سے اپنے اپنے نمائندوں کی ایک فہرست پیش کرنے کو کہا' تاکہ وہ خود اپنی کونسل کے ارکان منتخب کرے۔ قائداعظم نے اس طریقہ کار کو مسترد کر دیا' کیونکہ ایسا کرنے سے لیگ کی نمائندہ حیثیت کی ساکھ ختم ہو کر رہ جائے گی۔ 7، جولائی تک مسلم لیگ کے سوا تمام مدعو سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے نمائندوں کی فہرست وائسرائے کو بھیج دی' لیکن مسلم لیگ کی طرف سے ناموں کی فہرست دینے کی بجائے وائسرائے کو قائداعظم نے ایک خط لکھا جس میں مندرجہ ذیل دو اُمور کی طرف وائسرائے کی توجہ مبذول کرائی گئی:-

(1) کیا وائسرائے تمام مسلم ارکان کے تقرر کے سلسلے میں مسلم لیگ کے حق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہے؟

(2) دوسری اقلیتوں کو جو نمائندگی دی جائے گی' اُس کی نوعیت کیا ہو گی؟

9 جولائی کو وائسرائے نے قائداعظم کو تحریری طور پر آگاہ کیا کہ انہیں یہ منظور نہیں کہ ایگزیکٹو کونسل کے تمام ارکان مسلم لیگ ہی سے لیے جائیں۔ اس پر قائداعظم نے اُسی روز وائسرائے کو لکھ بھیجا کہ ایسی صورت میں مسلم لیگ کی طرف سے مجوزہ کونسل میں شرکت کے لیے ناموں کی فہرست ارسال کرنا فضول ہے۔ قائداعظم کے خط پر جواب میں وائسرائے نے تحریراً اطلاع دی کہ پانچ مسلم ارکان میں سے مسلم لیگ کے چار ارکان کو شامل کیا جا سکتا ہے' اور پانچواں رُکن اگرچہ ہو گا مسلمان ہی' لیکن اس کا تعلق مسلم لیگ سے نہیں' بلکہ کسی اور جماعت سے ہو گا۔ جبکہ قائداعظم کا اصرار تھا کہ کونسل کے تمام پانچوں مسلم ارکان مسلم لیگ ہی سے لیے جائیں۔

مجوزہ کونسل کی تشکیل میں یونینسٹ پارٹی کے لیڈر اور پنجاب کے ٹوڈی وزیر اعلیٰ سر خضر حیات کو مسلمانوں کے کوٹے میں سے کونسل کا رُکن بنایا جانا تھا۔ لارڈ ویول کے پرائیویٹ سیکرٹری کلینسی کا کہنا تھا کہ اگر کسی یونینسٹ مسلمان کو کونسل میں نہ لیا گیا تو پنجاب کی حکومت ختم ہو جائے گی۔ اُدھر لارڈ ویول خود بھی اِس وفادار وزیر اعظم کو کونسل میں

1946ء: مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے مقررہ تمیں کی تمیں نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ مجموعی طور پر مسلم لیگ کو 87 فی صد ووٹ ملے۔

شامل کرنے کے لیے مضطرب تھا' کیونکہ فوج کی سب سے زیادہ بھرتی صوبہ پنجاب سے ہوتی تھی۔

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے روز نامہ ''نوائے وقت'' نے 28/جون 1945ء کو لکھا کہ ''وزیراعظم پنجاب مسلمانوں کے اجتماعی مستقبل کو سب سے زیادہ نقصان اور سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی پوزیشن میں ہیں' کیونکہ قائداعظم شملہ میں ایک پارٹی لیڈر کی حیثیت سے نہیں' بلکہ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے ملک معظم کی حکومت کے نمائندے سے گفت وشنید کر رہے ہیں اور کانگرس اُن کی اس پوزیشن کو چیلنج کر رہی ہے اور اسے کمزور کرنا چاہتی ہے''۔

''نوائے وقت'' نے اپنے اداریوں میں خضر حیات ٹوانہ پر واضح کیا کہ پنجاب کی سیاست کو شملہ میں گھسیٹنے اور مسلم لیگ کی مخالفت کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کی پوزیشن خراب ہوگی اور اُن کے مستقبل پر تباہ کن اثر پڑے گا اور اگر اس نازک مرحلے پر انھوں نے مسلمانان ہند کے مقصد و مطالبے کو نقصان پہنچایا یا کمزور کیا تو وہ پنجاب کی پیشانی پر کلنک کا ایسا ٹیکا لگا دیں گے جس کا داغ مدتوں نہ دُھل سکے گا۔

بہرحال لارڈ ویول کو ہزیمت اٹھانی پڑی اور اُس نے 14/جولائی 1945ء کو ویول پلان واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ اُس نے ویول پلان اور شملہ کانفرنس کی ناکامی ذمہ داری خود قبول کی تھی' لیکن کانگرس اور برطانوی اخبارات نے حسب عادت یہ ذمہ داری قائداعظم کے سر تھوپ دی۔

مخالفین کی جانب سے قائداعظم پر اس بے بنیاد الزام کا جائزہ لیتے وقت اُن کے موقف کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قائداعظم کا دعویٰ یہ تھا کہ انتظامی کونسل کے لیے مسلمان ارکان نامزد کرنے کی صرف لیگ ہی مجاز و مختار ہے۔ یہ دعویٰ دو بنیادوں پر قائم تھا۔ اوّل یہ کہ ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں اور صرف مسلم لیگ ہی اُن کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ شملہ کانفرنس میں یہ دونوں باتیں معرض نظر میں تھیں' کیونکہ مسلمان اگر ایک قوم تھے تو پھر وہ صرف اپنی قومی جماعت کے ذریعے ہی اپنے مطالبات پیش کرنے کے مجاز تھے۔ لہٰذا اگر قائداعظم اِن دونوں اُصولوں پر سمجھوتہ کر لیتے تو اپنا کیس خود ہی ہار جاتے۔

چند ماہ بعد ہونے والے عام انتخابات نے قائداعظم کے اِس دعویٰ پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نواب زادہ لیاقت علی خان نے لکھا تھا کہ مسلم لیگ نے حالیہ انتخاب صرف دو نکات پر لڑے:

''اوّل یہ کہ مسلمانان ہند اِس برعظیم کی دیگر اقوام سے مختلف و ممتاز ایک مستقل بالذات قوم ہیں' جو کسی دوسری قوم کے ساتھ مدغم ہو کر اپنا ملی تشخص کسی قیمت پر ضائع کرنے کو تیار نہیں۔

دوسرے یہ کہ پاکستان جملہ مسلمانانِ ہند کا متفقہ مطالبہ ہے' اور وہ اسی کو اپنی سیاسی نجات اور سربلندی کا واحد منصفانہ اور معقول ذریعہ تصور کرتے ہیں''۔

عام انتخابات (1945-1946ء)

دوسری جنگ عظیم مئی 1945ء میں اتحادیوں کے حق میں فتح کی صورت میں ختم ہوگئی تھی۔ اب انگریز کو اپنے اُن وعدوں کا پاس بھی تھا جو اُس نے جنگ شروع ہوتے ہی مسلمانانِ ہند کے ساتھ کیے تھے۔ علاوہ ازیں انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی تھی' جو پہلے ہی ہندوستان کے مسائل کو یہاں کے باشندوں کے استصواب رائے کے تحت حل کرنے کے حق میں تھی۔

ان حالات کے پیش نظر مسلم لیگ نے شملہ ہی میں اپنی مجلس عاملہ کے اجلاس (منعقدہ جولائی) میں عام انتخابات کرانے کا مطالبہ حکومت کے سامنے پیش کر دیا۔ مجلس عاملہ کی جانب سے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ عام

1937ء اور 1946ء کے صوبائی انتخابات کے نتائج کا تقابلی جائزہ

صوبہ	انتخابات 1937ء		انتخابات 1946ء	
	جملہ مسلم نشستیں	مسلم لیگ	جملہ مسلم نشستیں	مسلم لیگ
سرحد	36	x	38	17
پنجاب	84	2	86	75
سندھ	35	x	35	28
بنگال	117	40	119	113
یوپی	64	26	66	55
بہار	39	x	40	34
اڑیسہ	4	x	4	4
سی پی	14	x	14	14
آسام	33	9	34	31
مدراس	28	11	29	29
بمبئی	29	20	30	30

انتخابات اس لیے بھی ضروری ہیں کہ ہندوستان میں کانگرس کی یہ غلط فہمی دور ہوجائے کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ انگریز کو مسلم لیگ کی طاقت کا اندازہ بخوبی ہوچکا تھا۔

اُدھر بین الاقوامی جنگ میں جاپانی حکومت اگست 1945ء میں ہیروشما اور ناگاساکی جیسے ہنستے بستے شہروں کی امریکی ایٹم بموں کی تباہ کاریاں کسی اور اپنے شہر میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جاپان کی تباہی اور جرمنی کی بدحالی اُن کی ایسی شکست پر منتج ہوئی کہ اب اتحادیوں کو آئندہ عرصہ دراز تک کسی قسم کے فوجی حملے کا خطرہ نہیں رہا۔

اب برطانیہ بے شک جنگ سے باہر تھا، لیکن اقتصادی لحاظ سے وہ دیوالیہ ہوگیا تھا، اور اُس کی اپنی خودمختاری اور نجات اسی میں تھی کہ وہ اپنی نوآبادیوں سے واپس آجائے۔ چنانچہ 21/اگست 1945ء کو لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ آئندہ موسم سرما میں عام انتخابات ہوں گے ایک نئی دستور ساز اسمبلی بنے گی اور نئی ایگزیکٹو کونسل وجود میں آئے گی۔

پہلے دسمبر 1945ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے یہ انتخابات دوقومی نظریے کی بنیاد پر لڑے۔ کانگرس کے انتخابی منشور میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ کانگرس ہندوستان کے تمام باشندوں کی نمائندہ جماعت ہے اور پاکستان کے قیام کے خلاف ہے۔ کانگرس کو انتخابات میں قوم پرست مسلم جماعتوں کی حمایت بھی حاصل تھی جن میں خدائی خدمت گار، جمعیت العلمائے ہند، مجلس احرار، مومن کانفرنس اور شیعہ کانفرنس شامل تھیں۔ ان کے علاوہ جماعت اسلامی اور خاکسار تحریک بھی مسلم لیگ کے خلاف تھیں۔ اس کے باوجود مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے مقررہ تیس کی تیس نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں۔ جبکہ اُن کے مخالف امیدواروں میں سے 75 فیصد کو اتنے کم ووٹ ملے کہ اُن کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں۔ مجموعی طور پر مسلم لیگ کو 87 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ اس کے برعکس عام نشستوں پر 72 میں سے 57 پر کانگرس کے اُمیدوار کامیاب ہوئے۔ ہندو مہاسبھا کے تمام امیدوار ہار گئے۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے بعد صوبائی انتخابات ہوئے۔ مختلف صوبوں میں الگ الگ تاریخوں پر انتخابات ہوئے۔ تاہم فروری 1946ء کے دوران صوبائی انتخابات کا مرحلہ بھی مکمل ہوگیا۔ یہاں 1937ء اور 1946ء میں مسلم لیگ کی مقبولیت کا نقشہ دیا جارہا ہے۔ یہ اعداد وشمار دسمبر 1946ء میں اُس وقت مزید بہتر ہوگئے جب سندھ میں وزارت سازی کے سلسلے میں دشواریاں پیدا ہوئیں اور سال کے اختتام سے پیشتر صوبائی اسمبلی کے دوبارہ انتخابات کرائے گئے۔ اس مرتبہ مسلم لیگ کے امیدوار تمام مسلم حلقوں میں کامیاب ہوئے اور اس طرح ملک بھر میں صوبائی اسمبلیوں کی 495 نشستوں میں سے مسلم لیگ کو 441 (90 فیصد) نشستیں حاصل ہوئیں۔

صوبوں میں وزارت سازی

صوبائی انتخابات کے بعد صوبوں میں وزارتوں کی تشکیل کا مرحلہ شروع ہوا۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرس کو وزارت سازی میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ البتہ محض دکھاوے کی غرض سے کانگرس نے مسلم لیگ کو وزارتوں میں شامل ہونے کی پیشکش کی، لیکن ایسی شرائط کے ساتھ جو کسی بھی خوددار قوم یا سیاسی جماعت کے لیے قبول کرنا ممکن نہ تھا۔ ان شرائط میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ شق بھی شامل تھی کہ محفوظ حکومت میں شریک ہونے کے بعد مسلم لیگ ایوان میں اپنی جماعتی انفرادیت کو ختم کردے گی اور آئندہ جب بھی ضمنی انتخاب ہوا، وہ کسی شخص کو مسلم لیگ کے اُمیدوار کی حیثیت سے نامزد نہیں کرے گی۔ مسلم لیگ کے قائدین نے نہایت دانشمندانہ فیصلہ کیا اور حکومت میں شمولیت کی بجائے حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرنے کو ترجیح دی۔

مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی واضح کامیابی کے باوجود بعض عناصر کی خودغرضانہ روش کے باعث وزارت سازی کی راہ میں طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔

صوبہ سرحد میں کانگرسی ارکان نے غیر مسلم لیگی ارکان کے اشتراک سے ڈاکٹر خان صاحب کی قیادت میں چار رُکنی کابینہ بنائی جو قیام پاکستان کے چند دن بعد تک برسراقتدار رہی۔

سندھ میں جب کسی پارٹی کی طرف سے وزارت سازی کی کوشش کامیاب نہ ہوسکیں تو گورنر نے صوبائی اسمبلی توڑ کر دوبارہ انتخابات کا اعلان کیا۔ نئے انتخابات دسمبر 1946ء میں ہوئے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کی تمام نشستیں جیت لیں اور 60 ارکان کے ایوان میں واضح اکثریت حاصل کرکے صوبائی وزارت بنائی۔

بنگال میں مسلم لیگ کو 250 ارکان کی اسمبلی میں 113 نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ گورنر نے حسین شہید سہروردی کو اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے 'صوبائی وزارت تشکیل دینے کی دعوت دی۔ مسٹر سہروردی نے آزاد ارکان کی حمایت سے صوبائی حکومت بنائی۔

پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں 175 نمائندوں کے ایوان میں مسلم لیگ 75 نشستیں حاصل کرکے ایوان میں سب سے بڑی جماعت بن کر اُبھری۔ یونینسٹ پارٹی کی کل 20 نشستیں تھیں، جن میں سے چار ارکان مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور چھ ممبروں نے دوسرے گروہوں سے منسلک ہونے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا پنجاب کی نمائندگی کی دعویدار یونینسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد صرف 10 رہ گئی، جبکہ کانگرس کے 23 اور اکالی دل کے 22 ارکان تھے۔ ان حالات میں جمہوری اصولوں کے مطابق گورنر پنجاب کا فرض تھا کہ وہ مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دیتا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ کانگرس نے پورا زور اس مقصد کے حصول پر لگا دیا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی حکومت قائم نہ ہونے پائے۔ کانگرس کے قائد مولانا ابوالکلام آزاد لاہور آکر بیٹھ گئے اور انگریز گورنر گلینسی سے ساز باز کی اور مسلم لیگ کی مخالف جماعتوں کو ہر ممکن مراعات دینے کا وعدہ کیا۔ آخر کار اُن کی کوشش بارآور ثابت ہوئیں اور مولانا صاحب یونینسٹ پارٹی، کانگرس اور اکالی دل کے ارکان پر مشتمل ایک مخلوط حکومت اور اسمبلی میں صرف دس ارکان کے لیڈر ملک خضر حیات ٹوانہ کو اس کا سربراہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے پنجاب میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو حکومت سے باہر رکھنے کی خاطر یونینسٹ، کانگرس اور اکالی دل کا جو ملاپ گورنر ہاؤس میں بیٹھ کر کرایا، اس کا برملا اعتراف انھوں نے اپنی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''مجھے پنجاب میں صرف یہی کرنا تھا کہ کانگرس کو حکومت میں لے آؤں...... میری کوششوں سے مسلم لیگ سب سے کٹ کر رہ گئی اور کانگرس اقلیت میں ہونے کے باوجود ایک فیصلہ کن حیثیت میں آگئی۔ خضر حیات خان وزیراعلیٰ بنتے ہیں تو کانگرس کی مدد سے، اور یوں وہ قدرتی طور پر کانگرس کے زیر اثر آگئے...... یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب کی حکومت میں کانگرس شریک ہوسکی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جسے اب تک ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں نے اعتراف کیا کہ میں نے نہایت غیر معمولی سیاسی فہم وفراست کا ثبوت دیا ہے۔ سارے ملک کے آزاد امیدواروں نے مجھے مبارک باد دی۔ یوپی کانگرس کے ترجمان اخبار ''نیشنل

ہیرالڈ'' نے مجھے اِس بات پر تہنیت پیش کی کہ میں نے ایک پیچیدہ اور مشکل مسئلے کو بڑی ذہانت سے حل کر دیا۔ اس اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ میں نے جس دانش مندی اور سیاسی تدبر کا مظاہرہ کیا ہے' اُس کی مثال کسی دوسرے کانگرسی رہنما کے کارناموں میں دستیاب نہیں''۔

لیکن مسلمانانِ پنجاب نے اس ناجائز' غیر اخلاقی اور غیر جمہوری حربوں سے حاصل کردہ اقتدار کے خلاف ایک زبردست انقلابی تحریک کا آغاز کر دیا۔ 6 اکتوبر کو پورے صوبے میں مسلمانوں نے مکمل ہڑتال کی۔ تمام کاروباری ادارے بند رہے۔ گلی کوچے حکومت کے خلاف نعروں سے گونج اُٹھے۔ جلوس نکلے' جلسے ہوئے۔ خضر وزارت کے خلاف ہر طرف مظاہروں کا طوفان اُمنڈ کھڑا ہوا۔ شہر' قصبے اور دیہات' ہر جگہ مظاہرین اور پولیس کے درمیان خون ریز تصادم روزمرہ کا معمول بن گیا۔ کانگرسی حکومت نے اس عوامی تحریک کو جتنی سختی سے دبانا چاہا' وہ اُسی قدر شدت سے پھیلتی گئی۔ اس قومی جدوجہد میں مسلم لیگی کارکنوں اور طلبہ کے علاوہ علماء' وکلاء' ادباء' دانشور' آجر اور اجیر ہر طبقے کے افراد نے پورے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس اہم موقع پر پنجاب کی مسلم خواتین نے بھی ایثار و قربانی کی شاندار مثالیں قائم کیں۔ بالآخر حکومت نے عوام کے دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے' اور 2/مارچ 1947ء کو خضر حیات خان ٹوانہ نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ پنجاب کے مسلمان فتح یاب ہوئے اور انھوں نے قیام پاکستان کی جنگ میں ایک اور معرکہ سر کر لیا۔

وزارتی مشن (مارچ 1946)

''شملہ کانفرنس'' کی ناکامی اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج کے پیش نظر حکومت برطانیہ ہندو مسلم تنازعہ از سر نو حل کرنے پر مجبور ہوگئی۔ چنانچہ 19/فروری 1946ء کو برطانوی وزیراعظم لارڈ کلیمنٹ ایٹلی نے تین وزراء پر مشتمل ایک کابینہ مشن یا وزارتی مشن ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا۔ اس مشن کے سربراہ لارڈ پیتھک لارنس تھے اور باقی دو ارکان سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزنڈر تھے۔

وزارت مشن 24/فروری 1946ء کو ہندوستان پہنچا۔ یہاں اس مشن کے ارکان نے کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سے مذاکرات کئے اور 16/مئی 1946ء کو اپنے منصوبے کا اعلان کیا' جس کے بنیادی نکات یہ تھے:۔

(1) برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں پر مشتمل ایک ''یونین آف انڈیا'' ہوگی' جس کی تحویل میں امور خارجہ' دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔ یونین کو اِن امور کے انتظامات کے لیے مطلوبہ فنڈ حاصل کرنے کا اختیار ہوگا۔

(2) صوبوں کے تین گروپ بنا دیئے جائیں گے۔ گروپ ''اے'' ہندو اکثریت کے چھ صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ گروپ ''بی'' میں پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان اور گروپ ''سی'' میں بنگال اور آسام شامل ہوں گے۔

(3) مجوزہ انتظام یہ تھا کہ ہر صوبے کی اپنی حکومت ہوگی۔ اس کے اوپر ہر گروپ کی حکومت ہوگی اور سب سے اوپر یونین کی محدود حکومت ہوگی۔ گروپوں کی حکومتیں بہت خود مختار بلکہ با اختیار ہوں گی اور اس طرح اکثریتی منطقوں کو دفاع' امور خارجہ اور مواصلات کو چھوڑ کر باقی تمام معاملوں میں کلی اختیار ہوگا۔

(4) دستور سازی کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخابات ہوگا' جس کو علیحدہ' علیحدہ گروپوں میں بیٹھ کر صوبائی دستور بنانے تھے۔ یہ تھا مشن کی سکیم کا پہلا حصہ۔

(5) دوسرا حصہ یہ تھا کہ عبوری دور کے لیے ایک نمائندہ عبوری حکومت بنائی جائے گی' جس میں بڑی بڑی پارٹیوں کے ساتھ اقلیتیں بھی شامل ہوں گی۔

(6) دس سال کے بعد کوئی گروپ چاہے تو وہ انڈین یونین سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔

وزارتی مشن کا اصرار تھا کہ اِس سکیم کے دونوں حصے باہم مربوط ہیں' اس لیے دونوں کو قبول کرو یا دونوں کو نامنظور۔ جو پارٹی اسے نامنظور کرے گی' اُسے نظر انداز کر کے تعاون کرنے والی پارٹی کی مدد سے عبوری حکومت کی تشکیل کی جائے گی۔

دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان مفصل بحثوں کے بعد کانگرس نے سکیم کا پہلا حصہ یعنی دستور سازی کا حصہ تو منظور کر لیا' لیکن عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ نے دونوں حصوں کی توثیق کر دی' لیکن قبولیت کی وجہ یہ بتائی کہ صوبوں کی گروپ بندی سے مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت کو فوری طور پر بروئے کار لایا جا سکے گا اور اس سکیم کے اندر رہتے ہوئے دس سال کے اندر اندر پاکستان بن جائے گا۔

حکومت برطانیہ کو اُمید یہ تھی کہ کانگرس اس سکیم کو منظور کرے گی اور مسلم لیگ نامنظور کرے گی' لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ مشن کے ارکان اپنے وعدے اور موقف کے مطابق' کانگرس کو نظر انداز کر کے مسلم لیگ کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دیتے' لیکن وہ اپنے وعدے اور موقف سے مکر گئے۔

کانگرس نے سکیم کے پہلے حصے کی جو لولی لنگڑی منظوری دی تھی' وہ اس طرح واپس لے گئی کہ پنڈت نہرو نے اعلان کیا کہ گروپ بندی کو کابینہ مشن کی سکیم کا لازمی جز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی صوبے کو اس کے مقررہ گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ نیز دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے' اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری کی ساری سکیم مشروط تھی۔ اگر کانگرس کی اس وضاحت کو مان لیا جاتا تو مسلمانوں کا حق خود ارادیت ساقط ہو جاتا اور دستور ساز اسمبلی کانگرس کی مجلس عاملہ کی تابع مہمل بن کر رہ جاتی۔

کانگرس کی مشروط واپسی پر لیگی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور لیگ نے بھی وزارتی مشن کی سکیم پر از سر نو غور کرنے کے بعد اور مشن کی وعدہ خلافی پر احتجاج کرتے ہوئے اپنی سابقہ منظوری واپس لے لی اور 16/اگست کا دن راست اقدام (ڈائرکٹ ایکشن) کے لیے مقرر کیا۔

قرارداد دہلی

کابینہ مشن کی تجاویز کا جائزہ لینے اور مسلمانوں کی رائے عامہ کا اندازہ لگانے کے لیے قائداعظم نے ملک بھر سے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب نمائندوں کا ایک کنونشن دہلی میں طلب کیا جو 7/اپریل سے 9/اپریل تک منعقد ہوا۔ صدر اجلاس کی حیثیت سے قائداعظم نے ملک کے سیاسی حالات کا تجزیہ کیا۔ قائداعظم کے خطاب کے بعد ایک کمیٹی مقرر کی گئی جسے ایک جامع قرارداد تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کمیٹی نے پانچ گھنٹے کے غور و خوض کے بعد قرارداد کا مسودہ پیش کیا جس میں مسلمانانِ ہند کے خدشات' توقعات اور مطالبات کو شامل کیا گیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا:

''مسلم لیگ کے منتخب نمائندوں کا کنونشن مفصل غور و خوض کے بعد اعلان کرتا ہے کہ مسلمان بہ حیثیت قوم کسی ایسے دستور کو تسلیم نہیں کریں گے جو متحدہ ہندوستان کے لیے بنایا گیا ہو۔ وہ کسی ایسے ادارے کی کارروائی میں بھی شریک نہ ہوں گے جو متحدہ ہندوستان کے لیے تشکیل دیا گیا ہو۔ حکومت برطانیہ کا تیار کردہ کوئی ایسا فارمولا' جو برطانوی حکومت سے ہندوستانی عوام کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے بنایا گیا ہو' مگر وہ مندرجہ ذیل منصفانہ اور مساویانہ اصولوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو جو ملک میں امن و آشتی برقرار رکھنے کے لیے تجویز کئے گئے ہیں' تو اس فارمولے

سے ہندوستان کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

(1) شمال مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان یعنی پاکستان کے علاقے' جہاں مسلمانوں کو غالب اکثریت حاصل ہے' وہاں واحد مقتدر آزاد مملکت کی تشکیل کی جائے اور اس امر کا واضح اعلان کیا جائے کہ پاکستان کا قیام بلا تاخیر عمل میں لایا جائے گا۔

(2) دو الگ الگ دستور ساز اسمبلیاں قائم کی جائیں جو ہندوستان اور پاکستان کے لیے علیحدہ علیحدہ دستور بنائیں۔

(3) ہندوستان اور پاکستان میں اقلیتوں کو مسلم لیگ کی قرارداد لاہور 23 مارچ 1940ء کے مطابق تحفظات دیئے جائیں۔

(4) مسلم لیگ کے لیے دستور سازی کے کام میں تعاون اور عبوری حکومت میں شمولیت اُسی وقت ممکن ہے جب مطالبہ پاکستان کی منظوری اور اُس پر عمل درآمد کی یقین دہانی کرادی جائے۔

یہ ''قرارداد دہلی'' کہلاتی ہے اور قرارداد لاہور کے ساتھ مل کر ''قراداد پاکستان'' کا جز ہے۔ اس قرارداد سے حکومت برطانیہ' کابینہ مشن اور کانگرس پر پوری طرح واضح ہوگیا کہ برعظیم کے مسلمانوں کا فیصلہ اٹل ہے۔

یوم راست اقدام (16 اگست 1946ء)

جولائی 1946ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد کی جگہ پنڈت نہرو کو نیشنل کانگرس کا صدر مقرر کیا گیا تو انھوں نے ''وزارتی مشن'' کی سکیم کی رہی سہی اُمیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ مجبوراً مسلم لیگ نے 27/جولائی کو وزارتی مشن کی منظوری کا اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور یوم قیام پاکستان سے ٹھیک ایک سال قبل 16/اگست 1946ء کو ''یوم راست اقدام'' (ڈائرکٹ ایکشن) منانے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ نے ایک قرارداد منظور کی' جس میں کہا گیا: ''اب مسلمانان ہند کے لیے پاکستان حاصل کرنے اور برطانیہ کی غلامی اور ہندو غلبے کی امکانات سے نجات حاصل کرنے کے لیے ''راست اقدام'' کا راستہ اختیار کرنے کا وقت آگیا ہے۔ مسلم لیگ کونسل مسلمانوں سے توقع رکھتی ہے کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اپنی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی پیروی کریں گے اور ہر قربانی کے لیے تیار رہیں گے۔ مسلم لیگ مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے رویے کے خلاف بطور احتجاج حکومت کے دیے ہوئے خطابات فوراً واپس کردیں۔

مسلمانوں نے لیگ کی اس اپیل کا بھرپور جواب دیا اور تمام خطاب یافتہ حضرات نے مسلم لیگ کونسل کے اسی اجلاس میں اپنے اپنے خطابات واپس کر دیئے۔ خطاب یافتہ حضرات باری باری سٹیج پر جاتے اور نعرہ ہائے تحسین اور تالیوں کی گونج کے درمیان اپنے خطاب واپس کرنے کا اعلان کرتے۔ آسام کے سابق وزیراعلیٰ سر سعد اللہ نے ''سر'' کا خطاب اتنے جوش و خروش سے واپس کیا کہ اُن کے مصنوعی دانت اُن کے منہ سے الگ ہو کر اُن کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر آرہے۔

بمبئی کے ایک کانگرس نواز ہفت روزہ رسالے ''بلٹز'' نے اپنے ادارے میں راست اقدام کی کامیابی کے بارے میں لکھا کہ مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناح پر رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گزشتہ ہفتے مسلم لیگ کونسل کی ایک ہی قرارداد سے ''مسلم لیگ مسلمان نوابوں' زمینداروں' نوکروں اور جاگیرداروں کے رجعت پسند گٹھ جوڑ سے ایک انقلاب پسند عوامی جماعت میں تبدیل ہوگئی ہے جو اگر عملاً نہیں تو قولاً برطانوی بادشاہت کے خلاف جدوجہد کر رہی ہے۔ اس انقلابی تبدیلی کو دیکھ کر ہم اس خواہش کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کاش کانگرس کی باگ ڈور مسٹر جناح کی سی مسلمہ قابلیت و دانائی کے نکتہ ور سیاسی رہنما کے ہاتھ میں ہوتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسٹر جناح نے اپنی اعلیٰ سیاست و حکمت کی اپنی اس آخری ضرب سے انگریزوں اور کانگرس دونوں کو شکست دے دی ہے اور اس الزام کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ مسلم لیگ انگریزوں کی پروردہ جماعت ہے''۔

ہندو مسلم فسادات

قائداعظم نے مسلمانوں کو تلقین کی تھی کہ یوم ''راست اقدام'' کو پورے وقار' نظم و ضبط اور امن و امان کے ساتھ منایا جائے اور پرامن جلسے منعقد کیے جائیں۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام شہروں اور قصبوں میں یہ دن نہایت امن و امان اور پر وقار انداز میں منایا گیا' لیکن ہندوؤں نے کلکتہ میں زبردست اخلاقی پستی کا ثبوت دیتے ہوئے غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا اور علاقے کا امن و امان غارت کر دیا۔

کلکتہ میں ''راست اقدام'' کے سلسلے میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ شہر کے تمام محلوں اور کوچوں کے تقریباً تمام مسلمان اس جلسے میں شرکت کے لیے جلسہ گاہ میں آئے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی غیر موجودگی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندو غنڈوں نے تعصب کی بناء پر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانا شروع کر دی۔ لوٹ مار کا آغاز کیا اور خواتین کی بے حرمتی کی۔ اگر کوئی شخص بوڑھا یا ادھیڑ عمر کا سامنے آیا تو اُسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دہشت گردی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ پورا کلکتہ فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ قتل غارت آتش زنی کا یہ بازار مسلسل چار دن رات گرم رہا۔ آخرکار فوج کی مداخلت پر امن قدرے بحال ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کلکتہ شہر کے علاقے میں چھ ہزار افراد موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے' اور اس سے دوگنی تعداد میں زخمی ہوئے۔ پچاس لاکھ روپے کی املاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ ہندو مسلم فسادات کی آگ پورے بنگال' بہار اور یوپی کے کئی شہروں میں پھیل گئی اور ڈیڑھ سال سے بھی زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ سب سے زیادہ شدت پنجاب میں نمودار ہوئی جہاں تقسیم ہند کے بعد بھی پورا سال قتل و غارت کو نہ روکا جا سکا۔ مجموعی طور پر لاکھوں افراد ہلاک ہوئے' پانچ کروڑ افراد بے گھر ہوئے اور کئی ارب روپے کی جائیداد کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ کلکتہ اور نواکھلی کے فسادات کی تحقیقات کے لئے انڈین فیڈرل کورٹ کا ایک جج تعینات کیا گیا۔ ابھی تحقیقات جاری تھیں کہ ملک تقسیم ہو گیا اور کلکتہ ہندوستان کا جز بن گیا۔

عبوری حکومت (اکتوبر 1946ء)

انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ اپنی بدعہدی کی ایک اور مثال قائم کرتے ہوئے کانگریس کو عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی' حالانکہ اس نے کابینہ مشن پلان کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔ عبوری حکومت میں کانگریس کی شمولیت کو قائداعظم نے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف سمجھا۔ اس موقع پر نواب بھوپال نے گاندھی جی کے ساتھ گفتگو کی اور انہوں نے ایک فارمولا طے کیا' جس سے مسلم لیگ کے اعتراضات رفع ہو گئے۔ لیگ کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اُسے صرف مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ گاندھی نے اس پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ ادھر ملک میں بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی اور فرقہ وارانہ فسادات کے پیش نظر لارڈ ویول اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے عبوری حکومت کا کامیابی سے چلنا ناممکن ہے۔ چنانچہ لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی اور 26 اکتوبر کو لیگ کے ارکان نے عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لی۔

مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں مندرجۂ ذیل محکمے سونپے گئے:

تجارت (اسماعیل ابراہیم چندریگر)
مواصلات (سردار عبدالرب نشتر)
قانون (جوگندر ناتھ منڈل)
مالیات (نواب زادہ لیاقت علی خان)
صحت (راجہ غضنفر علی خان)

عبوری حکومت میں لیگ کی شمولیت کے بعد دونوں جماعتوں میں وزارتوں کی تقسیم کے بارے میں تنازعہ پیش آیا۔ سردار پٹیل کی یہ زبردست خواہش تھی کہ وزارتِ امور داخلہ اُس کی تحویل میں دے دی جائے' بلکہ اُس کی یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ حکومت چھوڑنے کو تیار تھا' لیکن محکمہ داخلہ سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔

اس موقع پر ایک کانگریسی مسلمان رفیع احمد قدوائی نے لیگ کو اپنی دانست میں نیچا دکھانے کی خاطر کانگریس کو یہ مشورہ دیا کہ چونکہ لیگ کے پاس کوئی تجربہ کار ماہر اقتصادیات موجود نہیں' اس لئے اول تو وہ یہ وزارت قبول نہیں کرے گی' ورنہ دوسری صورت میں اسے کامیابی سے نہیں چلا سکے گی۔ چنانچہ یوں کانگریس کے بعض لیڈروں کی ملی بھگت سے خزانے کی وزارت مسلم لیگ کے حوالے کی گئی' جس کا وزن لیاقت علی خان نے چودھری محمد علی کی مدد سے اٹھایا جو اس وقت اقتصادی امور کی وزارت میں بڑے عہدے پر فائز تھے۔

سردار پٹیل نے لیگ کو محکمہ مالیات دے کر خود ہی اپنے آپ کو بے دست و پا کر دیا۔ لیاقت علی خان کی مرضی کے بغیر وہ ایک چپڑاسی بھی نہیں رکھ سکتے تھے۔ لیاقت علی نے اُسے اس قدر زچ کیا کہ تقسیم ہند کا یہ سب سے بڑا مخالف اس کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔ خود ابوالکلام آزاد نے تسلیم کیا کہ کانگریس کی یہ زبردست غلطی تھی' کیونکہ جو بھی تجویز لیاقت علی کو پیش کی جاتی' یا تو وہ اس سے مسترد کر دیتے یا اُس کی شکل ہی بدل کر رکھ دیتے۔

28 فروری 1947ء کو لیاقت علی خان نے متحدہ ہندوستان کا آخری بجٹ پیش کیا۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی بجٹ تقریر کا آغاز قرآن مجید کی اُن آیات سے کیا' جن میں ارکانِ دولت کی مذمت کی گئی ہے۔ انہوں نے بجٹ پیش کرتے ہوئے کہا: ''حالیہ جنگ سے امیر' امیر بدترین اور غریب' غریب ترین ہو گئے اور دولت کم سے کم ہاتھوں میں مرتکز ہو گئی ہے۔ قرآن حکیم کے اس حکم پر میرا ایمان ہے کہ دولت کی گردش صرف امیروں ہی کے درمیان نہیں رہنی چاہیئے''۔

لیاقت علی خان کے پیش کردہ بجٹ میں دو اہم تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ اول نمک پر محصول ختم کر دیا گیا۔ دوم انکم ٹیکس سے استثناء کی رقم دو ہزار سے بڑھا کر ڈھائی ہزار کر دی گئی۔ ان تجاویز سے حکومت کی آمدنی میں 8 کروڑ 50 لاکھ روپے کی کمی واقع ہوئی' جس سے 57 کروڑ روپے کے خسارے کا بجٹ سامنے آیا۔ وزیرِ خزانہ نے خسارہ پورا کرنے کی غرض سے ایک لاکھ سے زیادہ کاروباری منافعوں پر 25 فیصد خاص انکم ٹیکس کی تجویز پیش کی۔ دوسرے سرمایے میں 55 ہزار روپے سے زائد افزائش پر ایک تدریجی ٹیکس لگانے طے کیا گیا۔ ٹیکسوں میں چوری روکنے کی غرض سے ایک تحقیقاتی کمیشن کی تجویز بھی رکھی گئی۔

ابتدا میں ان تجاویز کا خیر مقدم کیا گیا' لیکن جلد ہی کانگریس کے سرمایہ دار سردار پٹیل کے پاس پہنچے اور شدت سے بجٹ کی مخالفت کرنے لگے' کیونکہ بجٹ تجاویز نے بقول چودھری محمد علی' ان کے سب سے نازک مقام ''جیب'' کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ ہندوؤں کو بجٹ تجاویز میں اپنی معاشی قوت کو تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ نظر آنے لگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا کہ لیاقت علی خان کے بجٹ نے پٹیل کو تقسیم ہند پر مجبور کر دیا۔ اب کانگریس میں تقسیم ہند کا سب سے بڑا حامی پٹیل تھا۔ اس نے جھنجھلاہٹ اور مجروح انانیت کے باعث اپنا سارا وزن تقسیم کی حمایت کے پلڑے میں ڈال دیا۔ وہ ہر قدم پر محسوس کرتا تھا کہ لیاقت علی نے وزیرِ خزانہ بن کر اُسے بے بس کر دیا ہے۔

(حصولِ پاکستان از احمد سعید)

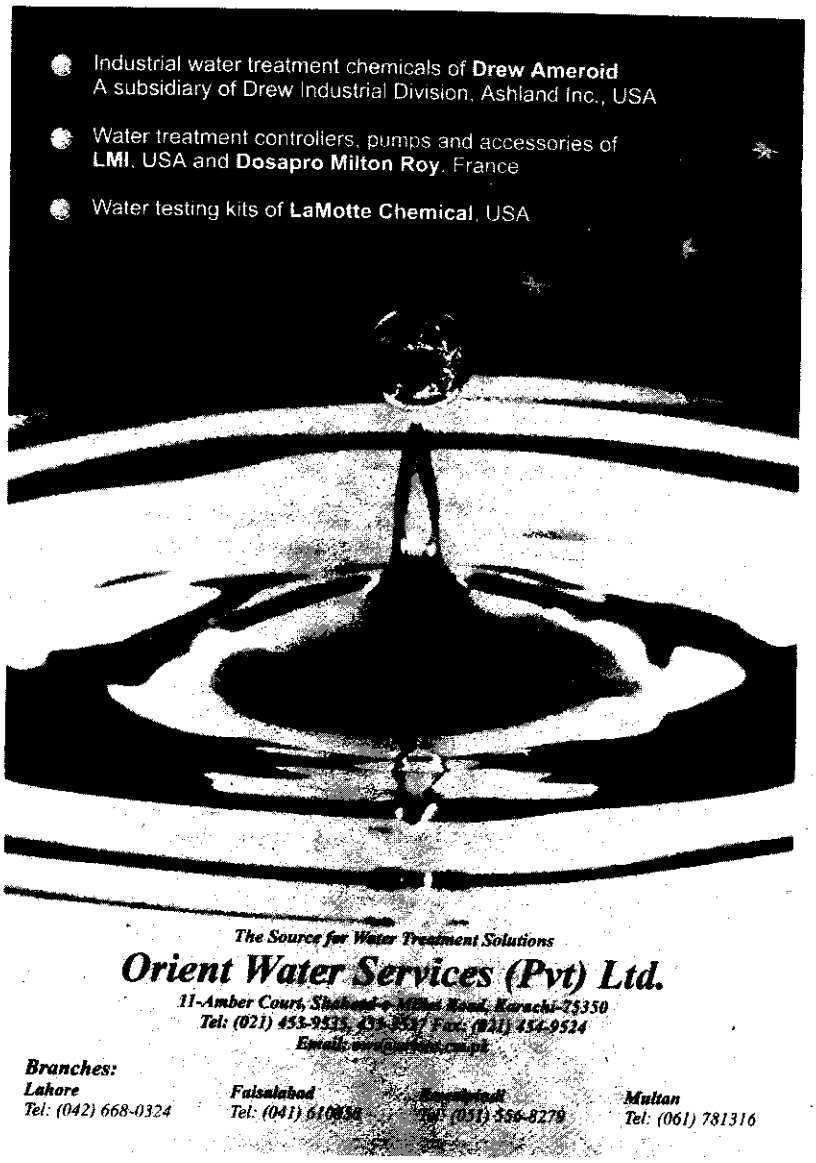

ماؤنٹ بیٹن پلان (مئی 1947ء)

ہندوستان میں سیاسی حالات اب اس قدر نازک میں داخل ہو گئے تھے کہ ان کو سنبھالنا لارڈ ویول کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ کانگریس نے اس وائسرائے کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔

اول یہ کہ لارڈ ویول اپنے ضمیر کے جاگ جانے پر مسلم لیگ کے لیڈر قائداعظم محمد علی جناح کا نقطۂ نظر آسانی سے سمجھنے لگے تھے اور اس کو کسی حد تک اہم گردانے لگے تھے۔

دوم یہ کہ مسٹر گاندھی نے انگلستان میں مقیم کانگریسیوں کو خطوط لکھ دیئے تھے کہ وہ کانگریس کی حمایت اور لارڈ ویول کی مخالفت میں برطانوی کابینہ کی رائے ہموار کریں اور اس سلسلے میں وہ وزیراعظم برطانیہ لارڈ ایٹلی پر زور دیں۔

مسٹر گاندھی کی چال کامیاب رہی۔ چنانچہ 20 فروری 1947ء کو لارڈ ایٹلی نے اعلان کیا کہ بہت جلد لارڈ ویول کو واپس بلا لیا جائے گا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ برطانیہ اب یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کا ہندوستان میں زیادہ دیر تک اقتدار سنبھالے رکھنا کوئی مصالحت آمیز امر نہیں ہے اس لئے جون 1948ء تک ہندوستان کے نمائندوں کو اقتدار منتقل کر کے برطانیہ ہندوستان خالی کر دیا جائے گا۔

لارڈ ایٹلی کے اس بیان میں تحیر بھی تھا اور تاسف بھی مگر اہل ہند کے لئے یہ بیان مسرت کا موجب بن گیا۔

لارڈ ایٹلی کے اس اعلان کو مارچ 1947ء میں عملی جامہ پہنا دیا گیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لارڈ ویول کی جگہ نیا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن 22 مارچ 1947ء کو بحیثیت وائسرائے ہند دہلی پہنچا۔ لارڈ ایٹلی نے اس کو ہندوستان کے بارے میں ایک جامع منصوبہ دے کر روانہ کیا تھا لیکن اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے سے قبل اسے کہا گیا تھا کہ وہ بذات خود ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کر کے ان کے نظریات سے آگاہ ہو جائے۔ اس ہدایت کے پیش نظر اس نے آتے ہی کانگریس کے لیڈر مسٹر جواہر لعل نہرو سے جو اس وقت برطانوی ہندوستان کی وزارت میں وزیر خارجہ کے عہدے پر متمکن تھا' ملاقات کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہرو سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس سے زیادہ اس کی جواں سال حسین بیٹی اندرا سے متاثر ہوا۔ جس کی گفتگو میں اسے غیر معمولی جاذبیت محسوس ہوئی۔

اندرا نے بچپن سیاسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور باپ کے ساتھ ساتھ بہت سے محاذوں پر سفر کی خشت سے نظارے کرتی رہی' اس سے اس کے سیاسی شعور کو جلا ملی۔ تاہم نہرو اور اندرا کی وجہ سے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بہت زیادہ سوچ بچار سے کام لینا پڑا۔ اس کے بعد اس نے دیگر کانگریسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کیا اور کانگریس کے نکتہ نظر سے بخوبی واقف ہوا۔ ویسے تو اس کو لارڈ ایٹلی نے پہلے ہی کانگریس کی ماہیت کو جتا کر اس کی حمایت کرنے کا سبق دے دیا تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن کو یہاں کے کانگریسیوں نے خود بھی ایسے جال میں جکڑ لیا کہ اس کا اس تانے بانے سے نکلنا دشوار ہو گیا۔ اس کی نگاہ میں سب سے صائب مشورے پنڈت نہرو اور اندرا کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ان کانگریسیوں سے بالکل بے تکلف ہو گیا۔ اُدھر کانگریسی لیڈروں نے وائسرائے کی اس بے تکلفی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ نہرو کی مرضی کے مطابق ماؤنٹ بیٹن دوروں کا پروگرام بنایا کرتا۔ اور ان دوروں میں نہرو کی مرضی کے مطابق مشیروں کو ہمراہ لیتا۔ ویسے سرکاری سطح پر اس نے مندرجہ ذیل مشیروں کا انتخاب کیا ہوا تھا۔

1۔ لارڈ اسے۔
2۔ سر ایرک میول
3۔ جارج ششم کا اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری
4۔ وی پی مینن
5۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل
6۔ کیمبل جانسن (پریس اتاشی)

کانگریسی لیڈروں سے ملاقات کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگی رہنماؤں سے ملاقات کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اس نے قائداعظم محمد علی جناح کو ملاقات کے لئے بلایا۔ اس کے خیال تھا کہ شاید یہ بھی کانگریسیوں کی طرح حصول مطلب کے لئے جائز و ناجائز اطوار و خوشامد کا اظہار کریں گے اور فضول خوش گپیوں میں زیادہ تر وقت ضائع کریں گے لیکن قائداعظم کی سنجیدگی اور فقط مطلب کے موضوع پر بات چیت کرنے کے انداز سے وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا یہ لیڈر ہندوستانی ہندوؤں کی طرح وائسرائے کے مزاج کو اپنے مزاج میں سمونے کی کوشش کرے گا۔ لیکن ان کا خیال بالکل غلط ثابت ہوا اور اسے معلوم ہو گیا کہ مسلمان اپنے حصول مقصد کی جدوجہد میں واقعی سنجیدگی سے کوشاں ہیں۔

قائداعظم سے یہ ملاقات 25 مئی 1947ء کو دہلی میں ہوئی۔ دوران گفتگو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے سوال کیا کہ آپ کی پنڈت نہرو کے بارے میں کیا رائے ہے؟

قائداعظم نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ اب ان سے ملاقات کر چکے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ اب جیسا عظیم حاکم ان کے بارے میں کوئی مخصوص تاثر قائم کر چکا ہوگا۔ مونٹ بیٹن اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔ اور اس نے محسوس کر لیا کہ قائداعظم نے میری انا پر ضرب لگائی ہے' وہ دل میں بغض و تعصب قائم کئے بغیر نہ رہ سکے۔

مرکزی کابینہ میں مسلم لیگ کے نمائندوں کی شمولیت سے ہندوؤں میں زبردست بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ اور بالخصوص ان کی بے چینی میں اس وقت گونا گوں اضافہ ہو گیا جب خاں لیاقت علی خاں نے نئے سال کا بجٹ پیش کیا۔ ہندوؤں نے محسوس کر لیا کہ اب مسلمانوں کا ان کے اندر رہ کر کام کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لئے پٹیل کو برملا کہنا پڑا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ واقعی کانگریس اور مسلم لیگ مخلوط وزارت میں کام نہیں کر سکتیں۔ اب ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر ہی دینا مصلحت پر مبنی ہوگا۔

مونٹ بیٹن پہلے ہی تقسیم ہند کا منصوبہ لے کر انگلستان سے روانہ ہوا تھا۔ اور جب اس نے یہاں پہنچ کر کانگریسی لیڈروں کے خیالات کا جائزہ لیا' تو بہت خوش ہوا کیونکہ اس کے خیال میں تقسیم ہند کا منصوبہ جو وہ برطانیہ سے لے کر روانہ ہوا تھا' کانگریس کے لئے مشکل ہی سے قابل قبول تھا۔ تاہم اب اس نے اپنی زبردست کامیابی محسوس کی کہ بغیر کسی دقت کے مسلم لیگ اور کانگریس کے مطالبات کو تسلیم کرنے کے مواقع از خود ہی میسر آ گئے ہیں اور زیادہ پیچیدگیوں اور دھندلکوں میں نہیں الجھنا پڑا۔

ادھر مسٹر گاندھی کو یہ بات بالکل ناگوار گزری کہ ہندوستان کے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ لیکن کانگریس چونکہ اس بات پر اتفاق رائے کا اظہار کر چکی تھی اس لئے اس نے مسلم لیگ کو ناکام سیاسی جماعت ثابت کرنے کے لئے ایک اور سیاسی چال چلی اور حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ مسلم لیگ کو اگر ہندوستان میں مسلم لیگی وزارت قائم کرنے دے اور سلطنت کا نظام اپنے ہاتھ میں لینے دے۔ گاندھی کو معلوم تھا کہ اول تو برطانوی حکومت اس مشورے پر عمل نہیں کرے گی اور اگر اس نے ایسا کر بھی لیا تو مسلم لیگی حکومت کو ناکام بنانے کے لئے پورے ملک میں ہندو اکثریت کی گڑبڑ ایک موثر ہتھیار ثابت ہوگی۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کا یہ مشورہ زبردست منافقت' شرارت اور مکروہ سیاست پر مبنی تھا۔ تاہم انگریز نے گاندھی کی اس تجویز کو ردی کے ٹوکرے میں ڈال دیا۔

لارڈ مونٹ بیٹن نے بات چیت کا پہلا دور بڑی کامیابی سے مکمل کیا۔ اس نے فوراً تقسیم ہند کے منصوبے

جس میں صوبوں کی تقسیم' ضلع سلہٹ کے مشرقی بنگال سے ملنے اور سرحد میں نئے انتخابات کی شرائط درج تھیں 11 اپریل 1947ء تک مکمل کر لیا۔ اس کی رو سے صوبوں کو پہلے آزاد کیا جاتا۔ پھر ہندو مسلم کی اکثریت کی بنا پر گروپ سازی کرتے اور الگ الگ ڈومینین بنا لیتے۔ وائسرائے کے مشیر مسٹر وی پی مینن نے اس منصوبے کو ناقابل عمل قرار دے دیا۔ تاہم 15' 16 اپریل 1947ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے اس منصوبے کو صوبائی گورنروں کی ایک کانفرنس میں پیش کر دیا۔ تمام گورنروں نے اس منصوبے کے اس قدر جلدی تیاری ہو جانے پر حیرت کا اظہار کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی منظوری بھی دے دی۔ وائسرائے کے دوسرے سرکاری مشیر مسٹر اسے اس منصوبے کو لے کر برطانوی کابینہ کی منظوری حاصل کرنے 2 مئی 1947ء کو انگلستان روانہ ہو گئے۔

وائسرائے نے اس منصوبے کی ترسیل کے ساتھ چٹھی میں یہ بھی تحریر کر دیا کہ اس منصوبے کو دونوں جماعتوں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ کی حمایت حاصل ہے۔ نیز یہ بھی تحریر کیا کہ اس کی منظوری 10 مئی 1947ء تک یہاں موصول ہو جانی چاہئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مونٹ بیٹن جس عجلت سے کام لے رہا تھا اس پر دونوں فریقین حیران تھے کیونکہ 20 فروری کے اعلان کے مطابق ہندوستان سے برطانوی اقتدار کی رخصتی جون 1948ء کو ہونے والی تھی۔

لارڈ اسے کو لندن روانہ کر کے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن شملہ روانہ ہو گیا۔ اب کانگریس نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے ٹکڑے ہونے ہی لگے ہیں کیوں نہ کوئی ایسی چال چلی جائے جس سے مسلمانوں کو ملنے والے علاقوں میں کمی ہو سکے۔ اس کے لئے سردار ولبھ بھائی پٹیل خود شملہ پہنچا جہاں اسے وائسرائے سے تنہائی میں بات چیت کرنے کا وافر موقع مل گیا۔ اس ملاقات کے دوران اس نے لارڈ مونٹ بیٹن کو بتایا کہ جو منصوبہ منظوری کے لئے برطانیہ روانہ کیا گیا ہے وہ بالکل نامناسب ہے۔ کانگریس نے حالات کے تحت اس کو قبول تو کر لیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر عمل درآمد سے ہندوستان کا امن و سکون ہمیشہ کے لئے خطرے میں پڑ جائے گا اور برطانوی مفادات کو عمومی سطح پر اور وائسرائے ہند کو خصوصی سطح پر سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پٹیل نے اس قسم کی لغو باتیں کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ کانگریس ہندوستان کے لئے نوآبادیات قبول کرنے کو تیار ہیں بشرطیکہ دو ماہ کے اندر اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

اس سے کانگریس کو یہ فائدہ تھا کہ مسلم لیگ کے لئے برطانیہ سے سودے بازی کرنے اور اپنے حصے حاصل کرنے کے لئے بہت کم وقت رہ جاتا۔ ہزاروں مسائل حل طلب سامنے آ جاتے اور ان کا اتنے تھوڑے عرصے میں حل کیا جانا ناممکن بات تھی۔ واضح رہے کہ ان حالات میں لوٹ کھسوٹ سے ہندوستان' پاکستان کے حصے کی بے شمار چیزیں اپنے پاس رکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مونٹ بیٹن کو ذاتی سطح پر زبردست منفعت کا وعدہ کیا جو کانگریس کی طرف سے پارٹی کی بنیادوں پر مہیا کی جانی تھیں۔ اس سلسلے میں نہرو سے بھی مذاکرات ہوئے اور کرشنا مینن سے بھی اور اس نے بھی پٹیل کے اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا۔ مونٹ بیٹن کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ ایک تو وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو رہا تھا جس کی تکمیل کے لئے اسے یہاں بھیجا گیا تھا۔ اور دوسرے اس کو لارڈ ایملی کی خواہش کے مطابق کانگریس کی حمایت کا موقع مل رہا تھا اور تیسرے یہ کہ اسے ذاتی سطح پر بہت سے مفادات کا حصول ہو رہا تھا۔ اب اس کو پاکستان سے کیا ہمدردی تھی۔ مسلم لیگ کے مفادات اس کی نظر میں ذاتی نقصان کا موجب تھے۔ چنانچہ پاکستان کے وجود کو نقصان پہنچانے کے لئے کانگریس کا یہ وار خالی نہ گیا۔

لارڈ مونٹ بیٹن کے ذہن میں اب ملک کی تقسیم کے ساتھ ذاتی منفعت کا بھی خیال تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ لارڈ اسے کی وساطت سے بھیجے ہوئے منصوبے کی برطانوی منظوری تھوڑی سی ترامیم کے ساتھ وصول ہو گئی جسے 17 مئی 1947ء کو دہلی میں مشترکہ جماعتوں کے ایک

رجوع الی القرآن کے مشن میں
مرکزی انجمن خدام القرآن کے ساتھ معاونت کی مختلف صورتیں

- خود مرکزی انجمن کی رکنیت اختیار کیجئے اور اپنے احباب کو بھی اس کا رکن بنائیے۔
- اپنے میٹرک یا انٹر پاس بچوں کو قرآن کالج میں ایف اے اور بی اے کی تعلیم کے لئے داخل کروائیے۔ احباب کو بھی اس کی ترغیب دیجئے۔
- اگر آپ کالج ریونیورسٹی کے ڈگری یافتہ ہیں اور بفضلہٖ تعالیٰ فعال زندگی گزار رہے ہیں تو ابتدائی دینی تعلیم کے حصول کے لئے قرآن کالج کے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں داخلہ لیجئے۔ اپنے احباب کو بھی ترغیب دلائیے۔
- مرکزی انجمن کے شائع کردہ جرائد یعنی حکمت قرآن' میثاق اور ندائے خلافت کے سالانہ خریدار بنئے اور اپنے احباب کو بھی اس پر آمادہ کیجئے۔ ان جرائد کے لئے اشتہارات کے حصول کی بھی کوشش کیجئے۔
- انجمن کے دعوتِ قرآنی پر مشتمل لٹریچر اور کیسٹس کو عام کیجئے۔ اس کی لائبریریاں قائم کیجئے۔

اجلاس میں پیش کیا جانا تھا۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان نے شامل ہونا تھا۔ کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل نے شرکت کرنا تھی۔ سردار بلدیو سنگھ نے اقلیتوں کی نمائندگی کرنا تھی۔ کانگریس کے ارکان لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پہلے ہی کان بھر چکے تھے۔ وہ اس منصوبے کی منظوری سے بہت ہی نیچ پا ہوئے۔ کانگریس کے اس رویے پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مسٹر مینن کو کانگریس کا قابل قبول منصوبہ تیار کرنے کو کہا۔ ایسا منصوبہ جس کا تصور پہلے ہی اس کو شملہ دیا گیا تھا۔ مسٹر مینن کے پاس چونکہ پہلے ہی پلان تیار تھا' اس لئے وہ چار گھنٹے کے اندر اندر اس کا مسودہ لے آیا۔ اس مسودے کی وصولی پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وزیراعظم برطانیہ کو ایک تار بھیج دیا کہ قبل ازیں ارسال کردہ وہ مسودہ جس میں ہندوستان کی تقسیم کا ذکر ہے' منسوخ تصور کیا جائے۔ اس کی جگہ ایک نیا منصوبہ روانہ کیا جا رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وائسرائے نے 17 مئی کو ہونے والے اجلاس کو 2 جون 1947ء تک کے لئے ملتوی کر دیا۔ 14 مئی 47ء کو وائسرائے دہلی پہنچا' تو اسے برطانوی وزیراعظم کی طرف سے حکم ملا کہ فی الفور لندن پہنچو کیونکہ نیا ثانوی منصوبہ وضاحت طلب ہے۔ اب ماؤنٹ بیٹن مسلم لیگ کو تاریکی میں نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ انگلینڈ میں اس سے سب سے پہلا سوال یہ ہوگا کہ دوسرے منصوبے کی منظوری مسلم لیگ سے بھی حاصل ہو گئی ہے یا نہیں' چنانچہ 17 مئی 47ء کو اس نے مسلم لیگ اور کانگریس کا ایک اجلاس طلب کیا۔ نہرو اور دیگر کانگریسی لیڈر اب بھانڈا پھوٹنے کی وجہ سے بے عزتی سے بچنے کے لئے ایک متبادل منصوبہ لے کر اجلاس میں پہنچے۔ جو مسلم لیگ کے لئے قابل قبول نہ ہو سکتا تھا۔ یعنی وہی کانگریس کی حکومت سے مسلم لیگ کے حق میں دست برداری کا والا منصوبہ۔

اجلاس میں ایسا ہی ہوا۔ جب دوسرے منصوبے کو تسلیم کرنے سے مسلم لیگ نے انکار کر دیا' تو نہرو نے دست برداری والا منصوبہ پیش کر دیا۔ قائداعظم نے اس کو بصد مسرت قبول کر لیا۔ اس طرح کانگریس کا یہ وار خالی گیا۔ اسی اجلاس میں ماؤنٹ بیٹن کی جانبداری واضح ہو گئی جب کہ اس نے مسلم لیگ کو اس فیصلے کو تسلیم کرنے کی حرکت کو غیر مستحسن قرار دیا اور کہا کہ بات یہیں چھوڑ دی جائے میں خود انگلینڈ جا کر ضروری ہدایات لے کر آتا ہوں۔ چنانچہ 28 مئی کو وائسرائے اپنے ایک مشیر مینن کے ہمراہ انگلستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ انگلستان پہنچ کر فی الفور کابینہ کا اجلاس طلب کروایا اور کانگریس لیڈروں کے تیار کردہ منصوبے کی منظوری پانچ منٹ کی بحث کے بعد حاصل کر لی۔ کابینہ کے اس اجلاس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دھمکی دی کہ اگر اس منصوبے کو منظور نہ کیا گیا تو میں واپس ہندوستان نہیں جاؤں گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ شاہی خاندان کے اس لالچی شخص نے صرف چند منٹوں میں کروڑوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کروا لیا اور بصد خوشی واپس ہندوستان آیا۔

ماؤنٹ بیٹن کے اس پلان میں دو باتیں حیرت انگیز نوعیت کی تھی۔ ایک یہ کہ جو صوبے مسلم لیگی اکثریت کے تھے' صرف ان کو ایک علیحدہ مملکت بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ اور ایسے صوبے جہاں مسلم اکثریت ہے' ان کو آبادی کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا۔ اس طرح ایک اور مسئلہ درپیش ہوا کہ ملک کے کون کون سے جغرافیائی علاقے بھارت یا پاکستان میں شامل کئے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی حیثیت متعین کرنے کے لئے وہاں ریفرنڈم کرایا جائے کہ آیا وہاں کے لوگ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا مکمل آزادی کے طالب ہیں؟ دوسرے لفظوں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پاکستان کو ملنے والے علاقوں میں ایک تو خود ہی تخفیف کر آئے۔ اور دوسرے مزید کمی کرنے کے لئے مذکورہ بالا شرائط کو اس منصوبے میں شامل کروا آئے۔ وہ برطانوی کابینہ کو اس بات پر بھی رضامند کر آئے کہ جون 1948ء کی بجائے برطانیہ اگست 1947ء ہی میں اقتدار کی منتقلی کا اعلان کر دے۔ یاد رہے کہ اس عجلت میں کانگرس کی طرف سے دیا گیا لالچ شامل تھا۔ چنانچہ ملک کی تقسیم میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بندر بانٹ کروانے کے لیے ایک اور چال چلی جس کو ریڈ کلف ایوارڈ کے حصول کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں پیش کی جائے گی۔

تین جون کا اعلان تقسیم (1947ء)

یہ بات تو واضح تھی کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ لے کر ہی ہندوستان کی سرزمین پر آیا تھا۔ اب صرف دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اس تقسیم کو کس انداز سے کار فرما کیا جا سکتا ہے اور کس طرح کانگرس کو زیادہ سے زیادہ مراعات دے کر کم از کم سرزمین پاکستان کو دی جا سکتی ہے۔

اس کی آمد کے ابتدائی دنوں ہی میں کانگریس کے لیڈروں نے اس سے ملاقاتیں کر کے کانگرس کا موقف وائسرائے پر اس طرح واضح کیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر کانگرس نواز بن چکا تھا۔ مونٹ بیٹن کو کچھ تو لارڈ اٹیلی کے نظریات نے ایک خاص فیصلہ کرنے کے لیے متاثر کیا ہوا تھا۔ کچھ کانگریسی لیڈروں کی سحر کاری اور مکاری نے اس کو اور ورغلا دیا تھا۔ تاہم اس نے وہ تمام ہتھکنڈے اسی انداز سے میں اپنائے جو کانگرس نے اس کو سمجھائے تھے۔

نہرو کی خوبصورت بیٹی نے سماجی اور اخلاقی محاذ پر انگریزی حکمران کے دل کو لبھایا اور بہت سے مسائل کو حل کرنے میں خاطر خواہ مدد کی۔ انہی ملاقاتوں کے دوران پٹیل نے اپنی زبان سے ملک کو تقسیم کرنے کی پیش کش کر دی تھی جس سے ماؤنٹ بیٹن کی مشکل اپنے آپ حل ہو گئی تھی اور اس کو زیادہ دیر تک سیاسی میدان ہموار کرنے میں کوئی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اب سوال یہ تھا کہ کس طرح ملک کی جغرافیائی حدود کو متعین کیا جائے' اس کے لیے وائسرائے نے کانگرس کے لیڈروں کی مدد سے ایک منصوبہ تیار کیا جس کو اس نے 1947ء کو اہونے والی سیاسی لیڈروں کی کانفرنس میں پیش کر دیا۔

یاد رہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے خود جو منصوبہ تیار کیا تھا اس کو اس نے 17 مئی کو اجلاس میں پیش کرنا تھا لیکن کانگرس کی بروقت مداخلت کی بنا پر اس نے یہ میٹنگ 2 جون تک ملتوی کر دی تھی اور ان پندرہ دنوں میں کانگریس کی خواہش کے مطابق ترمیم شدہ مسودے کا منصوبہ تیار کر لیا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کو پٹی پڑھائی تھی کہ پاکستان کی تشکیل کو ناکام بنانے' اس ملک کی انتظامیہ کو نقصان پہنچانے' اس کے وجود کو کمزور کرنے اور تقسیم ملک کی صورت میں پاکستان کے حصے میں آنے والی ضروری چیزوں میں گڑبڑ کرنے اور انہیں ہندوستان میں روکے رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ ہندوستان کو دو ماہ کے اندر تقسیم کر دیا جائے اور پاکستان کو انتظامی امور حوالے کر دیئے جائیں۔ وسائل زندگی کی کمی' ذرائع آمدنی کے فقدان فوج کی عدم موجودگی اور سول سروس کے ناپید ہو جانے سے یہ ملک زیادہ دیر تک سانس نہیں لے سکے گا اور بہت جلد دم توڑ دے گا۔ اس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان خود بخود متحد ہو کر اکھنڈ بھارت کی صورت اختیار کر لے گا۔

ماؤنٹ بیٹن کو ہندوستان میں قدم رکھتے وقت اس امر کا احساس تھا کہ وہ برطانوی حکومت کی طرف سے اس برصغیر کے آخری حکمران ہیں لیکن دلی طور پر ان کو ہندوستان پر اور زیادہ دیر تک حکومت کرنے کی آرزو تھی۔ اس آرزو کا ظہار اس نے ایک دفعہ پنڈت نہرو کے سامنے ان الفاظ میں کیا۔

"مسٹر نہرو! میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے وہ آخری وائسرائے نہ سمجھیں جو برطانوی راج کو ختم کرنے آیا ہے۔ بلکہ وہ پہلا وائسرائے سمجھیں جو نئے ہندوستان کو راستہ دکھانے آیا ہے"۔

ان الفاظ سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ نئے ہندوستان میں بھی گورنر جنرل بنا چاہتے ہیں۔ پنڈت نہرو وائسرے کے اس اشارے کو سمجھ گئے اور اسی وقت وائسرائے سے وعدہ کیا کہ وہ انہیں نئے ہندوستان کا سربراہ تسلیم کرتے ہیں چنانچہ نئے ہندوستان کا سربراہ بننے کی رشوت ماؤنٹ بیٹن کے لئے اس رشوت کے علاوہ تھی جسے دینے کا وعدہ مسٹر پٹیل' مسٹر کرشنا مینن اور اندرا نہرو نے اس سے کیا تھا۔

2 جون 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن نے جو اجلاس طلب کیا' اس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح اور خان لیاقت علی خان نے شرکت کی اور کانگرس کی طرف سے پنڈت نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل شامل ہوئے دوسری اقلیتوں کی نمائندگی کرنے کے لئے سردار بلدیو سنگھ اجلاس میں شرکت کے لیے آئے۔

ان پانچ نمائندوں میں سے چار مرکزی وزارت کابینہ کے رکن تھے اور صرف قائداعظم کابینہ سے باہر تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے ایک طویل تقریر کی جس میں اس نے اپنے ماضی کے تجربات اور تقسیم ہند کے فیصلے کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

اس طویل تقریر کے بعد اس نے تمام موجود ارکان سے منصوبے کے اطلاق کے لیے اظہار رائے طلب کیا۔ کانگریسی لیڈروں نے تو اس کو تالیوں کی گونج میں منظور کیا جبکہ قائداعظم نے نہایت سنجیدگی اور تاسف سے اس کو قبول کیا' قائداعظم کو اس وقت کیا معلوم تھا کہ جس علاقے کا تعین پاکستان کی تشکیل کے لیے کیا گیا ہے' اس کے بارے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی لیڈروں کی نیت خراب ہے اور خود ساختہ اصولوں کی قینچی سے اس پاک سرزمین کے بہت سے حصے کو مزید کاٹ لیا جائے گا۔

تاہم 2 جون کو اس اجلاس میں منظوری حاصل ہو جانے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے خواہش ظاہر کی کہ تمام لیڈر اپنے اپنے نظریات کو اسی فیصلے کی روشنی میں بذات خود نشری طریقے سے واضح کریں۔

چنانچہ 3 جون 1947ء کی شام کو سب سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے آل انڈیا ریڈیو سے ملک تقسیم کر دینے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ یہ تقسیم جون 1948ء کی بجائے اسی سال کر دی جائے گی اور دونئی حکومتوں کی تشکیل تقریباً ڈھائی ماہ تک کر دی جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ اس کمیشن کی طرف سے دیئے گئے ایوارڈ میں واقعی وہی خطوط وحدود ہوں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ اس میں کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل کا امکان ہے تاہم یہ فیصلہ کمیشن کارروائی کے بعد منظر عام پر آئے گا۔

وائسرائے کے ان الفاظ میں بدنیتی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ تاہم اس وقت اس پر تنقید کرنا قبل از وقت بات تھی۔ اس لیے تمام نمائندگان مسلم لیگ خاموش رہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا:

"اعلان میں ایک طرف اس کا امکان ہے کہ بعض علاقے ہندوستان سے الگ ہو جائیں گے اور دوسری طرف کامل آزادی کی راہ میں بہت بڑی ترقی ہے"۔

قائداعظم نے فرمایا:

"جو وزنی اور مشکل کام ہمیں انجام دینا ہے اس کی کوئی مثال دنیا میں نہیں ملتی خصوصاً ہندوستانی لیڈروں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں' اس لیے ہمیں چاہیئے کہ اپنی تمام قوتیں اس بات پر مرکوز کر دیں کہ انتقال اقتدار پر امن طریقے سے اور ترتیب سے عمل میں آئے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ چند اہم معاملات میں یہ منصوبہ ہمارے نکتہ نظر کے مطابق نہیں ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے اور نہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس منصوبے میں جس طرح بعض معاملات طے کئے گئے ہیں' اس سے ہم مطمئن ہیں یا نہیں اس پر ہمیں ابھی غور کرنا چاہیئے۔

ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا یہ منصوبہ جس طرح کہ ملک معظم کی حکومت نے پیش کیا ہے' ہم سمجھوتے کے طور پر قبول کریں یا فیصلے کے طور پر۔ میں اس معاملے میں یہ نہیں چاہتا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلے سے پہلے جس کا اجلاس 9 جون کو طلب کیا گیا ہے' خود اپنا فیصلہ دے دوں۔ ہمارے دستور' سابقہ مثالوں اور معمول کے مطابق آخری فیصلہ کونسل ہی کر سکتی ہے لیکن جہاں تک میں مجموعی طور پر دہلی میں مسلم لیگ کے حلقوں کے تاثرات کا اندازہ لگا سکا ہوں' وہ امید افزاء ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ آخری فیصلہ کرنے سے قبل اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ منصوبے کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ میں نے صوبہ سرحد کی مسلم لیگ سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی پرامن سول نافرمانی کی تحریک واپس لے کر استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کی کامیابی کے لئے سرگرمی کے ساتھ تنظیم کرے اور وہاں کانگریسی اثر و رسوخ کو یکسر ختم کر دے۔

قانون آزادی ہند (18/جولائی 1947ء)

ہندوستان کی تقسیم کے منصوبے کو جس کا اعلان 3 جون 1947 کو وائسرائے نے آل انڈیا ریڈیو پر کیا اور جس کے بارے میں ہندوستانی لیڈروں نے اپنے اپنے تاثرات اسی روز براڈ کاسٹ کیے ایک مسودہ قانون کی صورت میں 4 جولائی 1947ء کو برطانوی پالیمنٹ میں منظوری کے لئے پیش کر دیا گیا۔ اس میں تجویز کیا گیا کہ ہندوستان کی تقسیم 15 اگست 1947ء سے عمل میں آجانی چاہیئے۔ اس برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونئی سلطنتیں قائم کی جائیں جن میں ایک کا نام "ہندوستان" (بھارت) اور دوسرے کا "پاکستان" رکھا گیا۔ ان دونوں نئی مملکتوں کو اپنی اپنی آئین ساز اسمبلی بنانے کا اختیار ہوگا اور وہ اپنی ضرورت کے مطابق آئین مرتب کریں گی۔ ریاستوں کے بارے میں واضح کیا گیا کہ وہ برطانوی تسلط سے آزاد ہیں۔ ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ان دونوں میں سے جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر لیں۔ دونوں ملکوں میں نیا آئین نافذ ہونے تک گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء نافذ رہے گا۔ چودہ دن کی بحث کے بعد آخر کار 18 جولائی 1947ء کو کوئی بل قانون کی صورت میں منظور کر لیا گیا۔ اس قانون کی رو سے پاکستان 14 اگست 1947ء کو وجود میں آنا قرار پایا۔

اس قانون کی رو سے وائسرائے کو اختیار دیا گیا کہ وہ انتقال اقتدار کی رسوم حکومت برطانیہ کی جانب سے سرانجام دیں۔

چودہ اگست ہی کیوں؟

جب بھی اگست کا مہینہ آتا ہے' آزادی کی تحریک کی یادیں' جو دل کے نہاں خانے میں چپ چاپ پڑی سوئی رہتی ہیں' لفظ اگست کی انگیخت سے پوری توانائی کے ساتھ جاگ جاتی ہیں' اور اُن کا بس چلے یا اُن یادوں کو مجبوریوں کے غار سے نکلنے کی آزادی دے دی جائے تو کسی جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑیں۔

اگست کی نسبت سے ہر شخص کے شعور یا لاشعور میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان 14 اگست ہی کو کیوں بنا؟ 13 یا 15 کو کیوں نہیں؟ پھر یہ کہ جب پورے ہندوستان کی آزادی کی اجتماعی تحریک چل رہی تھی تو ایسا کیوں ہوا کہ تقسیم ملک کی رضامندی کے بعد دونوں ملک ایک ساتھ کیوں آزاد نہیں ہوئے؟ ایسا کیوں ہوا کہ ایک 14 اگست کو آزاد ہوا اور دوسرا چوبیس گھنٹے کے بعد 15 اگست کو؟

1947ء: یوم آزادی سے صرف پانچ ماہ پیشتر' کانگرس کی خفیہ خط و کتابت اور مطالبے کے نتیجے میں وائسرائے لارڈ ویول کو واپس برطانیہ بلایا جاچکا ہے۔

یہ عجیب و غریب اور نازک سوالات ہیں جن کے جواب تاریخ میں ضرور موجود ہونے چاہئیں۔

مختلف قوموں اور ملکوں کو اپنی اپنی آزادی اور حریت کے اظہار کے لیے خاص خاص دن ملے ہیں۔ امریکہ کو 4 جولائی' الجزائر کو 3 جولائی' ترکی کو یکم نومبر' چین کو 10 اکتوبر۔ ہر ایک کے قومی دن کے پیچھے جدوجہد کا ایک پورا تاریخی سلسلہ ہوتا ہے جو اس خاص دن کو نقطۂ عروج پر پہنچ کر منزل مراد بن جاتا ہے۔ ہر قومی دن اُس کی جھولی میں خود بخود نہیں گرا' تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ اسے حاصل کرنے کے لیے زبردست اور طویل کوششیں کرنی پڑی ہیں اور تاریخ ہمارے لیے اندھی' گونگی اور بہری نہیں ہے۔

تاریخ نے حقائق پر سے پردہ ہٹانا شروع کر دیا ہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ 14 اگست ایک ایسی تاریخ ہے جو سازش اور بدی کے ایک عجیب و غریب سیاسی ڈرامے نے ہم پر ایک تہمت بنا کر زبردستی ٹھونسنا چاہی تھی' لیکن ہم نے اپنے خلوص نیت سے اُسے اپنے لئے نعمت خداوندی میں تبدیل کر لیا۔ یہ سیاسی ڈراما جس کا تعلق کروڑوں نفوس اور ان کی آنے والی نسلوں کی تقدیر سے وابستہ تھا' اپنی تصنیف سے لے کر تکمیل تک حیرت انگیز عجلت اور جلد بازی سے کھیلا گیا۔ پانچ ماہ کی مختصر مدت کے اندر اندر سازش' بدی' شرارت' تخویف' سازباز' ڈپلومیسی' مذاکرات اور سیاسی چال بازی نے انتہائی تیز ڈرامائی عمل سے حق' صداقت اور انصاف جیسی معصوم چیزوں کو چاروں طرف سے گھیر لینے کی زبردست کوشش کی' لیکن عین نقطۂ عروج پر پہنچ کر۔۔۔۔ نقطۂ عروج کی بات تو بعد میں آئے گی' پہلے تو پے بہ پے مناظر کی تیز رفتار حرکت دیکھنے کے قابل ہے۔

پہلا منظر۔ 22 مارچ 1947ء' یوم آزادی سے صرف پانچ ماہ پیشتر۔ کانگرس کی خفیہ خط و کتابت اور مطالبے کے نتیجے میں ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ویول معزول ہو چکا ہے۔ اُسے واپس برطانیہ بلایا جاچکا ہے۔ آج 22 مارچ کو امیرالبحر ماؤنٹ بیٹن برعظیم کے وائسرائے کے عہدے کے حلف اٹھاتا ہے۔ سابقہ دستور کے خلاف اس رسم کے موقع پر ایک تقریر کرتا ہے' اور اپنی تقریر کے ہر لفظ' اپنی ہر ادا' ہر حرکت' چہرے اور ہاتھوں کی جنبش سے یہ جتاتا ہے' گویا بڑی جلدی میں ہے۔ سب کچھ جلدی جلدی ہو جانا چاہیے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے تہیہ کر لیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جون 1947ء تک اختیار و اقتدار منتقل کر دیا جائے گا۔

ماؤنٹ بیٹن نے پھر یہاں کے لیڈروں سے ملنا شروع کیا۔ دیکھیے' قدم کتنی زیرکی اور ہوشیاری سے اٹھاتا ہے۔ پہلے نواب بھوپال اور مہاراجہ بیکانیر سے ملتا ہے جو بڑی ریاستوں کے والی تھے۔ پھر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملتا ہے۔ اتنے بڑے برعظیم کا اتنا بڑا وائسرائے کتنا چھوٹا تھا کہ چھوٹتے ہی پنڈت جی سے تنہائی میں پہلا سوال یہ پوچھتا ہے: آپ کا مسٹر جناح کے متعلق کیا خیال ہے؟

کیا اُس کے اس طرح غیر موجود شخصیت کے بارے میں سوال کرنے سے بدی' بزدلی اور بداخلاقی کی بو نہیں آتی؟

جواب دینے والا بھی اپنا مکالمہ' تاریخ کی اسٹیج پر یوں ادا کرتا ہے۔ مسٹر جناح ایسے شخص ہیں' جن کو کامیابی زندگی میں بڑی تاخیر سے نصیب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے وہ ہندوستانی سیاست میں کوئی بڑے شخص نہ تھے۔ وہ کامیاب وکیل تھے' مگر خصوصیت کے ساتھ کوئی بہت اچھے نہیں

کیا دنیا کی کسی قوم یا ملک کا کوئی رہنما اپنے غیر موجود حریف کے بارے میں ایسی رائے ایسی بے باکی سے ظاہر کر سکتا ہے؟ کیا عرف عام میں اسی کو خبث باطن نہیں کہا جاتا؟

بہرحال پنڈت نہرو وہاں سے اٹھے تو ان کی رومان پسند طبیعت پر اُن نظروں کا جادو چل چکا تھا' جن کے متعلق ایک مشہور خاتون صحافی نے لکھا ہے! لیڈی ماؤنٹ بیٹن آندھی اور طوفان کی طرح ہندوستان پہنچیں اور پہلی ہی نظر میں نہرو کو اپنے گرداب میں پھانس لیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ''جواہر لال' لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بہت زیادہ متاثر ہوئے' اس سے کہیں زیادہ اثرات لیڈی ماؤنٹ بیٹن نے اُن کے قلب و ذہن پر چھوڑے۔ وہ نہ صرف غیر معمولی ذہین اور عقل مند ہیں' بلکہ انتہائی محبوبیت اور دلکشی بھی رکھتی ہیں۔۔۔۔''۔

یاد رہے کہ یہ نسوانی اور دلکش و محبوب گہری نظریں' آنے والے تمام مناظر میں برابر اپنا کردار ادا کرتی رہیں گی۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد یکم اپریل کو ماؤنٹ بیٹن بالآخر بڑے گرو جی سے طویل ملاقات کرتا ہے۔ گاندھی جی نے اس ملاقات میں اپنی روایتی فراخ دلی کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے' یہ حیرت انگیز تجویز پیش کی کہ موجودہ کابینہ کو برخاست کر دیا جائے اور مسٹر جناح کو دعوت دی جائے کہ وہ ایسی حکومت قائم کریں' جس میں تمام ارکان مسلمان ہوں۔

گاندھی جی نے اپنے چہرے پر یہی فراخ دلی کا نقاب لگائے' دو روز بعد 3 جو اپریل کو ایک اخباری بیان دیا کہ مسٹر جناح کو سارے ہندوستان کا وزیراعظم بنا دیا جائے۔

دو روز بعد 5 اپریل کو ماؤنٹ بیٹن کا آمنا سامنا پہلی مرتبہ ہمارے قائداعظم سے ہوتا ہے۔ وہ گفتگو کا آغاز اپنی خاص تمکنت سے کرتے ہیں ''دیکھئے میں صرف ایک شرط پر گفتگو شروع کروں گا''۔

برطانوی امیرالبحر نے یہ اصول بھرا لہجہ' یہ انداز تکلم اس سے پہلے کا ہے کو سنا تھا۔ اس کی کشتی ایک لمحے کے لیے ڈانواں ڈول ہو جاتی ہے' لیکن آزمودہ کار تھا' سنبھل جاتا ہے اور باتوں باتوں میں بڑے وثوق سے یقین دلاتا ہے کہ جون 1947ء تک ہم بہرحال اختیارات منتقل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ 5 اپریل سے 28 اپریل تک ان تئیس دنوں میں اندرون خانہ جو کچھ ہوتا رہا' اس کا پہلا حاصل کانگرس کا یہ نیا اور علی الاعلان مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبے ضرور تقسیم کئے جائیں۔ یہ مطالبہ ایک طرف تو 28 اپریل کو اخبارات میں چھپوایا گیا اور دوسری طرف اُسی دن راجندر پرشاد نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت میں داغ دیا۔

ماؤنٹ بیٹن کی سادگی بلکہ تجاہل عارفانہ کہیے' دیکھنے کے لائق ہے۔ اُس نے دو روز بعد یکم مئی کو اس یقین کا اظہار کیا کہ مسلمان اور ہندو دونوں تقسیم ہی چاہتے ہیں اور ہندوستان کے مسئلے کا حل سوائے تقسیم کے اور کوئی نہیں۔

چنانچہ اس نے اگلے روز 2 مئی کو اسی بنیاد پر ایک منصوبہ مرتب کر کے اپنے نائبین' لارڈ اسمے اور جارج ایبل کے ہاتھ انگلستان بھیجا اور حکومت برطانیہ سے بہ اصرار درخواست کی کہ زیادہ سے زیادہ 10 مئی تک وہ اپنی منظوری بھیج دے۔

یعنی آٹھ دن کے اندر اندر ہندوستان کی تقدیر کا فوری فیصلہ مانگا گیا۔ انتظار کے یہ آٹھ دن آرام و راحت سے گزارنے کے لیے وہ شملہ چلا گیا۔ پیچھے پیچھے پنڈت نہرو بھی شملہ پہنچے اور ان کے ہمراہ کرشنا مینن بھی۔ وہاں انھوں نے قیام بھی کیا تو گورنمنٹ ہاؤس میں' جہاں وائسرائے کے عملہ خاص کے وہ تمام افراد موجود تھے جو پنڈت جی کے ذاتی دوست' ہم خیال' ہم نوالہ و ہم پیالہ اور خیرخواہ تھے' خواہ وہ انگریز ہوں یا ہندوستانی' اور تو اور ان میں وائسرائے کا معتمد خاص وی پی مینن بھی تھا' جو سردار پٹیل کا بھی معتمد خاص' اور اس نسبت سے پنڈت نہرو کا بھی معتمد خاص تھا۔ وائسرائے کے دستوری مشیر ہونے کے وجہ سے ہر قسم کی خفیہ اور غیر خفیہ دستویزات اور کاغذات اُس کی ذاتی تحویل میں رہتے تھے۔ وہ اس نے کچھ وائسرائے کو بتا کر اور کچھ چھپا کر پنڈت نہرو کو دکھا دیے۔ شملے میں ایک

ہفتے کے قیام کے دوران ماؤنٹ بیٹن، نہرو اور کرشنا مینن کے مابین روزانہ خفیہ اور طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ خوب سوچ سمجھ کر ایک منصوبہ ایک پلان بنا لیا گیا جس کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے وعدہ کر لیا کہ ہاں بالکل ٹھیک ہے اقتدار 31 دسمبر 1947ء تک ہندوستانیوں کو سونپ دیا جائے گا۔

یعنی شملے کے دوران قیام ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو نے باہم ذاتی مشورے سے پورے چھ ماہ گھٹا لیے وی پی مینن سے کہا گیا کہ منصوبے کا مسودہ تیار کرو۔ اعلان جاری کر دیا گیا کہ وائسرائے ہند 17 مئی کو دہلی میں ہندوستان کے تمام لیڈروں سے ملاقات کریں گے۔

13 مئی کو پنڈت نہرو اور کرشنا مینن شملہ چھوڑتے ہیں۔ 14 مئی کو ماؤنٹ بیٹن دہلی واپس آتا ہے۔

15 مئی کو کوئی بھیس بدلا جاتا ہے، جس کی تفصیلات کے بارے میں تاریخ نے ابھی تک خاموشی اختیار کر رکھی ہے مگر اس پراسرار خاموشی کا تعلق 16 مئی والے غیر متوقع منظر سے بہت گہرا معلوم ہوتا ہے۔

16 مئی کی صبح کو ماؤنٹ بیٹن اپنے سیکرٹیری کیمبل جانسن کو بلاتا اور کہتا ہے ''کل جو کانفرنس ہو رہی ہے اُس کے التوا کا اعلان کر دو''۔

کیمبل جانسن نے پوچھا ''حضور! اعلان نامے میں التوا کی وجہ کیا دی جائے؟''

وائسرائے نے اپنے سیکرٹیری کی طرف گھورا اور کہا ''جو مناسب سمجھو بہانہ بنا دو۔ مثلاً یہ کہ لندن میں پارلیمنٹ کے اجلاس کے ملتوی ہو جانے کے باعث یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ہندوستانی لیڈروں اور ہز ایکسی لینسی وائسرائے آف انڈیا کے مابین جو ملاقات 17 مئی ہونے والی تھی، وہ اب 2 جون کو ہوگی''۔

عین 17 مئی والے دن، صبح اخبارات میں ہندوستانی لیڈروں نے یہ خبر پڑھی کہ ملاقات حیرت انگیز طور پر ملتوی ہو گئی ہے۔

17 مئی کو دوپہر کے وقت برطانیہ کے وزیراعظم لارڈ ایٹلی کو، وائسرائے ہند کی طرف سے اس مضمون کا تار ملتا ہے ''جو منصوبہ لارڈ اِسے کے ہاتھ آپ کو برائے منظوری بھیجا گیا تھا، اور جو آپ نے ازراہ کرم منظور کر کے واپس بھیج دیا تھا، وہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ براہ کرم نظر ثانی شدہ نئے منصوبے کا انتظار فرمائیے''۔

اور اُسی روز یعنی 17 مئی ہی کو نظر ثانی شدہ منصوبے کا مسودہ وی پی مینن وائسرائے کو پیش کرتا ہے۔ اس مسودے میں اور کئی منصوبے پنہاں رکھ دیے گئے تھے، جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دونوں مملکتوں کا گورنر جنرل مشترک ہوگا، یعنی ماؤنٹ بیٹن۔

18 مئی کی رات کو وائسرائے ہاؤس کی ضیافت کے دوران لیڈی ماؤنٹ بیٹن، وی پی مینن کے قریب آتی ہے اور اُس کے گال پر گرمجوشی سے مگر ہلکا سا بوسہ دیتے ہوئے (یا لیتے ہوئے) چپکے سے کان میں بتاتی ہے۔ ''انھوں نے آپ کا منصوبہ منظور کر لیا ہے وی پی''۔

اسی رات کو ماؤنٹ بیٹن دوران گفتگو قائداعظم کو اشارۃً بتاتا ہے کہ انتقالِ اقتدار یکم اکتوبر کو ہو جائے گا۔

دیکھا آپ نے آزادی دینے کے لیے ہمارے آقاؤں کو کس قدر بے چینی ہے۔ کیسی سیاسی مکاری سے تاریخ کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک ہفتہ پہلے شملے میں پنڈت نہرو سے 31 دسمبر 1947ء کا وعدہ کر کے چھ ماہ گھٹائے گئے تھے، 18 مئی کو قائداعظم سے یکم اکتوبر کا اشارہ کر کے تین ماہ مزید گھٹا لیے گئے۔ کیسے کیسے خوبصورت اور مشہور چہروں نے کیسی کیسی گھناؤنی نقابیں اوڑھ رکھی تھیں۔

دوسرے ہی دن 18 مئی کو ماؤنٹ بیٹن وی پی مینن کے ہمراہ وہ منصوبہ لے کر لندن جاتا ہے۔ اس منصوبے کی تفصیلات کا علم ماؤنٹ بیٹن، وی پی مینن، پنڈت نہرو اور کرشنا مینن کے سوا کسی پانچویں آدمی کو نہ تھا۔ ماؤنٹ بیٹن اپنی اس کوشش میں ناکام ہوا کہ مسودے پر پنڈت نہرو، سردار پٹیل اور سردار بلدیو سنگھ کی طرح قائداعظم اور لیاقت علی خان کے بھی دستخط حاصل کیے جائیں یا اس منظوری کا خط ہی ان سے حاصل کر لیا جائے۔

ماؤنٹ بیٹن نے دہلی سے لندن تک کا یہ سفر بڑے تیز رفتار ہوائی جہاز میں کیا۔ وہ دونوں چوبیس گھنٹے میں لندن پہنچ گئے۔ مجوزہ پلان حکومت برطانیہ سے منظور کرایا اور 31 مئی کو واپس دہلی آ گئے۔

عجلت بازی کی انتہا ہے کہ صرف دو روز بعد 2 جون کو ہندوستانی لیڈروں کی وہ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ماؤنٹ بیٹن نے اس منصوبے کی نقلیں ہندوستانی لیڈروں کو پہلی بار فراہم کیں۔ انگریزوں نے ہندوستان میں انتقال اقتدار کے لیے یہ آخری منصوبہ پیش کیا، جس کی بنیاد تقسیم پر رکھی گئی تھی اور جس میں صاف صاف اعلان کیا گیا تھا کہ ملک معظم کی حکومت اس کے لیے تیار ہے کہ جون 1947ء تک درجہ نوآبادی کی بنیاد پر ایک یا دو خود مختار مملکتوں کو اختیار اعلیٰ منتقل کر دے۔

غور کرنے والی بات یہ ہے کہ حکومت برطانیہ کا منظور شدہ جو مسودہ 2 جون کو ہندوستانی رہنماؤں کی کانفرنس میں پیش کیا جاتا ہے اور جو دنیا بھر کے اخبارات میں شائع بھی ہوا ہے، اُس میں پھر وہی انتقال اقتدار کی اصلی تاریخ جون 1947ء کا حوالہ بالصراحت موجود ہے۔ یقینی طور پر حکومت برطانیہ نے منصوبے کی دیگر جزئیات جوں کی توں منظور کر لی ہوں تو کر لی ہوں، لیکن 31 دسمبر یا یکم اکتوبر کسی اور تاریخ سے حکومت برطانیہ نے اتفاق نہیں کیا۔ آپ کو یاد آ گیا ہوگا کہ اس کانفرنس میں پنڈت نہرو نے اپنی تلون مزاجی کا شاندار مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا: آل انڈیا کانگرس اس منصوبے کو ہرگز ہرگز منظور نہیں کر سکتی لیکن پھر بھی قبول کر لے گی''۔

پنڈت جی کی اس رائے سے وہ راز ہائے درون پردہ صاف صاف جھانک رہے ہیں جو خفیہ ملاقاتوں میں طے پائے تھے۔ مگر ہمارے قائداعظم نے بھی جس طرح اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق ادا کیا، وہ جمہوریت کی تاریخ کا ایک زریں باب بن چکا ہے۔ آپ نے اُس کانفرنس میں کہا تھا۔ ''میں تنہا اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ مجھے اور مجلس عاملہ دونوں کو قطعی فیصلے سے پہلے اپنے آقاؤں یعنی مسلم لیگ کونسل کے سامنے جانا پڑے گا جو قوم کے نمائندوں پر مشتمل ہے''۔

3 جون کی شام وائسرائے، قائداعظم، پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ ریڈیو پر تقریریں کرتے ہیں۔ تقسیم ہند کی بنیاد پر منظور ہو جانے والے منصوبے کی تفصیلات اپنے اپنے زاویہ نظر اور انداز میں برعظیم میں بسنے والی قوموں اور قومیتوں کو بتاتے اور پرامن رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

اب ڈرامے میں مناسب اور حسب دلخواہ وہ سازشی موڑ پیدا کرنے کے لیے میدان صاف تھا، جس کی ساز باز مئی میں شملے کے گورنمنٹ ہاؤس میں پہلے ہی ہو چکی تھی۔

اگلے روز 4 جون کو ماؤنٹ بیٹن پریس کانفرنس میں ''پہلی مرتبہ'' اپنے اس ارادے کا اعلان کرتا ہے کہ اقتدار اگلے سال جون 1948ء تک منتقل کر دیا جائے گا اور 4 جون کو یہ سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ یعنی حکومت برطانیہ کی اصلی، سرکاری مجوزہ مدت میں مزید عرصہ گھٹا لیا گیا۔ وائسرائے کے اس یکطرفہ اور دیدہ دلیرانہ اعلان سے برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان تو رہے ایک طرف، خود وزیراعظم لارڈ ایٹلی بھی حیران و ششدر رہ گیا۔

خلاصہ یہ کہ چند ماہ پہلے تک جس پاکستان کو دیوانے کا خواب اور مجذوب کی بڑ بتایا جا رہا تھا، اب وہی طشتری میں پیش کیا جا رہا تھا۔ یعنی کہا جا رہا تھا کہ اب لینا چاہتے ہو تو جلدی لو اور فوراً لو ورنہ بھاگ جاؤ، ہم کسی اور کو دے دیں گے۔

وہ زمانے کے ساتھ قیامت کی چال چل رہے

تھے لیکن نہیں جانتے تھے کہ زمانہ اُن کی گھات میں ہے۔ 22 جون کو ''قانون آزادی ہند'' کا مسودہ ماؤنٹ بیٹن کو بذریعہ تار برقی موصول ہوتا ہے۔ اس میں بھی مطلقاً پندرہ اگست کا کوئی ذکر نہ تھا۔

28 جون کو اپنی طرف سے کچھ دیر کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن جوابی تار بھیجتا ہے: میں پریس کانفرنس میں 15 اگست کی تاریخ مقرر کر چکا ہوں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور تاریخ مقرر کی جائے گی تو موجودہ نازک صورت حال میں مخالفانہ اور برانفیاتی اثر پڑے گا''۔

لارڈ ایٹلی نے وائسرائے کی اس خواہش کے سامنے سپر ڈال دی اور مسودہ قانون میں 15 اگست کی تاریخ درج کر دی 4 جولائی کو مسودہ قانون برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوا۔ 15 جولائی کو دارلعوام نے اس کی منظوری دی اور 18 جولائی کو شاہ انگلستان کی مہر تصدیق ثبوت ہوئی۔

اب اس ڈرامے کا آخری منظر شروع ہوتا ہے۔ پندرہ اگست قریب آ رہی ہے۔ قانون کے تحت مقررہ تاریخ پندرہ اگست ہے۔ پندرہ اگست ہی کو انتقال اختیار ہوگا۔ پندرہ اگست ہی کو انتقال اختیار کی رسوم ادا ہوگی جن کا لائحہ عمل ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے تمام رہنماؤں کو بھیجتا ہے۔ یہ لائحہ عمل قائداعظم کے پاس بھی پہنچتا ہے۔

عین اُس وقت جب کہ سازش اور بدی کا ڈراما اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ رہا تھا' حق وانصاف کے ترجمان نے ایک ہی جنبش قلم سے ان کے ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ قائداعظم دونوں آزاد اور خود مختار مملکتوں کا ایک ہی گورنر جنرل بنانے کی ناپاک تجویز پہلے مسترد کر چکے تھے۔ انہوں نے اس لائحہ عمل کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور واضح طور پر حکم لکھ دیا کہ پاکستان کو پندرہ اگست سے ایک روز پہلے چودہ اگست کو قائم ہونا ہے' اس لیے وائسرائے کو چاہیے کہ وہ 14 اگست والی اپنی آخری الوداعی تقریر کے لیے کراچی پہنچ جائیں۔ وائسرائے مارے غصے کے 13 اگست ہی کو کراچی پہنچ گیا۔

وہ جو مل جل کر انتقال اقتدار کی اصل مدت کو قدم بہ قدم کم از کم رہے تھے' اُس میں قائداعظم کی بصیرت نے ایک اور قدم کم کر کے پاکستان کے وجود کو انفرادیت عطا کر دی پاکستانی قوم کی منفرد شان وشوکت ہمیشہ کے لیے قائم کر دی اور دنیا سے اپنا یہ اصول تسلیم کرا لیا کہ ''ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا' جب تک کہ پہلے پاکستان نہ بن جائے''

وہ جو ساز باز کے ذریعے جون 1948ء، پھر دسمبر 1947ء پھر اکتوبر 1947ء، پھر اگست 1947ء کی طرف رجعت کر کے مسلمانان ہند پر چڑھائی کر رہے تھے' ان کے نیچے سے سیڑھی کھسکا لی گئی اور اُن کی سازش کا عمارت کا کھوکھلا ڈھانچا دھڑام سے گر پڑا۔ وہ جو پندرہ اگست کو ہم پر زبردستی ٹھونس رہے تھے' ایک ہی دن کی بصیرت افروز تبدیلی نے اُن کے عزائم کو پاش پاش کر دیا۔ احساس حمیت اور خودداری نے ایک نازل ہونے والے عذاب کو نعمت خداوندی میں تبدیل کر دیا۔ افسوس کہ ہمارے سردار شوکت حیات جیسے دوست یہ باریک سی حقیقت نہ سمجھ سکے۔

موٹی موٹی بدیہی حقیقتیں بڑی تلخ اور سنگین تھیں۔ بقول سید حسن ریاض 15 اگست 1947ء کی تاریخ حقیقت میں مسلم لیگ کے لیے بڑی وحشت ناک تھی اور کانگرس کے لیے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔ عبوری حکومت قائم' جس میں ہندوؤں کی اکثریت نے دہلی سے کہیں جانا نہیں۔ مرکزی حکومت کے تمام دفاتر انتظام کے ساتھ وہیں موجود۔ اس تمام ملک کے اندر جو ہندوؤں کے حصے میں آ رہا تھا' امن وانتظام قائم اور کانگرس کی حکومتیں برسر اقتدار۔ تمام چھاؤنیوں میں فوجیں کیل کانٹے سے لیس' فضائی اور بحری بیڑے برطانوی دستوں کی کمان میں مرتب اور وزیر دفاع سکھ۔

مسلم لیگ کے لیے یہ دشواری کہ تمام مغربی پاکستان کے علاقے میں بدامنی' کسی صوبے کی حکومت اس کے اختیار میں نہیں۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم درپیش۔ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں استصواب رائے ہونا' مرکزی حکومت کہیں موجود نہیں اور اس کا کوئی سامان بھی نہیں۔ افواج اور دیگر اثاثوں کی منصفانہ تقسیم کا مرحلہ ابھی باقی۔

قائداعظم' لیاقت علی خان' سردار عبدالرب نشتر اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں نے مختلف مرحلوں اور مختلف وقتوں میں امیرالبحر ماؤنٹ بیٹن سے التجائیں کیں کہ 3 جون سے 15 اگست تک کا وقت اتنی بھاری ذمے داریوں کی منتقلی وتبدیلی اور انتظام کے لیے انتہائی کم ہے۔ انتقال اختیار کے لیے جون 1948ء کی تاریخ قائم رکھیں۔ اس کو پندرہ اگست 1947ء میں تبدیل کرنا تباہی کا موجب ہوگا۔ مگر امیرالبحر کا ایک ہی جواب ہوتا تھا ''سوری منصوبے کا ایک ضروری اور ناگزیر نکتہ یہ ہے کہ انتقال اختیار 15 اگست ہی کو ہوگا۔ اس میں کوئی تبدیلی کسی صورت ممکن نہیں''۔

قائداعظم نے کہا' اچھا یہ بات ہے تو پھر 14 اگست کو کراچی پہنچ جاؤ اپنی آخری الوداعی تقریر کے لیے!

بدی کی طاقتوں نے مل جل کر منصوبہ بنا لیا تھا اور اس کے لیے باقاعدہ کوششیں کی تھیں کہ پاکستان کے مطالبے کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ پاکستان جلد' بہت جلد اور جتنا جلد جتنا ممکن ہو بنا دیا جائے۔ وہ جتنی جلد بنے گا' اتنا ہی کمزور اور ناپختہ ہوگا اور اتنی ہی جلد اپنی موت مر جائے گا۔

لیکن منصوبہ ساز یہ بات بھول گئے کہ نہ صرف برعظیم بلکہ پورے کرہ ارض میں بسنے والے بنی نوع انسان کا صدر نشیں اور مقتدر اعلیٰ وہ اللہ کی ذات ہے جو ہمیشہ اُن کا ساتھ دیتی ہے جو حق وانصاف کا ساتھ دیتے ہیں۔ اللہ نہیں چاہتا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن، وی پی مینن، پنڈت نہرو اور کرشنا مینن اپنی خفیہ ملاقاتوں میں مسلمانان ہند کے قدرتی ملی' آئینی' سیاسی' مذہبی' تمدنی اور معاشی حقوق غصب کرنے کی جو سازش کر رہے ہیں' وہ کامیاب ہو۔ پندرہ اگست جو ہم پر ہمیں تباہ وبرباد کرنے کے لیے ٹھونسی گئی تھی' چودہ اگست میں منقلب ہو کر ہمارے لیے ہمیشہ کے لیے یوم آزادی اور جشن استقلال بن چکی ہے اور زیادہ شان شوکت اور جاہ وجلال کے ساتھ منائی جائے گی۔ انشاءاللہ۔

ماؤنٹ بیٹن کے عزائم

یہاں آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے عزائم کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

(1) ابتدا ہی سے اس نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ انڈین آرمی کو دو حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے' بلکہ دونوں ملکوں کی دفاعی ضروریات کو ایک ہی فوج پورا کرے۔ یہ تجویز سیاست کے کسی مسلمہ اصول سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ قائداعظم نے اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ فوج کا مکمل کنٹرول کسی مملکت کے اقتدار اعلیٰ کی پہلی اور لازمی شرط ہے۔ جو حکومت اپنی فوج پر پورا پورا قابو نہیں رکھتی' وہ آزاد کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔

اگر ماؤنٹ بیٹن اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو پاکستان کی آزادی بے معنی اور بے حقیقت بن کر رہ جاتی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان فوجوں اور اسلحے کی تقسیم کار کا کام سابق کمانڈر انچیف کلاڈ آکن لیک کے ذمے لگایا گیا تھا۔ اُس کی ''مدد'' کرنے والے ہندوستان کے نمائندوں نے اس کام میں ہر قدم پر ایسے روڑے اٹکائے کہ آکن لیک کو یہ کہنا پڑا کہ ہندوستان ہرگز نہیں چاہتا کہ پاکستان وجود میں آئے' لیکن آکن لیک نے تمام مشکلوں پر عبور پا کر اپنا کام وقت مقررہ کے اندر ختم کر دیا۔

اس پر کانگریس کے لیڈر بہت برہم ہوئے۔ سردار پٹیل کی تو یہ توقع کہ پاکستان کو بننے دیا جائے' لیکن اس کے پاس اپنی کوئی فوج نہ ہو' پوری نہ ہوئی۔ اس لئے ہندو پریس

نے آکن لیک کے خلاف اتہام تراشی کی مہم شروع کردی اور اس کو طعنے کے طور پر پاکستانی کہنا شروع کردیا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہندو اخبارات نے یہ سارا شور وغوغا ماؤنٹ بیٹن کے ایماء ہی پر کیا تھا۔

(2) ماؤنٹ بیٹن کی دوسری بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ خود ہی دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بن جائے۔ اس نے جس ڈھٹائی اور بے اصولی سے کانگریس اور ہندوؤں کے مطالبات کی تائید کی تھی' اُس کے صلے میں حصولِ آزادی کے بعد اسے ہندوستان کی گورنر جنرلی پیش کردی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ یہ بھی چاہنے لگا کہ پاکستان کی طرف سے بھی یہی انعام اس کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔ اس کی یہ توقع بے جا اور بے معنی تھی۔ دولت مشترکہ کی ساری تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ دو ملکوں کی سربراہی کے فرائض بہ یک وقت ایک ہی شخص کو سونپے گئے ہوں۔ اس سے ماؤنٹ بیٹن اپنی دستار میں ایک اور کلغی لگانا چاہتا تھا۔

اگر اس کی خواہشات کا احترام کیا جاتا تو ایک خطرناک صورت حال پیدا ہوجاتی۔ بیرونی دنیا' ہندوستان اور پاکستان کو ملا کر ایک ہی ملک سمجھتی اور پاکستان کی آزادی کی علامتی اہمیت بھی نہ رہتی۔ ایک اسلامی مملکت کی سربراہی کے لئے ایک غیر مسلم کا انتخاب بھی کسی حیثیت سے موزوں نہ ہوتا۔ چونکہ ماؤنٹ بیٹن تقسیم ملک کا بے حد مخالف بلکہ دشمن تھا' اس لئے دونوں ملکوں کی سربراہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اکھنڈ بھارت کے لئے راستہ ہموار کردیتا۔ ان دونوں کے علاوہ اگر وہ ایسا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو اس کی اپنی پوزیشن کیا ہوتی' کیونکہ بہت سے اہم معاملات میں اسے دونوں ملکوں کی حکومتوں کی طرف سے متضاد مشورے ملتے اور ماؤنٹ بیٹن یا اس کی جگہ کوئی اور شخص اس قسم کے دوہرے اعزاز کو نبھانے کی لیاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتا تھا' وہ شاہی خاندان کا فرد تھا اور اس کی عقل پر حکمرانی کی ہوس غالب تھی۔

قائداعظم دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ وائسرائے نے مئی 1947ء میں انگلستان جانے سے پہلے ہی سلسلۂ جنبانی شروع کردی تھی۔ جتنے دن وہ لندن میں ٹھہرا' ہر روز اپنی درخواست کی منظوری کا انتظار کرتا رہا۔ واپس آیا تو بعض اہم معاملات سے نمٹنے کے بعد پورے جوش وخروش سے دوبارہ اسی مسئلے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے پریس سیکرٹری کیمبل جانسن کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشیروں کی روزانہ مجلس میں تواتر کے ساتھ اس کا ذکر کیا کرتا تھا اور قائداعظم کی خاموشی کو اپنا شان میں گستاخی قرار دیتا تھا۔ آخر کار اُس نے خود ہی براہِ راست قائداعظم کے ساتھ اس مسئلے پر گفتگو کا آغاز کیا' اور انہیں بتایا کہ میرے دل میں اپنی ہوس کو پورا کرنے یا اپنی اہمیت اور شان وشوکت بڑھانے کا کوئی خیال نہیں۔ یہ بات خود پاکستان کے مفاد میں ہوگی کہ اس مملکت کی گورنر جنرلی بھی مجھے پیش کردی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو حکومت پاکستان کے لئے اثاثوں کا جائز حصہ حاصل کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ یہ ایک کھلی دھمکی تھی جس کو بعد میں ماؤنٹ بیٹن نے پورا کر کے بھی دکھایا۔

لیکن قائداعظم نے اس کو یہی جواب دیا کہ یہ اصول کا معاملہ ہے اور جہاں اصول کی بات ہو' وہاں میں صرف ملک اور قوم کے فائدے ہی کو مدنظر رکھا کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اکثر اپنے دوستوں کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اس لئے مجھے اس معاملے میں معذور سمجھا جائے۔ بہرحال میں ''قانون آزادیٔ ہند'' کے مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد ہی اس پر حتمی رائے دے سکتا ہوں۔

چند دن کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو یہ پیغام ملا کہ قائداعظم خود ہی پاکستان کے گورنر جنرل ہوں گے۔

آزادی کا پہلا تقاضا یہی تھا کہ پاکستان اپنے سربراہ مملکت کا انتخاب خود کرے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہر طرف سے دباؤ ڈالا کہ انتخاب کا قرعہ اس کی مرضی کے مطابق اُس کے نام پر نکلے۔ جب یہ نہ ہوسکا تو وہ پاکستان کے لئے مجسم انتقام بن گیا۔ پاکستان کے مفاد پر گہری ضربیں لگتی رہیں۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ دہلی میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی۔ پاکستان کو اپنے اثاثوں سے محروم کردیا گیا۔ مشترکہ خزانے میں سے پاکستان کے حصے کا روپیہ روک دیا گیا۔ سرکاری عملہ اور ریکارڈ لے کر جو گاڑیاں کراچی جارہی تھیں ان پر پے در پے حملے کئے گئے۔ ماؤنٹ بیٹن خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا اور شاید اپنی انا کی تسکین کرتا رہا۔ قانون آزادیٔ ہند 1947ء میں ایک شق اس مضمون کی بھی رکھی گئی تھی کہ اگر دونوں مملکتیں چاہیں تو وہ مشترکہ گورنر جنرل بھی مقرر کرسکتی ہیں۔ جب یہ شق دھری کی دھری رہ گئی تو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے قائداعظم کو ہدف تنقید بنایا۔

(3) دونوں ملکوں کی حد بندی کا مسئلہ بھی پیچیدہ تھا۔ تمام پارٹیوں نے اس اصول کو منظور کرلیا تھا کہ مسلم اکثریت کی آبادی کے متصل علاقوں کو ملا کر پاکستان کی مملکت قائم ہوگی۔ یہ ایک واضح اصول تھا اور اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ تھا' لیکن 3 جون کے ریڈیائی بیان میں ماؤنٹ بیٹن نے ایک گرہ یہ لگا دی تھی کہ حد بندی کرنے میں تسلیم شدہ بنیاد کے علاوہ ''دوسرے عوامل'' (Other Factors) کو بھی مدنظر رکھا جائے گا۔ یہ دوسرے عوامل کیا تھے' نشری بیان میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ اس دو لفظی محاورے کو بہت سے معانی پہنائے جاسکتے ہیں۔ اس وقت کسی منصف مزاج شخص کو اس بات کا وہم وگمان تک بھی نہ تھا کہ اکثریت کے ٹھوس اصول کو نظر انداز کر کے اور محض ''دوسرے عوامل'' کا سہارا لیتے ہوئے غالب مسلم اکثریت کے بعض علاقوں کو ہندوستان کے حوالے کردیا جائے گا۔

قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ حد بندی کے لئے اقوام متحدہ سے رجوع کیا جائے۔ پنڈت نہرو نے مخالفت کی' کیونکہ اُس وقت تک اقوام متحدہ کی غیر جانبداری کا بھرم کچھ نہ کچھ قائم تھا اور کانگریس والے کسی غیر جانب دار فریق کو اس معاملے میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ اس پر قائداعظم نے یہ مشورہ دیا کہ دوسری صورت میں یہ معاملہ برطانیہ کی پریوی کونسل کے سپرد کیا جاسکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس بات کو بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ اس طرح یہ تصفیہ طلب معاملہ برطانوی حکومت کو لوٹ آیا جو قیام پاکستان کی مخالف اور کانگریس کی طرف دار تھی۔ طے ہوا کہ ''حد بندی کے ایک نہیں' بلکہ دو کمیشن مقرر کئے جائیں۔ ہر کمیشن کے چار چار ممبر ہوں۔ ان میں سے دو دو کا انتخاب کانگریس کرے اور دو دو کا انتخاب لیگ کرے' اور دونوں کمیشنوں کا مشترکہ صدر ہو''۔ صدارت کے لئے برطانوی حکومت نے ریڈکلف کا نام پیش کیا' جسے قائداعظم نے منظور کرلیا۔

ریڈکلف ایوارڈ (17 اگست 1947ء)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی 2 جون کے لیڈروں کی میٹنگ میں اشارہ کردیا تھا کہ جو سرحدیں پاکستان کے لئے تجویز کی جارہی ہیں ان میں ردوبدل کا امکان ہے اور اس مقصد کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے تاہم تقسیم ہند کیلئے ایک اصول بھی معین کیا گیا تھا۔ اس اصول کے مطابق مسلم اکثریت والے صوبے اور دوسرے مسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان کا جز و بنایا جانا تھا۔ اور اسی اصول کے تحت 3 جون کو ریڈیائی تقریر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو جغرافیائی حدود بیان کی تھیں' ان میں مکمل آسام کے علاوہ پنجاب کے ضلع گورداسپور کو بھی مغربی پنجاب کا جزو قرار دیا گیا تھا۔

تاہم مستقل بین الاقوامی سرحدوں کا تعین کرنے کے لئے برطانوی حکومت کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس میں دو نمائندے پاکستان کی طرف سے اور دو

ہندوستان کی طرف سے لئے گئے۔ اس کمیشن کی سربراہی ایک انگریز جج مسٹر سیرل ریڈکلف کے سپرد کی گئی اور اس کے فیصلے کو آخری فیصلہ قرار دیا جانا تھا۔ مغربی سرحدوں کے تعین کے لئے کمیشن حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔

1۔ مسٹر سیرل ریڈکلف چیئرمین (برطانیہ)
2۔ مسٹر جسٹس دین محمد رکن (پاکستان)
3۔ مسٹر جسٹس محمد منیر رکن (پاکستان)
4۔ مسٹر جسٹس مہر چند مہاجن رکن (ہندوستان)
5۔ مسٹر جسٹس تیجا سنگھ رکن (ہندوستان)

پنجاب سرحدی کمیشن میں سکھ نمائندے سردار بلدیو سنگھ کو بھی شامل کرلیا گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ریڈکلف کو بین الاقوامی سرحدوں کے جغرافیائی تعین کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اور ان کے فیصلے کو آخری فیصلہ تصور کیا جاتا تھا۔ مسلم لیگی اور کانگریسی ارکان محض امدادی ارکان تھے' ناطق فیصلہ ریڈکلف کا ہونا تھا۔

ریڈکلف 8 جولائی 1947ء کو دہلی پہنچا اور آتے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ ریڈکلف زندگی میں پہلی مرتبہ ہندوستان آیا تھا اور ہندوستانی تنازعے سے صرف دستاویزی حد تک واقف تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے آتے ہی کان بھرنا شروع کر دیئے اور اس کو سرگوشی کرتے ہوئے بتادیا کہ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان میں کرتو چکا ہوں اور کانگریس نے انگریزی حکام کی برتری کو قبول کرتے ہوئے اپنا پہلا گورنر جنرل بھی مجھے ہی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے' اس لئے ہمارے نزدیک پاکستان کی نسبت ہندوستان کے مفادات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

آبادی کے لحاظ سے میں نے پنجاب کی سرحدوں کی نشاندہی کر دی ہے لیکن بدقسمتی سے مجھے بعد میں کانگریسی رہنماؤں نے بتایا کہ جب تمام ریاستوں کو خودمختاری حاصل ہوگی اور اس خودمختاری سے انہیں اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ جس ملک سے چاہیں الحاق کرلیں' تو ہمارے لئے سب سے بڑا مسئلہ' ہندوستان کی عظیم ریاست کشمیر کے الحاق کا مسئلہ مشکل کا باعث بن جائے گا کیونکہ موجودہ صورت میں کشمیر ہندوستان سے بالکل کٹ کر پورے کا پورا پاکستان کے ساتھ جغرافیائی الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے کچھ ایسی سرحدوں کا تعین ہونا چاہئے جس سے ہندوستان کی براہ راست رسائی کشمیر تک ہو جائے۔ جہاں تک اس کے الحاق کرنے کا تعلق ہے۔ اس کے لئے بھارت بعد میں راہ ہموار کرلے گا۔

اس کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات بھی زور دار الفاظ میں کہی کہ ہندوستان والوں کو پہلے سے بتادیا گیا ہے کہ 3 جون کی نشری تقریر میں بتائی گئی سرحدوں میں تغیر و تبدل کا امکان ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے پاکستانی سرحدوں کو زیادہ سے زیادہ غطر بود کرنا چاہئے۔ ریڈکلف نے ماؤنٹ بیٹن کے ان الفاظ کو دل و دماغ میں بٹھالیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کی طرف سے دی جانے والی بے مثال رشوت کی جھلک بھی دے دی جس میں نقد رقم کے علاوہ بے شمار ہیرے جواہرات اور دیگر سودمند اشیاء شامل تھیں۔ اس طرح برطانیہ کا ایک نمائندہ منصب انصاف کے تقاضوں کو رشوت و جانبداری کے پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا اور اس نے حتی المقدور ایسا کر بھی دیا۔

مشرقی سرحد کے تعین کے لئے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے حسب ذیل تھے:

1۔ مسٹر سیرل ریڈکلف چیئرمین (برطانیہ)
2۔ مسٹر ابو صالح محمد اکرم رکن (پاکستان)
3۔ مسٹر ایس اے رحمن رکن (پاکستان)
4۔ مسٹر سی بواس رکن (ہندوستان)
5 مسٹر بی اے مکرجی رکن (ہندوستان)

اس کمیشن نے 22 جولائی کو اپنا کام شروع کر دیا جبکہ وہ تمام حالات کا جائزہ لے چکا تھا۔ ابھی حد بندی کے نزاعی نکات کمیشن کے سامنے بھی نہ آئے تھے کہ ریڈکلف نے جسٹس دین محمد کے ساتھ ہوائی جہاز میں پنجاب کے خاص علاقے یعنی ضلع سرگورداسپور اور ضلع فیروز پور پر پرواز کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس پرواز سے وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جغرافیائی لحاظ سے کس حد تک کشمیر کو ہندوستان سے ملحق کیا جا سکتا تھا اور مغربی پنجاب کو خشک سالی کا شکار کرنے کے لئے کس حد تک ضلع فیروز پور کے آبی راستوں کو ہندوستان کے حوالے کر سکتا تھا۔

ریڈکلف کی اس بدنیتی کو جسٹس دین محمد فوراً بھانپ گئے اور صحت کی خرابی کا بہانہ کر کے ریڈکلف کے ساتھ پرواز کرنے سے معذرت چاہی پھر خود فوراً قائداعظم کے پاس پہنچے اور اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ قائداعظم اگرچہ معاملے کو خوب سمجھتے تھے لیکن ایک قانون دان ہونے کی صورت میں اس شک کو کس طرح مادی صورت میں بیان کر سکتے تھے' اس کا کس طرح اظہار کر سکتے تھے؟ اس لئے انہوں نے جسٹس دین محمد کو خاموش ہی رہنے کی تلقین کی۔

قائداعظم کے اس فیصلے کے سامنے انہوں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور کمیشن کی کارروائی میں شرکت جاری رکھی۔ جسٹس دین محمد کی غیر حاضری میں ریڈکلف نے جسٹس محمد منیر کو پرواز کے لئے اپنے ہمراہ چلنے کو کہا لیکن عین وقت موسم کی خرابی کی بنا پر پرواز منسوخ کر دی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کانگریسی لیڈروں نے ریڈکلف کو پنجاب کا ایک نقشہ پیش کر دیا تھا جس میں بین الاقوامی سرحدوں کا تعین انہوں نے خود ہی کر دیا تھا۔ اس نقشے میں انہوں نے ضلع گورداسپور کی تحصیلوں کو ہندوستان کا علاقہ ظاہر کر دیا تھا اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ ان علاقوں میں ہندوستان کی اکثریت ہے۔ حالانکہ اکثریت کا تعین ضلعی سطح پر ہونا تھا۔

اس طرح گورداسپور' پٹھانکوٹ اور بٹالہ کو ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ اس کا اصل مقصد ہندوستان کو کشمیر میں داخل ہونے کے لئے براہ راست راستہ دینا تھا کیونکہ اگر یہ تحصیلیں پاکستان کا جزو بن جاتیں تو ہندوستان کا کسی صورت کشمیر سے کوئی تعلق باقی نہ رہ سکتا تھا۔ فیروز پور کی تحصیل زیرہ اور ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کو 3 جون کے اعلان کے مطابق پاکستان کا جزو قرار دیا گیا تھا۔ یہ علاقے آبی راستوں کی گزرگاہ کے سلسلے میں پاکستان کے لئے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ کانگریسی لیڈروں نے مغربی پنجاب کو خشک سالی کا شکار کرنے کے لئے ریڈکلف کو جو نقشہ دیا' اس میں سرحد کی لکیر کھینچتے ہوئے ان دونوں تحصیلوں کو ہندوستان میں شامل دکھا دیا گیا۔ پاکستانی ارکان نے اس پر بحث کرنے کے لئے ریڈکلف کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو ریڈکلف نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے ان دونوں نمائندوں کو کہہ دیا کہ آپ فکر مت کریں' تحصیل پٹھانکوٹ' گورداسپور' نکودر اور زیرہ کو پاکستان ہی کا جزو دکھایا جا رہا ہے اور میں اپنی آخری فیصلے میں اس کا ذکر کر دوں گا۔ پاکستانی نمائندوں نے اس دروغ گوئی پر مبنی یقین دہانی پر اعتبار کیا اور خاموشی اختیار کرلی۔

ریڈکلف نے اپنی آخری رپورٹ 9 اگست کو وائسرائے کو پیش کر دی۔ چونکہ اس رپورٹ پر کمیشن کے تمام ارکان کی آراء کو شامل کیا جانا تھا اس لئے اس رپورٹ کو حقائق پر مبنی معاملات پر تیار کیا گیا اور ریڈکلف نے وقتی طور پر ارکان کو مطمئن کر دیا۔ ریڈکلف کے اس ایوارڈ کو گیارہ دن تک صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ 14 اگست کو ملک کی تقسیم عمل میں آگئی اور اس ایوارڈ کا اعلان 17 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ ان گیارہ دنوں میں کمیشن نے بالکل اسی نقشہ کے مطابق سرحدوں کے تعین کا اعلان کر دیا جس کا نقشہ کانگریسی لیڈروں نے دوران تحقیقات دیا تھا۔ اس طرح مسلمان ان تحصیلوں میں اس خیال سے مطمئن ہو کر بیٹھے رہے اور نقل مکانی کا کوئی خیال ان کے نزدیک نہ بھٹکا کہ یہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ اب یکایک ہندوستان کی سرحدوں میں مقید ہو جانے کی صورت میں نہ صرف بے حد

ہندوستان کی طرف سے لئے گئے۔ اس کمیشن کی سربراہی ایک انگریز جج مسٹر سیرل ریڈکلف کے سپرد کی گئی اور اس کے فیصلے کو آخری فیصلہ قرار دیا جانا تھا۔ مغربی سرحدوں کے تعین کے لئے کمیشن حسب ذیل ارکان پر مشتمل تھا۔

1۔ مسٹر سیرل ریڈکلف چیئرمین (برطانیہ)
2۔ مسٹر جسٹس دین محمد رکن (پاکستان)
3۔ مسٹر جسٹس محمد منیر رکن (پاکستان)
4۔ مسٹر جسٹس مہر چند مہاجن رکن (ہندوستان)
5۔ مسٹر جسٹس تیجا سنگھ رکن (ہندوستان)

پنجاب سرحدی کمیشن میں سکھ نمائندے سردار بلدیو سنگھ کو بھی شامل کرلیا گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ریڈکلف کو بین الاقوامی سرحدوں کے جغرافیائی تعین کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اور ان کے فیصلے کو آخری فیصلہ تصور کیا جاتا تھا۔ مسلم لیگی اور کانگریسی ارکان محض امدادی ارکان تھے' ناطق فیصلہ ریڈکلف کا ہونا تھا۔

ریڈکلف 8 جولائی 1947ء کو دہلی پہنچا اور آتے ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ ریڈکلف زندگی میں پہلی مرتبہ ہندوستان آیا تھا اور ہندوستانی تناظر سے صرف دستاویزی حد تک واقف تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے آتے ہی کان بھرنا شروع کر دیئے اور اس کو سرگوشی کرتے ہوئے بتا دیا کہ ہندوستان کی تقسیم کا اعلان میں کرتو چکا ہوں اور کانگریس نے انگریزی حکام کی برتری کو قبول کرتے ہوئے اپنا پہلا گورنر جنرل بھی مجھے ہی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے' اس لئے ہمارے نزدیک پاکستان کی نسبت ہندوستان کے مفادات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

آبادی کے لحاظ سے میں نے پنجاب کی سرحدوں کی نشاندہی کر دی ہے لیکن بدقسمتی سے مجھے بعد میں کانگریسی رہنماؤں نے بتایا کہ جب تمام ریاستوں کو خودمختاری حاصل ہوگی اور اس خودمختاری سے انہیں اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ جس ملک سے چاہیں الحاق کرلیں' تو ہمارے لئے سب سے بڑا مسئلہ' ہندوستان کی عظیم ریاست کشمیر کے الحاق کا مسئلہ مشکل کا باعث بن جائے گا کیونکہ موجودہ صورت میں کشمیر ہندوستان سے بالکل کٹ کر پورے کا پورا پاکستان کے ساتھ جغرافیائی الحاق پر مجبور ہو جائے گا۔ اس لئے کچھ ایسی سرحدوں کا تعین ہونا چاہئے جس سے ہندوستان کی براہ راست رسائی کشمیر تک ہو جائے۔ جہاں تک اس کے الحاق کرنے کا تعلق ہے۔ اس کے لئے بھارت بعد میں راہ ہموار کرلے گا۔

اس کے علاوہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ بات بھی زور دار الفاظ میں کہی کہ ہندوستان والوں کو پہلے سے بتا دیا گیا ہے کہ 3 جون کی نشری تقریر میں بتائی گئی سرحدوں میں تغیر و تبدل کا امکان ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے پاکستانی سرحدوں کو زیادہ سے زیادہ غطر بود کرنا چاہئے۔ ریڈکلف نے ماؤنٹ بیٹن کے ان الفاظ کو دل و دماغ میں بٹھالیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس کی طرف سے دی جانے والی بے مثال رشوت کی جھلک بھی دے دی جس میں نقد رقم کے علاوہ بے شمار ہیرے جواہرات اور دیگر سودمند اشیاء شامل تھیں۔ اس طرح برطانیہ کا ایک نمائندہ منصب انصاف کے تقاضوں کو رشوت و جانبداری کے پاؤں تلے روندنے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گیا اور اس نے حتی المقدور ایسا کر بھی دیا۔

مشرقی سرحد کے تعین کے لئے پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے حسب ذیل تھے:

1۔ مسٹر سیرل ریڈکلف چیئرمین (برطانیہ)
2۔ مسٹر ابو صالح محمد اکرم رکن (پاکستان)
3۔ مسٹر ایس اے رحمٰن رکن (پاکستان)
4۔ مسٹر سی سی بواس رکن (ہندوستان)
5 مسٹر بی اے مکرجی رکن (ہندوستان)

اس کمیشن نے 22 جولائی کو اپنا کام شروع کر دیا جبکہ وہ تمام حالات کا جائزہ لے چکا تھا۔ ابھی حد بندی کے نزاعی نکات کمیشن کے سامنے بھی نہ آئے تھے کہ ریڈکلف نے جسٹس دین محمد کے ساتھ ہوائی جہاز میں پنجاب کے خاص علاقے یعنی ضلع سرگودا سپور اور ضلع فیروز پور پر پرواز کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس پرواز سے وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جغرافیائی لحاظ سے کس حد تک کشمیر کو ہندوستان سے ملحق کیا جا سکتا تھا اور مغربی پنجاب کو خشک سالی کا شکار کرنے کے لئے کس حد تک ضلع فیروز پور کے آبی راستوں کو ہندوستان کے حوالے کر سکتا تھا۔

ریڈکلف کی اس بدنیتی کو جسٹس دین محمد فوراً بھانپ گئے اور صحت کی خرابی کا بہانہ کر کے ریڈکلف کے ساتھ پرواز کرنے سے معذرت چاہی پھر خود فوراً قائداعظم کے پاس پہنچے اور اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ قائداعظم اگرچہ معاملے کو خوب سمجھتے تھے لیکن ایک قانون دان ہونے کی صورت میں اس شک کو کس طرح مادی صورت میں بیان کر سکتے تھے' اس کا کس طرح اظہار کر سکتے تھے؟ اس لئے انہوں نے جسٹس دین محمد کو خاموش ہی رہنے کی تلقین کی۔

قائداعظم کے اس فیصلے کے سامنے انہوں نے اپنا سر تسلیم خم کر دیا اور کمیشن کی کارروائی میں شرکت جاری رکھی۔ جسٹس دین محمد کی غیر حاضری میں ریڈکلف نے جسٹس محمد منیر کو پرواز کے لئے اپنے ہمراہ چلنے کو کہا لیکن عین وقت موسم کی خرابی کی بنا پر پرواز منسوخ کر دی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کانگریسی لیڈروں نے ریڈکلف کو پنجاب کا ایک نقشہ پیش کر دیا تھا جس میں بین الاقوامی سرحدوں کا تعین انہوں نے خود ہی کر دیا تھا۔ اس نقشے میں انہوں نے ضلع گورداسپور پور کی تحصیلوں کو ہندوستان کا علاقہ ظاہر کر دیا تھا اور بہانہ یہ بنایا گیا کہ ان علاقوں میں ہندوستان کی اکثریت ہے۔ حالانکہ اکثریت کا تعین ضلعی سطح پر ہونا تھا۔

اس طرح گورداسپور' پٹھانکوٹ اور بٹالہ کو ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ اس کا اصل مقصد ہندوستان کو کشمیر میں داخل ہونے کے لئے براہ راست راستہ دینا تھا کیونکہ اگر یہ تحصیلیں پاکستان کا جزو بن جاتیں تو ہندوستان کا کسی صورت کشمیر سے کوئی تعلق باقی نہ رہ سکتا تھا۔ فیروز پور کی تحصیل زیرہ اور ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کو 3 جون کے اعلان کے مطابق پاکستان کا جزو قرار دیا گیا تھا۔ یہ علاقے آبی راستوں کی گزرگاہ کے سلسلے میں پاکستان کے لئے بہت زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ کانگریسی لیڈروں نے مغربی پنجاب کو خشک سالی کا شکار کرنے کے لئے ریڈکلف کو جو نقشہ دیا' اس میں سرحد کی لکیر کھینچتے ہوئے ان دونوں تحصیلوں کو ہندوستان میں شامل دکھا دیا گیا۔ پاکستانی ارکان نے اس پر بحث کرنے کے لئے ریڈکلف کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو ریڈکلف نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے ان دونوں نمائندوں کو کہہ دیا کہ آپ فکر مت کریں' تحصیل پٹھانکوٹ' گورداسپور' نکودر اور زیرہ کو پاکستان ہی کا جزو دکھایا جا رہا ہے اور میں اپنی آخری فیصلے میں اس کا ذکر کر دوں گا۔ پاکستانی نمائندوں نے اس دروغ گوئی پر مبنی یقین دہانی پر اعتبار کیا اور خاموشی اختیار کرلی۔

ریڈکلف نے اپنی آخری رپورٹ 9 اگست کو وائسرائے کو پیش کر دی۔ چونکہ اس رپورٹ پر کمیشن کے تمام ارکان کی آراء کو شامل کیا جانا تھا اس لئے اس رپورٹ کو حقائق پر مبنی معاملات پر تیار کیا گیا اور ریڈکلف نے وقتی طور پر ارکان کو مطمئن کر دیا۔ ریڈکلف کے اس ایوارڈ کو گیارہ دن تک صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ 14 اگست کو ملک کی تقسیم عمل میں آ گئی اور اس ایوارڈ کا اعلان 17 اگست 1947ء کو کیا گیا۔ ان گیارہ دنوں میں کمیشن نے بالکل اسی نقشہ کے مطابق سرحدوں کے تعین کا اعلان کر دیا جس کا نقشہ کانگریسی لیڈروں نے دوران تحقیقات دیا تھا۔ اس طرح مسلمان ان تحصیلوں میں اس خیال سے مطمئن ہو کر بیٹھے رہے اور نقل مکانی کا کوئی خیال ان کے نزدیک نہ بھٹکا کہ یہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ اب یکایک ہندوستان کی سرحدوں میں مقید ہو جانے کی صورت میں نہ صرف بے حد

گھبرائے بلکہ خونریز فسادات کی نذر ہو گئے۔ ایک اندازے کے مطابق دو لاکھ مسلمان ان علاقوں میں ہندو غنڈوں کی بربریت کا شکار ہوئے۔

اسی طرح ریڈکلف نہایت دیدہ دلیری سے انصاف کی لاش کو ہندوستان کی سرزمین پر پھینک کر دائمی فساد کی آگ لگا کر واپس انگلستان روانہ ہو گیا۔

ظہورِ پاکستان

7راگست 1947ء کو قائداعظم دہلی سے کراچی روانہ ہوئے۔ وہ سفید شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ ان کی چھوٹی بہن فاطمہ جناح' اور بعض وہ لوگ جو سرکاری حیثیت سے ان کے عملے میں شریک ہو گئے تھے' ساتھ تھے۔ روانگی سے قبل انہوں نے اپنے الوداعی پیغام میں کہا ''میں دہلی کے باشندوں کو الوداع کہتا ہوں۔ یہاں ہر فرقے سے تعلق رکھنے والے میرے بہت سے دوست ہیں۔ اب ہمیں ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر دینا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ ہندوستان اور پاکستان دو آزاد حکومتوں کی طرح اپنی زندگی کا نیا دور شروع کر سکیں''۔

طیارے کا یہ سفر چار گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ پانچ بجے شام کو طیارہ کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا۔ کراچی اس شان سے قائداعظم کے استقبال کے لئے تیار تھا کہ بحیرۂ عرب کے ساحل پر آدمیوں کا ایک دوسرا سمندر موج زن' لاکھوں مسلمان لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے اور سب کی زبانوں پر:

پاکستان زندہ باد!
پاکستان پائندہ باد!

ہوائی اڈے سے شہر تک یہی حالت رہی۔ اور شہر کے اندر اس سے زبردست ہجوم' ازدحام' خوشیاں' اور نعرے۔ قائداعظم کو اس پر حیرت تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں پاکستان دیکھ لیا اور انہوں نے اس کا واقعی اظہار کیا۔

وہ کراچی پہنچتے ہی نئی مملکت کی بنیادیں رکھنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ بڑا کام تھا' مگر ان کی ہمت کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ 11راگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا۔ قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

o ''جہاں ایک جماعت اکثریت میں اور دوسری جماعت اقلیت میں ہو وہاں دونوں جماعتوں کے افراد کے جذبات کیا ہوں گے' اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت جو کچھ بھی کیا گیا ہے' کیا اس کے علاوہ کوئی اور فیصلہ کن اور قابلِ عمل حل ہو سکتا تھا۔ تقسیم تو بہرحال ہونی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ممکن ہے' اس فیصلے سے متفق نہ ہوں اور اسے پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتے ہوں' لیکن میرے خیال میں اس مسئلے کا اس کے سوا اور کوئی حل تھا ہی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ کا فیصلہ بھی اسی کے حق میں ہوگا' اور اس سے زیادہ یہ کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا' عملی تجربے سے یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کا حل سوائے تقسیم کے اور کچھ نہ تھا۔ متحدہ ہندوستان کا تخیل ہرگز قابلِ عمل نہ ہوتا' اور میری رائے میں وہ ہمیں زبردست تباہی کی طرف لے جاتا۔

o مجھے پوری پوری امید ہے کہ آپ کے تعاون اور مدد سے ہم اس دستور ساز اسمبلی کو دنیا کے لئے ایک مثال بنا دیں گے۔ دستور ساز اسمبلی کو دو بڑے کام سرانجام دینے ہیں۔ ایک تو پاکستان کا آئندہ دستور بنانے کا مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔ دوسرے پاکستان کے وفاقی مقننہ کے طور پر مکمل اور خودمختار مجلس کا کردار ادا کرنا ہے۔ پاکستان کے وفاقی مقننہ کے لئے عارضی دستور اختیار کرنے کا کام بڑی احتیاط سے انجام دینا ہے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ اس برعظیم میں دو آزاد اور خودمختار مملکتوں کے قیام کے منصوبے سے جو عدیم المثال طوفانی انقلاب آیا ہے' اس پر ہم خود ہی حیران نہیں' بلکہ ساری دنیا ششدر رہ گئی ہے۔ یہ تو خیر سو فیصد حقیقت ہے کہ یہ واقعہ عدیم المثال ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس جیسا کوئی اور واقعہ نہیں ہوا۔ یہ عظیم الشان برعظیم اور اس کے مختلف قومیتوں کے باشندے آج ایک ایسے منصوبے کے تحت آ گئے ہیں' جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی اور اس انقلاب کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ یہ پرامن طور پر حاصل ہوا ہے' اور انتہائی بااصول ارتقاء کے ذریعے۔

o اگر ہم اس عظیم مملکت پاکستان کو خوش اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی پوری توجہ لوگوں اور بالخصوص غریب طبقے کی فلاح و بہبود پر مرکوز کرنی پڑے گی۔ اگر آپ ماضی کو بھول کر اور عداوتوں کو دفن کر کے باہمی تعاون سے کام کریں گے تو لازماً آپ کو کامیابی ہوگی۔ اگر آپ ماضی کو بدل ڈالیں اور اس جذبے کے ساتھ باہم مل کر کام کریں کہ آپ میں سے ہر فرد' خواہ وہ کسی فرقے کا ہو' ماضی میں آپ کے اور اُس کے تعلقات کیسے ہی رہے ہوں۔ اس کا رنگ' نسل' مذہب کچھ ہی ہو۔ اوّل و آخر اسی مملکت کا شہری ہے۔ اس کے حقوق' مراعات اور ذمہ داریاں یکساں ہیں تو ہم بے حد ترقی کر جائیں گے۔ ہمیں اس جذبے کے تحت کام شروع کر دینا چاہئے۔

اس اجلاس کے دوران میں بعض بیرونی ممالک کی طرف سے مبارک باد اور مستقبل کے لئے اچھی امیدوں اور نیک تمناؤں کے پیغام آئے' جن میں امریکہ بھی شامل تھا۔

.....

14راگست 1947ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن بحیثیت وائسرائے و گورنر جنرل کراچی آئے اور گورنمنٹ ہاؤس میں قائداعظم کے مہمان ہوئے۔ اُسی رات کو ان کے اعزاز میں بڑی ضیافت کا اہتمام ہوا۔ دوسرے روز جلوس نکلنے والا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اطلاع ملی تھی کہ بعض سکھ لیڈروں نے یہ سازش کی ہے کہ جلوس کے دوران میں قائداعظم کو قتل کر دیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس پر اصرار کیا کہ وہ بھی جلوس میں قائداعظم کے ساتھ بیٹھیں' تاکہ جو کچھ درپیش آئے' اُس میں دونوں شریک رہیں۔ یہ اُن کی طرف سے شجاعانہ پیشکش تھی اور بڑے اصرار کے ساتھ' اس لئے قبول کر لی گئی۔

قائداعظم اور ماؤنٹ بیٹن اُسی رسمی بگھی پر سوار تھے جو ساری دنیا میں ایسے جلوس کے لئے مخصوص تھی۔ اس میں کچھ گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر لاکھوں آدمی' قطار در قطار مرتب' ہنسی اور قہقہوں' تالیوں اور نعروں سے خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

ایوان اسمبلی میں پہنچ کر' لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہز مجسٹی شاہ انگلستان کا پیغام پڑھ کر سنایا' جس میں نئی مملکت کو سلام تھا اور بڑے جوش و خلوص سے اس کے لئے فلاح و خوشحالی کی تمنا کی گئی تھی۔ پیغام میں اس کی توثیق کی گئی تھی کہ برطانوی دولتِ مشترکہ کے تمام ارکان جمہوری اصولوں کو بلند رکھنے میں پاکستان کی مدد کریں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں کہا:

> ''آج میں آپ کے وائسرائے کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں۔ کل سے مملکتِ پاکستان کی حکومت آپ کے ہاتھوں میں ہوگی' اور میں آپ کی ہمسایہ ڈومنین کا آئینی گورنر جنرل ہوں گا۔ کل دو نئی بااختیار مملکتیں دولتِ مشترکہ میں جگہ حاصل کریں گی' لیکن یہ نئی قومیں نہیں' بلکہ پرانی اور قابلِ فخر تہذیبوں کی وارث ہیں''

آخر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دنیا کی فلاح اور بھلائی کے لئے یہ دعا کی کہ آئندہ برسوں میں ہم ان اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہیں جو اکبر اعظم نے ہم کو سکھائے ہیں۔

ان کے بعد قائداعظم نے جوابی تقریر کی۔ اس کا ایک اقتباس ذیل میں درج ہے:

''وہ رواداری اور خیر سگالی جو شہنشاہ اکبر نے غیر مسلمانوں کے حق میں برتی' وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کی ابتدا آج سے تیرہ سو سال پہلے ہی ہمارے رسولِ اکرم ﷺ نے کر دی تھی۔ آپؐ نے زبان ہی سے نہیں' بلکہ عمل سے بھی یہود و نصاریٰ پر فتح حاصل کرنے کے بعد نہایت اچھا سلوک کیا۔ اُن کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا' اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمان جہاں کہیں بھی حکمران رہے' ایسے ہی رہے۔ ان کی تاریخ دیکھی جائے تو وہ ایسے اعلیٰ انسانیت پرور اور عظیم اصولوں کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے' جن کی ہم سب کو تقلید کرنی چاہئے''۔

انتقالِ اقتدار کی رسوم ادا ہونے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور قائداعظم گورنمنٹ ہاؤس میں واپس آئے اور بخیر و عافیت چودہ اگست کو ماؤنٹ بیٹن دہلی واپس گئے۔ پندرہ اگست کو قائداعظمؒ گورنر جنرل پاکستان اور وزرائے مملکت کی رسم حلف برداری ادا ہوئی اور ڈومینین کی حیثیت سے پاکستان باضابطہ وجود میں آ گیا۔ چودھویں برٹش فیلڈ رجمنٹ نے 31 توپوں کی شاہی سلامی دی۔ بس یہی ایک برطانوی رجمنٹ تھی' جو یوم مملکت پاکستان میں شریک ہوئی۔ پولو گراؤنڈ میں پاکستان کے بحری بیڑے اور فوج نے سلامی دی۔ قائداعظم نے جلوس سے الگ ہو کر' لوگوں کے نعروں کا جواب دیا:

پاکستان زندہ باد!
پاکستان پائندہ باد!

پاکستان کا مستقبل

ٹھیک ایک سال بعد قائداعظم انتہائی علالت کے عالم میں' زیارت ریذیڈنسی میں' گویا بستر مرگ پر اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے تو اُن کا علاج کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ پوری توجہ اور جانفشانی سے کر رہے تھے۔ دونوں معالجوں نے بعد میں اپنی یادداشتیں بھی تحریر کی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی یادداشت کا ایک اقتباس روزنامہ ''جنگ'' نے اپنی 11 ستمبر 1988ء کی ایک خصوصی اشاعت شائع کیا تھا۔ ہماری خصوصی اشاعت کا اختتام بھی اس اقتباس سے ہوتا ہے جس میں قائداعظم نے پاکستان کے پورے مستقبل کا پورا خاکہ اہل پاکستان کے سامنے رکھ دیا ہے:

''میرے لئے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ لاہور سے زیارت تک کا سفر طے کر کے میں شدید بیماری میں مبتلا قائداعظم کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے باوجود کہ بانیٔ پاکستان انتہائی کمزور ہو چکے تھے اور ان کا جسم کمبل میں لپٹا ہوا تھا' انہوں نے اپنا ہاتھ باہر نکالتے ہوئے مجھ سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پوچھا ''آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''۔ مرض الموت میں مبتلا اس عظیم انسان کے اخلاق' تواضع اور انکساری کی یہ اچھوتی مثال تھی' حالانکہ مجھ سے ہاتھ ملانے اور مزاج پرسی کرنے ہی سے وہ ہانپنے لگے اور بعد میں کئی منٹ تک آنکھیں بند کئے لیٹے رہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن سے روشناس کرانے والے قائداعظم کا خدا پر ایمان اور اصولوں پر یقین' ہمارے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ قائداعظم بظاہر ان معنوں میں مذہبی رہنما نہ تھے' جن معنوں میں عام طور پر ہم مذہبی رہنماؤں کو لیتے ہیں لیکن مذہب پر ان کا یقین کامل تھا۔ ایک بار دوا کے اثرات دیکھنے کے لئے ہم ان کے پاس بیٹھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن ہم نے بات چیت سے منع کر رکھا تھا' اس لئے الفاظ لبوں پر آ کر رک جاتے ہیں۔ اس ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کے لئے ہم نے خود انہیں دعوت دی تو وہ بولے:

''تم جانتے ہو' جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے۔ یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ رسول خدا ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔ پاکستان میں سب کچھ ہے۔ اس کی پہاڑیوں' ریگستانوں اور میدانوں میں نباتات بھی ہیں اور معدنیات بھی۔ انہیں تسخیر کرنا پاکستانی قوم کا فرض ہے۔ تو میں نیک نیتی' دیانت داری' اچھے اعمال اور نظم و ضبط سے بنتی ہیں اور اخلاقی برائیوں' منافقت' زر پرستی اور خود پسندی سے تباہ ہو جاتی ہیں''۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر'' کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ

اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

۞ حیات و سیرتِ اقبال ۞ فلسفۂ اقبال ۞ ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

(از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

☆☆☆

۞ اقبال اور قرآن' (از قلم: سید نذیر نیازی)

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

o صفحات 128' o قیمت: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے (30 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر منگوا لیجئے!)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000

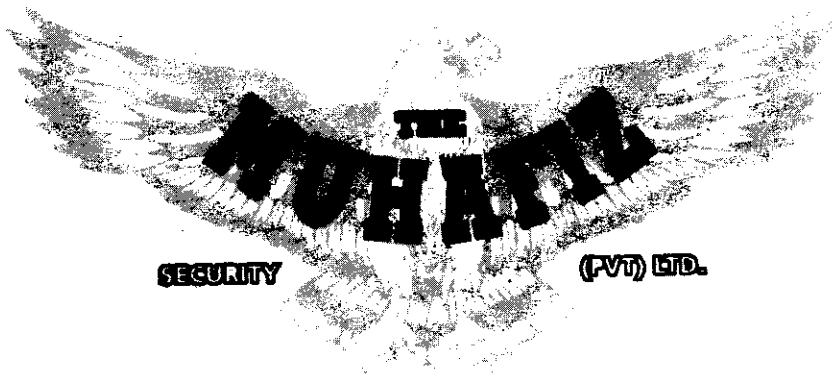

THE MUHAFIZ
SECURITY (PVT) LTD.

ایک سچے محافظ کا مقام و انعام

IN HOLY QURAN SURAH V/32 THE ALMIGHTY ALLAH HAS ORDAINED THAT, "IF ANYONE KILLS A PERSON, UNLESS IT BE FOR MURDER OR FOR SPREADING MISCHIEF IN THE LAND, WILL BE PUNISHED AS HE/SHE KILLED THE WHOLE MANKIND, ANDIF ANYONE SAVED THE LIFE OF AN INNOCENT, WILL BE REWARDED AS HE/SHE SAVES THE LIVES OF THE WHOLE MANKIND".

This verse of the divine scripture clearly indicates that the handful marauders of innocents' life and peace of Human-Community, deserve elimination and death-penalty, so that, the law-abiding majority of the Human-Community may live in peace and tranquility, also emphasising the dreadful punishment for the criminals/killers hereafter. Whereas, those striving for the protection and security of the innocent/peaceful human lives have been assured of a divine reward, unlimited and unending.

It is under the inspiration of this ordain and guidance of ALLAH and The Holy Quran, that, we have undertaken the task of Human Security, more as a Mission and a Cause, than a mere material-venture?

پروردگار عالم نے قرآن کریم سورۃ مائدہ میں فرمایا ہے کہ جوکوئی کسی ایک بندۂ خدا کا قتل ناحق کردے تو (اللہ کے نزدیک) وہ تمام انسانیت کے قتل کا سزاوار ہوگا۔ اور جوکوئی کسی ایک بے گناہ کی جان کو (مجرموں و جفاکاروں) سے تحفظ دے گا۔ اسے تمام انسانیت کو تحفظ دینے کا اجر عظیم عطا کیا جائے گا، پس رب کریم کے اسی فرمان کو مشعل راہ بناتے ہوئے ہم نے بندگان خدا کی جان و مال کے تحفظ کا جو بیڑہ اٹھایا ہے، اس فریضہ کی ادائیگی میں اگر ہمیں جان کی بازی لگا کر جام شہادت نوش کرنا پڑ جائے تو ایک سچے محافظ کی طرح ہم ان شاء اللہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے کہ کسی مسلمان کیلئے اپنے رب کی خوشنودی اور اجر و انعام سے بڑھ کر کامیابی و خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟

The Muhafiz Security (Pvt.) Limited

A - 1/3, West Land Center, 3rd Floor, 7 & 8, K.C.H.S, Main Shaeed-e-Millat Road, Karachi.

☎ **4550910, 4556331** Fax **4556331**

شفا دینے والا اللہ ہے

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ (الشعراء)

''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے''

ماؤں کے لئے حکمِ الٰہی

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ..... (البقرة:٢٣٣)

''بچوں کی مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو دو برس پورے.....''

صحت کی قدر و قیمت' فرمانِ نبویؐ کے آئینے میں

نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ :اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ (متفق علیہ' عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

''دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان کے بارے میں اکثر لوگ دھوکے میں مبتلا ہیں (اور ان کی قدر و قیمت سے غافل ہیں)——(۱) صحت (۲) فرصت''۔

☆

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ :	پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو:
(١) شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ	(۱) جوانی کو بڑھاپے سے پہلے!
(٢) وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ	(۲) صحت کو بیماری سے پہلے!
(٣) وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ	(۳) دولت مندی کو تنگ دستی سے پہلے!
(٤) وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ	(۴) فرصت کو مصروفیت سے پہلے!
(٥) وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ	(۵) زندگی کو موت سے پہلے!

(رواه الترمذی مرسلاً عن عمرو بن میمون الاودیؒ)

بیماری سے گناہ جھڑ جاتے ہیں

مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيْبُهُ اَذًى مَرَضٌ فَمَا سِوَاهُ اِلَّا حَطَّ اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَاتِهِ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا

(متفق علیہ' عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

''کسی مسلمان کو کوئی بھی تکلیف پہنچتی ہے' یعنی بیماری وغیرہ تو اللہ تعالیٰ اس سے اس کی برائیاں اس طرح دور کر دیتا ہے جیسے (موسم خزاں میں) درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے''۔

عطیہ اشتہار: ایک بندۂ خدا